جماعت مجاہدین

مجاہدِ کبیر حضرت سیّد احمد بریلوی کی جماعت کے
تنظیمی حالات اور اُن اکابر رفقاء کے سوانحِ حیات
جو سیّد صاحب کی زندگی میں یا اُن کے ساتھ شہید ہوئے
یا جنھوں نے بعد ازاں جہاد میں کوئی حصّہ لیا۔

غلام رسول مہر

کتاب منزل کشمیری بازار لاہور

مصنف .... مولانا غلام رسول مہر

طابع .... شیخ نیاز احمد

مطبع .... علمی پرنٹنگ پریس لاہور

ناشر .... کتاب منزل لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر: ۱۸۲

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

آناں کہ غمِ تو برگزیدند ہمہ — در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ

در معرکۂ دو کون فتح از عشق است — با آنکہ سپاہ او شہیدند ہمہ

میں نے سیّد صاحب اور ان کی جماعت کے متعلق تین کتابیں لکھنے کا فیصلہ کیا تھا: اوّل سیّد صاحب کے سوانحِ حیات، دوم جماعت کی تنظیم کے مقاصد و اصول، سوم سیّد صاحب کی شہادت کے بعد جماعتِ مجاہدین کی صد سالہ سرگزشت۔ ان میں سے پہلی کتاب گزشتہ سال دو جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ چند ہی مہینوں میں دوسری کتاب بھی مدارجِ ترتیب طے کر کے اشاعت کی منزل میں پہنچ رہی ہے۔ انشاء اللہ اب تیسری کتاب کی تکمیل میں بھی زیادہ وقت صرف نہ ہوگا۔ امید ہے، اسی سال وہ بھی مطبع میں پہنچ جائے۔ اس طرح وہ گراں قدر فرض پورا ہو جائے گا، جو سالہا سال سے میں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔

توفیقِ ایزدی کی یاوری شاملِ حال نہ ہو تو انسان کا قصد و ارادہ ہیچ ہے:

جو کچھ کہ ہوا، ہوا کرم سے تیرے

جو کچھ ہوگا، ترے کرم سے ہوگا

پیشِ نظر کتاب دو حصوں میں منقسم ہے: پہلے حصے میں جماعت کی تنظیم و ترتیب کے متعلق وہ تفصیلات مرتب صورت میں پیش کی گئی ہیں، جو آج تک کہیں جمع نہ ہو سکیں۔ ہزاروں صفحات میں یہ معلومات جا بجا بکھری پڑی تھیں۔ میں نے بار بار کے مطالعے اور غور و تحقیق سے انھیں جمع کیا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان جواہر ریزوں کے چننے میں کتنی مدت تک رات دن آنکھوں کا تیل ٹپکایا۔ الحمد للہ کہ ایک ایسا خاکہ تیار ہو گیا، جسے پیشِ نظر رکھ لینے سے تگ و کاوش

کی تین وادیاں قطع کرنا نسبتاً سہل ہو جائے گا۔

دوسرے حصے میں سید صاحب کے ان مجاہدوں اور رفیقوں کے سوانح درج ہیں جو ان کی زندگی میں یا ان کے ساتھ شہید ہوئے یا جنہوں نے بعد ازاں مجاہدانہ سرگرمیوں میں کوئی حصہ لیا یا جنہیں خود سید صاحب نے دعوت و تبلیغ پر متعین کر دیا تھا اور وہ تمام عمر اسی شغل میں زندگی گزار کر مالک حقیقی سے جا ملے۔ ان سوانح کی ترتیب و نگارش کا مقصد یہ تھا کہ سید صاحب کی تربیت اور مردم گری کے کچھ عملی نمونے سامنے آ جائیں تا کہ اندازہ ہو سکے اس پاک نفس بزرگ نے تھوڑی سی مدت میں کیسی جماعت تیار کر لی تھی۔ واضح رہے کہ سید صاحب کا ظہور اس تاریک دور میں ہوا جب اس ملک کے مسلمانوں کا سیاسی، دینی اور اخلاقی زوال آخری منزل پر پہنچ گیا تھا۔ شوکت و سطوت کے اس مستحکم حصار کی بنیادیں منہدم ہو رہی تھیں جس کی دیواروں کو سہارا دینے میں اسلامی ہند کے ایمان افروز مجاہد، مسافر اور معمار صدیوں تک خون پسینہ ایک کرتے رہے تھے۔ سید صاحب نے مادی سروسامان سے یکسر محرومی کے باوجود محض عشق حق کی حرارت سے اس ظلمت زار میں سینکڑوں ایسے چراغ روشن کر دیئے جو اسلامیت کے درخشندہ ترین دوروں کی یاد تازہ کر دینے میں بے نظیر خیال کئے جا سکتے ہیں۔ ان جانبازان راہ حق نے اپنے اسلاف کی سنت کے تتبع میں اپنا خون بے دریغ بہایا۔ ان کی قربانیاں آنے والی نسلوں کے لئے ایک گراں بہا قومی اور دینی میراث کی صورت میں محفوظ ہو جانی چاہئیں۔

ظاہر ہے کہ اس تذکرے میں وہ تمام اصحاب نہ آ سکتے تھے جنہوں نے سید صاحب کے دریائے فیض سے شوق کی پیاس بجھائی۔ ان کی تعداد عام روایت کے مطابق لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ میرے علم میں بے شمار نام تھے، لیکن ان کے حالات نہ مل سکے اور محض نام درج کر دینے سے اصل مقصد کو کوئی فائدہ نہ پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنا دائرہ تذکرہ و تحریر صرف ان اصحاب تک محدود رکھا جن کی زندگیاں کسی نہ کسی پہلو سے سید صاحب کی خاص تربیت کا نمونہ بن سکتی تھیں۔

ان دستاویزوں میں بعض اکابر شامل نہیں کیے گئے، مثلاً مولانا ولایت علی عظیم آبادی، مولانا عنایت علی عظیم آبادی، مولوی نصیر الدین منگلوری، مولوی نصیر الدین دہلوی، حاجی عبدالرحیم ولایتی، شیخ ولی محمد پھلتی یا متعدد دوسرے اصحاب۔ وجہ یہ ہے کہ ان بزرگوں نے وہ کام جاری رکھا جس کی بنیاد سید صاحب کے بابرکت ہاتھوں سے پڑی تھی۔ ان کے مفصل حالات اس سلسلۂ کتب کے آخری حصے کا سرمایہ ہیں، جو آج کل زیر ترتیب ہے۔ اسی حصے میں ارادت مندانِ سید کے وہ کارنامے تفصیلاً بیان ہوں گے جو انھوں نے ہندوستان کے اندر یا باہر سنت کے احیاء، کلمۂ حق کی سربلندی اور ملک کی آزادی کے لیے انجام دیے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ حصہ مرتب ہوگیا تو اندازہ ہو سکے گا کہ سید صاحب کی تحریک کا آخری باب بالاکوٹ کا شہادت زار نہ تھا، بلکہ یہ بدستور قائم و استوار رہی اور اس کے نتائج بڑے ہی دوررس نکلے۔

سید احمد شہید کو جو پیرایۂ قبول عطا ہوا، اس کے لیے میں بارگاہ باری تعالیٰ میں سراپا شکر گزار ہوں۔ مقصود حقیقی یہ تھا کہ سید صاحب کی ذات گرامی کا اصل موقف غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کے گرد و غبار سے پاک ہو کر سامنے آجائے۔ امید ہے کہ موجودہ کتاب اس سلسلے میں مزید توضیح اور انشراح خاطر کا وظیفہ انجام دے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اسے بھی درجۂ قبول ارزانی کرے اور جو حصہ باقی ہے اسے پورا کرنے کی توفیق مرحمت فرمائے!

مسلم ٹاؤن لاہور

۱۷۔ ستمبر ۱۹۵۵ء

مہر

حصّہ اوّل

جماعت اور اس کی تنظیم

پہلا باب

سکھ یا انگریز؟

مزید شہادتوں کی ضرورت

سیّد صاحب نے جو مقصد و نصب العین پیشِ نظر رکھ کر جہاد کے لیے تنظیمات فرمائی تھیں، اس کی تشریح میں نے "سیرت"[1] میں کر دی تھی۔ یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس میں کب اور کیونکر تحریفات کا سلسلہ شروع ہوا، یہاں تک کہ نصب العین کا حلیہ ہی مسخ ہو کر رہ گیا۔ میں نے ہر گزارش کے ضمن میں سیّد صاحب کی تحریرات سے شہادتیں پیش کیں۔ ان سے وہی نتیجہ نکل سکتا تھا، جو میں نے نکالا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان توضیحات کے باوجود بعض قلوب میں غالباً اب تک شبہات باقی ہیں یا کم از کم یقین و قطعیت کی وہ روح پیدا نہیں ہوئی جو اس بارے میں لازماً پیدا ہونی چاہیے تھی۔ ایک بہت بڑے صاحبِ علم نے تو صاف صاف فرما دیا کہ میرا اخذ کردہ نتیجہ محض قیاسی ہے اور قیاسی و استنباطی نتیجے پر بار بار زور دینے کی مصلحت سمجھ میں نہ آئی۔ ان حالات میں ضرورت محسوس ہوئی کہ اس مسئلے کے متعلق مزید شہادتیں فراہم کی جائیں، جن کے بعد کسی شخص کے لیے وسوسے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے۔

جہاد کی بنیاد

میرے نزدیک تو محض جہاد کی بنیاد و اساس ہی پیشِ نظر رکھ لینے کے بعد شبہہ کا امکان باقی نہیں رہتا۔ سیّد صاحب فرماتے ہیں کہ جب اسلامی بلاد غیر مسلموں کے قبضے میں آ جائیں تو عام اہلِ اسلام پر عموماً اور مشاہیر حکام پر خصوصاً جہاد واجب

---

[1] ملاحظہ ہو "سیّد احمد شہید" حصّہ اوّل صفحہ [illegible]

مؤکد ہو جاتا ہے۔[1] یہ مضمون سید صاحب کے مختلف مکاتیب میں دہرایا گیا ہے۔ اب غور کیا جائے کہ آیا ہندوستان کی وسیع سرزمین میں سے صرف وہی حصہ مسلمانوں کے قبضے سے نکلا تھا، جس پر سکھ قابض تھے، اور جس کی جنوبی حد دریائے ستلج تھی؟ اس سے مدتہا وسیع تر اور زرخیز تر خطے دریائے ستلج سے شرقاً اراکان تک، غرباً کاٹھیاواڑ گجرات تک اور جنوباً راس کماری تک مسلمانوں ہی کے قبضے میں تھے اور انھیں سے اغیار نے چھینے تھے، خواہ وہ مرہٹے ہوں یا پرتگیز، فرانسیسی ہوں یا انگریز یا کوئی اور۔ کون کہہ سکتا ہے کہ سید صاحب کو شمالی و غربی ہند کے صرف اس خطے کا غم تھا، جس پر رنجیت سنگھ نے تسلط جما لیا تھا اور باقی حصوں سے وہ بالکل بے پروا تھے؟ حالانکہ تاریخی، جغرافیائی اور سیاسی نقطۂ نگاہ سے باقی خطے بدرجہا زیادہ اہم تھے۔ محض اس نکتے پر توجہ فرما لینے سے حقیقت حال بخوبی آشکارا ہو سکتی ہے، تاہم میں صرف قیاس و استنباط پر اکتفا نہ کروں گا۔ ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں، جن میں تصریحاً ہندوستان کی تطہیر کا ذکر ہے۔

سلطان ہرات کے نام مکتوب

سید صاحب کے زمانے میں شاہ محمود دُرّانی (ابن تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی) ہرات میں حکمران تھا۔ کابل و قندھار بارک زئیوں کے قبضے میں جا چکے تھے۔ سید صاحب نے دوسرے مسلمان حکمرانوں کے علاوہ شاہ محمود کو بھی جہاد کی دعوت دی تھی۔ اس میں فرماتے ہیں:

اقامتِ جہاد و ازالۂ بغی و فساد در ہر زمان و ہر مکان از اہم احکام حضرت رب العباد است خصوصاً درین چنیں زمان کہ وقت شورش اہل کفر و طغیان بحدے رسیدہ کہ تخریب شعائر دین و انسدادِ حکومتِ سلاطین از دستِ کفرۂ متمردین

جہاد قائم کرنا اور بغاوت و فساد کو مٹانا ہر زمانے اور ہر مقام میں خدا کا نہایت اہم حکم رہا ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کافروں اور سرکشوں کی شورش ایسی صورت اختیار کر چکی ہے کہ سرکشوں اور باغیوں کے ہاتھوں دینی شعائر بگاڑے

---

[1] مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید قلمی نسخہ، ص ۵۵۔ مکاتیب سید صاحب ص ۱۴۳

ونجاسات بر وقوع آمدہ و ایں فتنۂ عظیم تمام بلاد ہند و سندھ و خراسان را فرا گرفتہ۔ پس دریں صورت تغافل در مقدمۂ استیصال کفرۂ متمردین و تساہل درباب سرزنش باغیان مفسدین از اکبر معاصی و اقبح آثام است۔ بنا بریں بندۂ درگاہ حضرت اللہ از وطن مالوفۂ خود برخاستہ در دیار ہند و سندھ و خراسان دور و سیر نمودہ و مومنین آں دیار و مسلمین آں دیار را بایں معنی ترغیب کردہ[1]

جا رہے ہیں اور شاہانِ اسلام کی حکومتوں میں ابتری پیدا کی جا رہی ہے اور یہ زبردست فتنہ ہند، سندھ اور خراسان کے خطوں پر چھا گیا ہے اس صورت میں سرکش کافروں کی بیخ کنی سے غفلت اور مفسد باغیوں کی گوشمالی سے سہل انگاری بہت بڑا اور بہت قبیح گناہ ہے۔ اس بنا پر خدا کی درگاہ کے اس بندے نے اپنے وطن سے نکل کر ہند و سندھ و خراسان کا دورہ کیا اور وہاں کے مومنین اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی۔

ظاہر ہے کہ اس پوری تحریر میں پنجاب کا ذکر تک نہیں آیا، اس لیے کہ اہلِ خراسان کے نزدیک وہ یا تو ہندوستان میں شامل تھا یا سندھ و خراسان میں۔ پھر جب سید صاحب ہند، سندھ اور خراسان میں غیر مسلموں اور باغیوں کی فتنہ انگیزیوں کا ذکر فرما چکے تھے تو یہ بات ذہن میں نہیں آسکتی کہ وہ صرف اس خطے کو فتنوں سے پاک کرنے کے لیے اٹھے تھے، جس پر رنجیت سنگھ قابض ہو گیا تھا۔

ہندو راؤ کو تلقین

ہندو راؤ گھاٹگے دولت راؤ سندھیا والی گوالیار کا برادرِ نسبتی تھا اور سندھیا کی بیماری کے زمانے میں ریاست کا انتظام اسی کے حوالے ہو گیا تھا۔ یاد ہوگا کہ سید صاحب ہجرت کے سلسلے میں گوالیار پہنچے تھے تو ہندو راؤ نے آپ کا پُرجوش استقبال کیا تھا۔ ایک مکتوب میں اسے لکھتے ہیں:

بیگانگان بعید الوطن ملوک زمین و زمن گردیدہ اند و تاجران متاع فروش بپایۂ سلطنت

وہ غیر جن کا وطن بہت دور ہے بادشاہ بن گئے جو تاجر سامان بیچ رہے تھے انھوں نے

---

[1] "مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید قلمی نسخہ" صفحہ ۳۶ و ۳۸

رسیدہ امارت امرائے کبار و ریاست رؤسائے
عالی مقدار برباد کردہ اند و عزت و عظمت ایشاں
بالکل بر بودہ - چوں اہل ریاست و سیاست
در زاویۂ خمول نشستہ اند الا چند نفرے از اہل
فقر و مسکنت کہ ہمت بستہ اند این ضعفا محض
بنا بر خدمت دین رب العالمین برخاستہ اند -
ہرگز ہرگز از دنیا داران و جاہ طلباں نیستند ...
وقتیکہ میدان ہندوستان از بیگانگان و دشمنان
خالی گردیدہ و تیر سعی ایشاں بر ہدف مراد رسیدہ
آئندہ مناصب ریاست و سیاست بہ طالبین
آن مسلّم باد[1]

سلطنت قائم کرلی - بڑے بڑے امیروں کی
امارتیں اور رئیسوں کی ریاستیں خاک میں مل
گئیں - ان کی عزت اور ان کا اعتبار چھن گیا -
جو لوگ ریاست و سیاست کے مالک تھے
وہ گمنامی کے گوشے میں بیٹھ گئے - آخر فقیروں
اور مسکینوں میں سے تھوڑے سے آدمیوں نے
کمر ہمت باندھی - ضعیفوں کا یہ گروہ محض خدا کے
دین کی خدمت کے لیے اٹھا ہے - وہ لوگ نہ
دنیا دار ہیں نہ جاہ طلب - جب ہندوستان کا
میدان غیروں اور دشمنوں سے خالی ہو جائے گا
اور ضعیفوں کی کوشش کا تیر مراد کے نشانے پر
جا بیٹھے گا تو آئندہ کے لیے ریاست و سیاست
کے عہدے طالبوں ہی کو مبارک رہیں ۔

غور فرمائیے کہ دور سے آئے ہوئے غیر کون تھے جو تجارت کرتے کرتے سلطنت کے مالک بن گئے تھے؟ ظاہر ہے کہ وہ صرف انگریز تھے اور انھیں کے خلاف جنگ کے لیے سید صاحب خود اٹھے تھے - اسی غرض سے وہ رؤسا و عوام ہند کو اٹھانا چاہتے تھے - بالکل یہی مضمون کا خط غلام حیدر خان کے نام لکھا جو سید صاحب کا عزیز دوست اور قدیم رفیق کار تھا اور اس وقت گوالیار میں ممتاز فوجی عہدے پر فائز تھا - سید صاحب نے اسے تاکید کی تھی کہ یہ مطالب راجا ہندو راؤ کے ذہن نشین کر دیے جائیں ۔

[1] مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید قلمی نسخہ صفحہ ۱۲ ۔

بدیہی شہادت

آخری قطعی شہادت اس مکتوب میں موجود ہے جو شاہ محمود درانی والیِ ہرات کے فرزند شہزادہ کامران کے نام بھیجا گیا تھا۔ اس کے آغاز میں وہی مطالب بیان فرمائے ہیں، جو شاہ محمود اور دوسرے اکابر کو لکھ چکے تھے۔ مثلاً جہاد ضروری ہے۔ جب ہندوستان اہلِ کفر و طغیان کے اثرات سے لبریز ہو گیا تو میں نے وطن چھوڑ کر خراسان کا رخ کیا۔ سب کو جہاد کی دعوت دیتا رہا۔ یوسف زئی کے علاقے میں پہنچا تو آفریدی، خٹک، مہمند، خلیل، اہلِ ننگرہار، اہلِ سوات و بنیر، اہلِ پکھلی، راجہ ہائے کشمیر وغیرہ میرے ساتھ ہو گئے۔ میرا مقصد حکومت نہیں، صرف کلمۂ حق کی سربلندی اور سنتِ نبوی کا احیاء ہے۔ نیز میں اسلامی علاقوں کو سرکش کافروں کے ہاتھ سے آزاد کرانا چاہتا ہوں۔ جب یہ علاقے مشرکوں اور منافقوں کے تسلط سے پاک ہو جائیں گے تو انہیں مستحقوں کے حوالے کر دوں گا۔ بہ شرطیکہ:

شکرِ ایں انعامِ الٰہی بجا آرند و علی الدوام جہاد را بہر حال قائم دارند و گاہے معطل نگزارند و در ابوابِ عدالت و فصلِ خصومات از قوانینِ شرعِ شریف سرمو تجاوز و تفاوت درمیان نیارند و از ظلم و فسق بکلی اجتناب ورزند[1]

خدا کے اس انعام کا شکر بجا لائیں۔ ہمیشہ ہر حالت میں جہاد قائم رکھیں۔ کبھی اسے معطل نہ چھوڑیں۔ عدالت اور فیصلۂ مقدمات میں شرع کے قانون سے بال برابر بھی تجاوز نہ کریں۔ ظلم و فسق سے بالکل بچے رہیں۔

آخر میں فرماتے ہیں:

باز خود ایں جانب مع مجاہدینِ صادقین بہ سمتِ بلادِ ہندوستان بنا بر ازالۂ اہلِ کفر و طغیان متوجہ خواہد گشت کہ مقصدِ اصلی خود جہاد بر ہندوستان است، نہ توطن در دیارِ خراسان[2]

پھر میں مجاہدین کو لے کر ہندوستان کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا تاکہ وہاں سے اہلِ کفر و طغیان کو ختم کیا جا سکے اور میرا اصل مقصود ہندوستان پر جہاد ہے، یہ نہیں کہ خراسان میں توطن اختیار کر لوں۔

---

[1] مکاتیب شاہ اسمٰعیل شہید قلمی نسخہ صفحہ ۲۹۰ ۔ [2] ایضاً صفحہ ۲۹۱ ۔ مکاتیب سید صاحب صفحہ ۲۴۰

سید صاحب کے جس نصب العین کی توضیح میں نے کی، اس کے متعلق اس سے واضح تر اور روشن تر شہادت کیا ہو سکتی ہے؟

مومن کی شہادت

ہمارے ہاں کے مشہور شاعر حکیم مومن بھی سید صاحب کے مرید تھے۔ ان کے فارسی کلام کے ایک نعتیہ قصیدے میں دعائیہ اشعار اس حقیقت کا مزید ثبوت پیش کر رہے ہیں کہ سید صاحب اور ان کے تمام نیازمندوں کے نزدیک تطہیر ہند کے سلسلے میں مرکزی حیثیت انگریزوں ہی کو حاصل تھی۔ مومن فرماتے ہیں:

این عیسویاں بہ لب رساندند　　جان من و جان آفرینش!

مگزار کہ پائمال گردیم　　زاں سیم سران آفرینش

تا چند بہ خواب ناز باشی　　فارغ ز فغان آفرینش

مومن شدہ ہم زبان عرفی　　از بہر امان آفرینش

"برخیز کہ شور کفر برخاست

اے فتنہ نشان آفرینش"

دوسرا باب

تنظیم کی بنیاد

امیر خاں کی معیت میرا خیال ہے کہ سید صاحب اسی زمانے میں جماعت کی تنظیم و تاسیس کے متعلق غور و فکر میں مشغول ہو گئے تھے، جب دہلی میں علم و سلوک کی تحصیل سے فارغ ہو کر وطن پہنچے تھے اور اپنی زندگی خدا کی راہ میں جہاد کے لیے وقف کر دی تھی۔ ابتدا میں یہ سوال ان کے سامنے آیا ہو گا کہ مستقل جماعت کی بنیاد رکھیں یا پہلے سے کسی قائم شدہ جماعت کو تعلیم و تربیت دے کر ان مقاصد عظیمہ کے لیے تیار کر دیں جنھیں وہ ایک سچے مسلمان کی زندگی کے لوازم سمجھتے تھے۔ مستقل جماعت کی تاسیس وقت طلب تھی اور ہندوستان کی فضا اس تیزی سے اسلامی مقاصد کے لیے ناساز گار ہو رہی تھی کہ اصل کام میں تھوڑا سا توقف بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قائم شدہ جماعت کو احیاء اسلامیت اور آزادیِ وطن کی راہ پر لگا دینے کے لیے نسبتاً کم جد و جہد درکار تھی، لہذا انھوں نے نواب امیر خاں کے پاس پہنچنے کا فیصلہ کیا جو اس وقت کے ہندوستان میں سب سے بڑی آزاد جنگی قوت کا مالک تھا۔ شجاعت و جوانمردی میں اس کی دھاک دُور دُور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ دین داری اور اسلامی حمیّت میں بھی اسے خاص شہرت حاصل تھی اور اس سے سید صاحب کے خاندانی تعلقات بھی تھے۔

سید صاحب اسی ارادے سے نواب کے پاس راجپوتانہ پہنچے اور کم و بیش سات سال اس کے لشکر میں رہے۔ انھوں نے جاتے ہی اہل لشکر کی اصلاح کا سلسلہ جاری کر دیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ آپ کی وجہ سے لشکر کی عام حالت میں زبردست تغیّر پیدا ہو گیا۔ فسق و فجور مٹ گیا،

کتاب و سنت کی پیروی عام ہوگئی۔ نواب نے انھیں مشیرانِ خاص میں شامل کرلیا تھا۔ یقین ہے کہ اصل مقاصد کی طرف بھی وہ نواب کی توجہ منعطف کراتے رہتے ہوں گے۔

مستقل جماعت کی بنیاد

جب تک نواب انگریزوں کے اثر سے آزاد رہا سید صاحب نے اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جب انگریزوں سے صلح کی بات چیت شروع ہوگئی تو نواب کے رفیقوں اور مشیروں میں سے سید صاحب اس کے مخالف تھے۔ وہ برابر یہ رائے دیتے رہے کہ انگریزوں سے لڑیں اور خدا کی مدد پر بھروسا رکھیں۔ افسوس کہ نواب اس رائے پر عمل نہ کرسکا اور معاہدے پر دستخط ہونے سے پیشتر سید صاحب نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر دہلی پہنچ کر مستقل جماعت کی تاسیس کا فیصلہ کیا، جس کے لیے ان کی خداداد صلاحیتیں سات سال میں خاصی نشوونما پاچکی تھیں۔

اس کام کا آغاز احیاءِ دین اور تزکیۂ قلوب سے ہوا۔ وقت کے بعض مشہور علما نے سید صاحب سے بیعت کی۔ مثلاً مولانا محمد یوسف پھلتی، مولانا عبدالحی بڈھانوی اور شاہ اسمٰعیل۔ اس کی عام صورت وہی تھی جو تصوف کے مختلف خانوادوں میں پہلے سے رائج چلی آتی تھی اور اب تک رائج ہے لیکن اس میں ایسی غیر معمولی جاذبیت تھی، جس کی کوئی نظیر اس دور میں نہیں ملتی۔ بس اس کے ساتھ ہی ارشاد و ہدایت کا ایک وسیع سلسلہ جاری ہوگیا۔ پھر سید صاحب نے گنگا جمنا کے دوآبے کا دورہ کیا اور ہزاروں مخلص مسلمان ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوگئے۔ وہ عام پیروں کی طرح ارادت مندوں کو "توجہ" بھی دیتے تھے، جس کی کیفیت بیان کرتے ہوئے بعض اصحاب نے لوہاروں کی دھونکنی سے تشبیہ دی۔ بعض نے فرمایا کہ توجہ کے وقت صاف معلوم ہوتا تھا، دل سید صاحب کے قلبِ صافی سے معرفت کے مضامین سن رہا ہے۔[1]

دورے کے سلسلے میں وہ پھلت پہنچے تو ورزش شروع کردی۔ بازوؤں اور شانوں پر مالش

---

[1] "منظورہ" صفحہ ۱۷۔

کراتے تھے، اور کچھ وقت تیر اندازی کی مشق میں صرف کرتے تھے۔ حالانکہ عام پیروں کو اس قسم کے مشاغل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں قبولِ عام کا اندازہ کرتے ہوئے انھوں نے مقاصدِ جہاد کی تبلیغ بھی شروع کر دی تھی۔ یہ جماعت کی تنظیم کا سنگِ بنیاد تھا۔

فنونِ جنگ کی مشق

دو آبے کے دورے سے فارغ ہو کر وطن پہنچے اور سفرِ حج سے پیشتر تقریباً دو سال[1] انھوں نے رائے بریلی ہی میں گزارے۔ اگرچہ اس اثنا میں مختلف مقامات کے دورے بھی کرتے رہے۔ اس زمانے میں بیعت بھی لیتے تھے، وعظ بھی فرماتے تھے جو عموماً پابندیِ کتاب و سنت اور ردِّ بدعات پر مشتمل ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں صلح بھی کراتے تھے؛ ان میں اسلامی حرارت بھی پیدا کرتے تھے۔ ان کے ارادت مند عموماً ذکر و فکر اور مراقبوں میں مشغول رہتے تھے۔ یکایک حکم دے دیا کہ اب تمام رفیق زیادہ وقت جنگی فنون کی مشق میں صرف کیا کریں، اور فرمایا:

> ان دنوں دوسرا کام اس سے افضل درپیش ہے۔ اب اس کی طرف ہمارا دل مشغول ہے یعنی جہاد فی سبیل اللہ۔ اس کے سامنے حال کی کچھ حقیقت نہیں، اس واسطے کہ وہ کام یعنی سلوک اس (جہاد) کے تابع ہے۔ اگر کوئی شخص تمام دن روزہ رکھے، تمام رات زہد و ریاضت میں بسر کرے، یہاں تک کہ نوافل پڑھتے پڑھتے پیروں پر ورم آ جائے اور دوسرا شخص جہاد کی نیت سے ایک ساعت دن یا رات کو رنجک اڑائے تاکہ وہ مقابلۂ کفار میں بندوق لگاتے وقت آنکھ نہ جھپکے تو وہ عابد اس مجاہد کے مرتبے کو ہرگز نہ پہنچے گا۔

اسی وقت سے سید صاحب کے ارادت مندوں کا زیادہ وقت فنونِ جنگ میں صرف ہونے لگا۔ مثلاً تیر، بندوق، تلوار چلانا، پھری گدکا کھیلنا، ڈنڈ پیلنا وغیرہ۔ خود سید صاحب

---

[1] یکم رمضان ۱۲۳۴ھ ـــــ سلخ شوال ۱۲۳۶ھ۔

کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پیشتر زہادت مند یا تو گردن ڈالے عالم سکوت میں بیٹھے رہتے یا تمام وقت مسجد کے کونے میں بیٹھے جاتے یا چادر لپیٹ کر حجرے میں گھس جاتے یا مراقبے کے لیے جنگل میں چلے جاتے ۔

تنظیم کی حیثیت | اس سے ظاہر ہے کہ سید صاحب نے اسلامیت کو جماعتی تنظیم کی اصل واساس بنایا اور تمام ترتیبات اسلامی اصول کے مطابق رکھیں وہ چاہتے تھے کہ مسلمان اسلامیت کے پیکر بن جائیں اور خدا کی راہ میں جہاد کو اپنا نصب العین بنا لیں۔ ان کا مقصد رضائے باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہ ہو۔ حکومت وسلطنت، جاہ وجلال اور مال ومنال کی آلایش سے ان کے قلب ودامن آلودہ نہ ہونے پائے۔ پھر انھوں نے ابتدا ہی سے افراد جماعت کو محنت ومشقت اور ہر قسم کے شدائد کی برداشت کا عادی بنایا۔ اس کے بغیر وہ لوگ راہ جہاد میں قدم رکھنے کے اہل نہ بن سکتے تھے۔ ان کے ارادت مندوں میں وقت کے ممتاز ترین عالم اور بلند پایہ ارباب ثروت بھی شامل تھے، لیکن تھوڑی ہی مدت میں انھوں نے غذا، لباس اور بود وماند میں ایسا طریقہ اختیار کر لیا کہ وہ جماعت کے غربا سے کسی رنگ میں بھی ممتاز نہ رہے ۔ سید صاحب سفر حج کے سلسلے میں ہگلی پہنچے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے وکیل منشی امین الدین احمد کلکتہ سے استقبال کے لیے آئے ہوئے تھے۔ سید صاحب سے مل چکنے کے بعد انھوں نے شاہ اسمٰعیل سے ملاقات کی۔ شاہ صاحب کا لباس اس درجہ حقیر تھا کہ منشی صاحب کو یقین نہ آیا یہ شاہ عبدالعزیز محدث کے بھتیجے ہیں۔ جب انھیں بتایا گیا کہ یہی شاہ اسمٰعیل ہیں تو ان کی سادگی اور بے تکلفی دیکھ کر منشی صاحب بے اختیار آبدیدہ ہو گئے۔ میر فیض علی گورکھپوری، میر ذوالفقار علی خاں رئیس اعظم کے فرزند تھے۔ سید صاحب کی معیت میں میر فیض علی کی وضع اس درجہ بدل چکی تھی کہ سید جعفر علی نقوی بہ غرض جہاد پہنچے تو میر فیض علی سے گہرے دوستانہ تعلقات کے باوجود انھیں پہچان نہ سکے ۔

غور طلب امور | سید صاحب نے یہ طریقے اسی وجہ سے اختیار کیے تھے کہ ان کی تحریک

خالص دینی تھی۔ وہ مسلمانوں کو سلطنتیں دلانے کے لیے نہیں، صرف سچے مسلمان بنانے کے لیے اٹھے تھے۔ سلطنتیں اسلامیت کا ایک ضمنی ثمرہ تھیں۔ خوب غور کیا جائے تو عام مصلحتوں کے لحاظ سے بھی کسی واقعی جہاد کے لیے ان طریقوں کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ سید صاحب کے پاس نہ مال و دولت کے خزانے تھے، نہ ان کے پاس کوئی چھوٹی یا بڑی سلطنت تھی کہ تنخواہ دار مجاہدین کا خرچ برداشت کر لیتے۔ ان سے پیشتر ہندوستان میں متعدد طالع آزما پیدا ہو چکے تھے، جنھوں نے چھوٹے چھوٹے جیش جمع کر کے لڑائیاں شروع کیں اور آہستہ آہستہ بڑی قوت کے مالک بن گئے، مثلاً نواب امیر خاں۔ سید صاحب بھی ان کا طریقہ اختیار کرتے تو نہ کوئی دینی خدمت انجام دے سکتے، نہ مجاہدین کی ایسی جماعت تیار ہو سکتی جو پیشِ نظر مقاصد کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لیے آمادہ ہوتی۔ بہتر سے بہتر حالات میں ایسی جماعت کے ذریعے سے کوئی ریاست حاصل کرنے کا بندوبست ہو جاتا، لیکن کلمۂ حق کی سربلندی، سنتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا احیاء اور تطہیرِ ہند کے مقاصد کیونکر پورے ہو سکتے تھے؟ سوال یہ نہیں کہ یہ مقاصد سید صاحب کی زندگی میں پورے ہوئے یا نہ ہوئے، سوال یہ ہے کہ ان مقاصد کے لیے نتیجہ خیز کام کے انتظام اور اس کے استحکام کی تدبیر کیا تھی؟ وہی تھی جس کا بندوبست سید صاحب نے کیا۔ انھیں کے زمانے میں قفقاز کے عظیم القدر مجاہد سلطان شامل نے دین ہی پر اپنی تحریکِ جہاد کی بنیاد رکھی اور سید صاحب کی شہادت سے تقریباً چالیس سال بعد شیخ محمد احمد نے جو "مہدیِ سوڈان" کے لقب سے مشہور ہیں، دین ہی کی بنا پر وہ تحریک جاری کی، جس نے چند سال میں سوڈان کو مصریوں اور انگریزوں کے قبضے سے آزادی دلا دی۔

دعوت و تبلیغ کا انتظام

اس سلسلے میں سید صاحب نے دعوت و تبلیغ کا انتظام اتنے بڑے پیمانے پر کر دیا کہ ان کے سرحد تشریف لے جانے کے بعد بھی ہندوستان کے مختلف حصوں میں تبلیغ برابر جاری رہی۔ انھوں نے جہاں بھی جا بجا داعی مقرر کر دیے تھے، سرحد پہنچ کر بھی مختلف داعی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھیجے، مثلاً پہلے مولانا سید

محمد علی رام پوری کو حیدر آباد دکن بھیجا۔ پھر حیدر آباد میں مولانا ولایت علی عظیم آبادی کو مقرر کر دیا اور مولانا سید محمد علی کو مدراس جانے کا حکم دے دیا۔ مولانا عنایت علی عظیم آبادی کو بنگال میں دعوت پر مقرر کر دیا۔ مولانا سید اولاد حسن قنوجی، میاں محمد مقیم رام پوری، سید زین العابدین، مولانا کرامت علی جون پوری اور جیسیوں دوسرے اشخاص مختلف علاقوں اور شہروں میں یہ کام انجام دیتے رہے بلکہ سید صاحب کے ارادت مندوں میں سے ہر شخص یا تو جہاد میں شریک ہو گیا یا اپنے حلقے میں احیاء دین، دعوتِ جہاد اور فراہمی زر کا کام انجام دینے لگا۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان میں ایسی کسی دینی تحریک کا سراغ نہیں ملتا، جس نے دورِ زوال میں مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح اور ان میں حمیتِ اسلام کے احیاء کے ایسے عظیم الشان کارنامے انجام دیے ہوں، جیسے سید صاحب کی تحریک نے انجام دیے۔

تیسرا باب

عسکری تنظیمات

(۱)

مجاہدین کی جماعتیں سید صاحب نے مجاہدین کی سرسری جماعت بندی تو غالباً جہاد کے لیے روانگی سے پیشتر ہی کر لی تھی۔ مختلف روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی باقاعدہ جماعت بندی راستے میں پہلی سے گوالیار پہنچ کر کی تمام مجاہدین کو جن کی تعداد تقریباً ساڑھے پانسو تھی، باقاعدہ پانچ جماعتوں میں تقسیم کیا اور ان کے الگ الگ سرعسکر مقرر فرما دیے، نیز حکم دے دیا کہ قیام و سفر میں ہر جماعت اسی تقسیم کے مطابق عمل پیرا رہے۔ اس تقسیم کی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ جماعت خاص: یہ جماعت قیام و سفر میں قلب لشکر سمجھی جاتی تھی۔ اس کے سرعسکر مولانا محمد یوسف پھلتی مقرر ہوئے جو سید صاحب کے داروغۂ خاص تھے۔ خود سید صاحب بھی اسی جماعت کے ہمراہ چلتے اور ٹھہرتے تھے۔ مولانا محمد یوسف کی وفات کے بعد مولوی محمد حسن سرعسکر مقرر ہوئے۔ ان کی شہادت پر یہ عہدہ میاں ضیاء الدین پھلتی کو دے دیا گیا۔

۲۔ مقدمۃ الجیش: یہ جماعت سفر میں سب سے آگے رہتی تھی۔ اس کے سرعسکر شاہ اسمٰعیل مقرر ہوئے۔ لڑائیوں میں مولانا کم تر جماعت کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی جگہ سید رستم علی کارگزار مقرر ہو گئے تھے۔

۳۔ میمنہ: اس جماعت کے سرعسکر امجد خاں رئیس گنتی تھے۔ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ بصورت جنگ یہ جماعت میمنہ پر لڑنے کے لیے مامور تھی۔ امجد خاں کچھ مدت بعد بسلسلہ کار خاص واپس آ گئے تھے، معلوم نہ ہو سکا کہ ان کے بعد کون سرعسکر بنے۔

۴۔ میسرہ: اس جماعت کے سرعسکر سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب تھے۔ انھیں بعض ضروری کاموں کے سلسلے میں ٹونک چھوڑنا پڑا تو شیخ بڈھن ان کی جگہ نیا بتاً سرعسکر بن گئے۔ شیخ موصوف اکوڑہ کی جنگ میں شہید ہو گئے سید محمد یعقوب دوران جہاد میں سید صاحب کے پاس نہ پہنچ سکے لہٰذا اس جماعت کی قیادت پر میاں صلاح الدین پھلتی مامور ہوئے۔ پھر یہ منصب مولانا احمد اللہ ناگپوری کو مل گیا۔ جنگ بالاکوٹ تک وہی سرعسکر تھے۔

۵۔ ساقۃ الجیش: یہ جماعت چھکڑوں اور گاڑیوں کے ہمراہ چلتی تھی۔ سب سے پیچھے روانہ ہوتی اور عموماً سب کے بعد منزل پر پہنچتی۔ اس کے سرعسکر اللہ بخش خاں مورانوی تھے۔ انھیں سید صاحب نے جنگ اکوڑہ میں مجاہدین کا سالار بنایا تھا اور وہ اسی جنگ میں شہید ہوئے۔ ان کے بعد پیر خاں، شیخ حسن علی، محمد خاں خیرآبادی، ابراہیم خاں خیرآبادی یکے بعد دیگرے اس جماعت کے سرعسکر رہے۔

باقی جماعتیں ابتدائی تقسیم یہی تھی۔ پھر جماعتوں یا جیشوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان جیشوں کی تعداد نو تک پہنچ گئی تھی ان میں سے تین جماعتیں قندھاریوں کی تھیں اور ایک میرزا احمد بیگ پنجابی کی۔ قندھاری جماعت کے سرعسکر عام ملا لعل محمد تھے۔ پھر یہ تین حصوں میں تقسیم ہو گئی: ایک کے امیر ملا لعل محمد تھے، دوسری کے ملا قطب الدین ننگرہاری اور تیسری کے جعفر خاں قندھاری۔

مرزا احمد بیگ کی جماعت کا قصہ یوں ہے کہ قیام خہر کے زمانے میں سید صاحب نے بعض رفیقوں کے مشورے سے تنخواہ دار فوج بھی بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اخوند ظہور اللہ نے دو سو آدمی پانچ روپے فی کس کے حساب سے بھرتی کر لیے۔ دو مہینے بعد قرار پایا کہ ابھی تنخواہ دار فوج رکھنے کا وقت نہیں آیا۔ چنانچہ سید صاحب نے اس فوج کے تمام آدمیوں کو مقررہ تنخواہ دے دی، پھر ان کے سامنے فضائل جہاد پر وعظ فرمایا۔ ان میں سے چالیس آدمیوں نے ہندوستانی مجاہدوں کی طرح فی سبیل اللہ جہاد کا فیصلہ کر لیا اور ان کی الگ جماعت بنا دی گئی۔ اس کے سرعسکر مرزا احمد بیگ پنجابی تھے۔ یہ مختلف

مجاہدات میں شریک رہے اور بالاکوٹ میں شہادت پائی۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے' ابتدائی سرعسکر شہید یا فوت ہوتے رہے تو ان کی جگہ دوسرے سرعسکر مقرر ہو گئے۔ بعض خاص مہمات کے لیے سید صاحب خود سرعسکر مقرر فرما دیتے تھے۔ مثلاً اٹک پر حملے کے لیے مجاہدین کو بھیجا گیا تو ارباب بہرام خاں تہکالی کو سالار اعظم بنایا گیا۔ اکثر معرکوں میں مولانا شاہ اسمٰعیل امیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔ امب اور چھتر بائی کے قلعوں کی حفاظت کے لیے علی الترتیب شیخ بلند بخت اور مولانا مصطفیٰ کاندھلوی کو امیر مقرر کیا گیا۔ تسخیر امب کے بعد ضلع ہزارہ میں پیش قدمی کا فیصلہ ہوا تو سید احمد علی کو مجاہدین کا قائد عام بنا دیا گیا۔ وہ جنگ پھولڑہ میں شہید ہوئے۔ اس قسم کی اور بھی مثالیں ملتی ہیں۔ مولانا محمد یوسف کی وفات پر توشہ خانے کا انتظام شیخ ولی محمد کے حوالے کیا گیا جو مولانا مرحوم کی زندگی میں ان کے معاون و پیش کار تھے۔

بھیلے یا دستے ہر جماعت متعدد بھیلوں یا دستوں میں منقسم تھی۔ ایک بھیلے میں کم سے کم بیس زیادہ سے زیادہ پچیس آدمی ہوتے تھے۔ مقررہ دستور کے مطابق پورے بھیلے کا کھانا ایک جگہ پکتا تھا۔ جتنی نفری ہوتی رسد خانے سے ہر بھیلے کو رسد مل جاتی تھی۔ لکڑیاں اور پانی بھیلے کے مختلف آدمی باری باری لایا کرتے تھے۔ جنس سب کو مساوی مقدار میں ملتی تھی۔ چھوٹے یا بڑے، سرعسکر یا سپاہی میں کوئی فرق نہ تھا۔ حتیٰ کہ خود سید صاحب بھی اس مساوات سے مستثنیٰ نہ تھے۔ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کے لیے دن مقرر ہو جاتا تھا۔ سید صاحب بھی اپنی جماعت کے ساتھ جاتے اور برابر لکڑیاں کاٹتے۔ کھانے میں انھیں بھی کوئی امتیاز حاصل نہ تھا اور نہ انھوں نے کبھی اسے پسند فرمایا۔ البتہ مہمان آجاتے تو ان کے لیے نسبتاً اچھا کھانا پکتا اور سید صاحب آداب میزبانی کی پابندی میں ان کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ بعض اوقات عین کھانے کے وقت مہمان آجاتے تو ہر بھیلے سے تھوڑا تھوڑا کھانا منگوا کر گزارہ کر لیا جاتا۔ ایسا بھی ہوتا کہ سید صاحب خود دسترخوان پر نہ بیٹھتے اور مہمانوں کو کھلانے کے بعد کسی بھیلے میں بیٹھ کر تھوڑا سا کھا لیتے۔

رسالدار سید صاحب کی فوج میں چھوٹا سا رسالہ بھی تھا۔ اس کے لیے ابتدا میں کوئی رسالدار

مقرر نہ کیا گیا۔ جنگ زیدہ کے بعد سید صاحب نے فرمایا کہ اب کسی کو رسالدار مقرر کر دینا چاہیے۔
سید حمید علی بریلوی نے حمزہ علی خاں نوہاری والے کا نام پیش کیا۔ شاہ اسمٰعیل نے عبدالحمید خاں کو اس
عہدے کے لیے موزوں قرار دیا۔ ارباب بہرام خاں نے شاہ صاحب کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ
عبدالحمید خاں واقعی فنِ سپہ گری میں بڑے ہوشیار، تجربہ کار اور بہادر ہیں۔ سید صاحب نے انھیں
کے حق میں فیصلہ کیا۔ چنانچہ عمامہ دستِ مبارک سے عبدالحمید خاں کے سر پر باندھا نیز انھیں
ایک رومال، سنہری قبضے کی ایک سروہی، ایک تفنگ اور ایک گھوڑا عنایت فرمایا۔ برہنہ سر
ہو کر ان کے لیے دعا کی۔ اس کے بعد عبدالحمید خاں لشکر میں رسالدار کے لقب سے مشہور ہو گئے۔
جنگ مایار میں بڑی جواں مردی سے لڑے، مہلک زخم کھائے اور چند روز بعد جاں بحق ہو گئے۔
ان کے بعد حمزہ علی خاں کو رسالدار بنایا گیا۔

رسد کا انتظام سرحد پہنچنے کے بعد ابتدائی دور میں مجاہدین کو کثرت بیشتر رسد کی تکلیف رہی۔ بعض اوقات سفر میں کھانا پکانے کا موقع نہ ملتا تھا۔ بعض اوقات
ضرورت کے مطابق جنس ہی ہاتھ نہ آتی تھی۔ مثلاً جنگ شیدو سے پیشتر مجاہدین کو سامانِ معیشت حاصل
کرنے میں بڑی دقتیں پیش آئیں۔ سید صاحب جو روپیہ ساتھ لے گئے تھے، وہ ختم ہو چکا تھا اور انتظام
کے مطابق جن رقموں کا انتظار تھا، وہ پہنچی نہ تھیں۔ یا یوں سمجھیے کہ جو رقمیں ہنڈیوں کی شکل میں آئی
تھیں، ان کا روپیہ ساہوکاروں سے نہ ملا تھا اور کسی پر بوجھ ڈالنا یا سوال کرنا سید صاحب کی عادت
شریف اور شانِ تربیت کے خلاف تھا۔ اس زمانے میں اکثر فاقے کرنے پڑتے یا مجاہدین ساگ پات
کھا کر گزارہ کر لیتے۔ جنگ شیدو کے بعد پنجتار میں بھی حالتِ عسرت قائم رہی۔ کبھی کبھی روزانہ مٹھی بھر
جوار ملنے لگی۔ تندرست غازی پیس کر روٹی پکا لیتے۔ بیماروں کے لیے پانی میں ابال کر آش سی
بنا دیتے۔ جب جوار بھی نہ ملتی تو باہر نکل جاتے اور جنگل میں جڑی بوٹیاں تلاش کرتے یا ان درختوں کے
پتے توڑ لاتے جو کھانے میں بدمزہ نہ ہوتے اور پانی میں جوش دینے سے گل جاتے۔ انھیں میں نمک
ڈال کر کھا لیتے۔

جب روپیہ آنے لگا تو جہاں سے رسد مل سکتی، مقررہ آدمی سرکاری اونٹ لے جا کر خرید لاتے اور مجاہدین میں بحصۂ مساوی تقسیم ہو جاتی۔ سرحد میں عشر کی باقاعدہ تحصیل کا انتظام ہو گیا تو ضرورت کے مطابق غلہ فراہم ہونے لگا۔ موضع منیٹی میں پانچ پن چکیاں سید صاحب نے اپنے انتظام میں لے لیں اور سید مدعلی مجھیانوی کو پچیس تیس مجاہدین کا سردار بنا کر منیٹی میں بٹھا دیا گیا۔ وہاں کے خانوں نے تین متصل مکان خالی کرا دیے، ایک میں غلہ جمع رہتا، دوسرے میں آٹا اور تیسرے میں مجاہدین مقیم تھے۔ پنجتار سے غلہ اونٹوں اور خچروں پر لاد کر منیٹی بھیجا جاتا۔ وہاں سے آٹا پس کر آ جاتا۔ گندم اور مکئی کی مقررہ پسوائی پن چکیوں کے مالکوں کو دی جاتی۔ گندم فی من ایک سیر دس چھٹانک، مکئی فی من اڑھائی سیر۔

اس کے بعد بھی مختلف اوقات میں مجاہدین کو تکلیفیں پیش آتی رہیں۔ جب تک عشر کا انتظام نہ ہوا تھا، مجاہدین تو اپنے ہاتھ سے غلہ پیستے یا اجرت دے کر پسوا لیتے۔ آٹے کے ساتھ مجاہدین کو فی کس مٹھی بھر دال دی جاتی تھی۔ کبھی کبھی گوشت بھی تقسیم ہوتا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب کے پاس نقد رقمیں مسلسل پہنچنے لگیں تو کسی قدر گھی بھی مجاہدین کے لیے خرید لیا جاتا تھا۔

رسد کی تقسیم

تقسیم رسد کا پیمانہ ایک کاٹھ کا ظرف تھا جس میں تین پاؤ غلہ یا آٹا سماتا۔ یہ پیمانہ بریلی سے سید صاحب نے اپنے ساتھ لے لیا تھا۔ یعنی پوری رسد فی کس تین پاؤ یومیہ تھی۔ اگر جنس کم ہوتی تو اسی تناسب سے فی کس مقدار بھی کم کر دی جاتی۔ جب عشر کا غلہ باقاعدہ وصول ہونے لگا تو رسد تین پاؤ کے بجائے ایک سیر فی کس کر دی گئی۔ جتنے مہمان آ جاتے سید صاحب کے آدمی ان کے لیے بھی فی کس رسد اسی حساب سے لے لیتے۔ رسد لانے اور تقسیم کرنے کا انتظام مختلف اصحاب کے ہاتھ میں رہا۔ ابتدا میں مولانا محمد یوسف پھلتی اس خدمت پر مامور تھے۔ نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ ہر جنس ہر شخص کو بالکل مساوی مقدار میں دیتے اور سید صاحب کو بھی رتی بھر زیادہ نہ دیتے۔ بعض اوقات سید صاحب مزاحاً فرماتے کہ مجھے زیادہ کیوں نہیں دی تو عرض کرتے کہ

ہر چیز خدمتِ والا میں پیش کر دینے کے لیے حاضر ہوں لیکن مجھے تقسیم کا حکم دے رکھا ہے اور اس سلسلے میں مساوات کی پابندی پر مجبور ہوں۔ میرا مانت علی بلماذ صورۃ عیز ان چیلاں کے ذمے بھی یہ کام رہا۔ وہ اتنے محتاط تھے کہ جب کوئی مجاہد آکر کہتا میرے جیسے میں آٹا ایک یا دو دھان ہیں تو سید صاحب سے اجازت لینے چلے جاتے۔ بلا اجازت زائد رسد نہ دیتے۔ اس طرح تقسیم میں دیر لگتی اور شکایتیں ہو جاتیں۔

پھر شیخ عبدالوہاب لکھنوی تقسیم رسد پر مامور ہوئے۔ وہ کمزور و نحیف آدمی تھے۔ مختلف عوارض میں مبتلا ہونے کے باوجود قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ تقسیم رسد کے ساتھ ساتھ قرآن بھی پڑھتے جاتے۔ ہر شخص کو ترتیب سے لحاظ سے جنس دیتے۔ چھوٹے یا بڑے کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ حکیم قمرالدین پھلتی اور مولوی نور محمد نگرمی مورخ اسلام مولوی عبدالوہاب کے معاون تھے۔ کام بڑھ جاتا تو منشی محمد قاسم پانی پتی کے والد ماجد میاں غلام محمد کو بھی امداد کے لیے بلا لیا جاتا۔

لباس

ہر مجاہد کو سال بھر کے لیے کھادی کے تین جوڑے کپڑے اور دو جوڑے جوتے ضرور دیے جاتے تھے۔ کسی کے کپڑے جلد پھٹ جاتے یا گم ہو جاتے تو اسے نئے کپڑے دے دیے جاتے۔ سردیوں کے لیے ہر ایک کو ایک ایک دگلہ یا میرزئی اور ایک ایک دوہر ملتی تھی۔ ہر جمعرات کو کپڑے دھونے کے لیے سرا ہم صابون کی دو دو ٹکیاں دی جاتیں۔ بیماروں کے لیے دوا کا انتظام بھی بیت المال سے ہوتا تھا۔

سید صاحب نے مجاہدین میں ایسی دینی روح پیدا کر دی تھی کہ وہ زندگی کے ہر کام کو عبادت سمجھ کر انجام دیتے تھے۔ ان میں محبت و اخوت کے مستحکم رشتے موجود تھے۔ ایک خاندان کے مختلف افراد بھی شاذ ہی ملیں گے۔ اس لیے عموماً ایسا ہوتا کہ جو مجاہد اپنے کپڑے دھونے کے لیے پہلے جاتا وہ اپنے دو تین ساتھیوں کے کپڑے بھی لے جاتا۔ خود سید صاحب ترغیب کی غرض سے اپنی زندگی کے مختلف واقعات بیان فرماتے رہتے۔ مثلاً کہتے کہ جب ہم نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے تو کپڑے دھونے کے وقت اپنے پانچ سات ساتھیوں کے میلے کپڑوں کا بھی گٹھا باندھ کر لے جاتے۔ ساتھی

ہر چند نمیں نہیں کرتے ، ہم ایک نہ سنتے ۔

ایک روشن حقیقت

یہاں یہ حقیقت بھی واضح کر دینی چاہیے کہ ہندوستانی مجاہدین نوکری تنخواہ لیتے تھے اور نہ کوئی معاوضہ ، اس لیے ان کے لباس اور کھانے کا انتظام بیت المال سے کیا جاتا تھا۔ جنگ زیدہ میں جو مالِ غنیمت ملا ، اس کا اندازہ پچیس ہزار روپے کیا گیا تھا۔ سید صاحب نے پانچ ہزار بیت المال میں رکھا اور باقی تقسیم کر دینے کا حکم دے دیا۔ مجاہدین نے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ ہم تو بیت المال سے کھاتے ہیں اور وہیں سے کپڑا پہنتے ہیں ، وہیں سے دوسری ضرورتیں پوری کرتے ہیں ، ہم حصہ لے کر کیا کریں گے۔ سید صاحب نے فرمایا : جو بھائی خوشی سے اپنا حصہ بیت المال کو دیں گے ، اس کا ثواب حاصل کریں گے۔ اکثر نے اپنے پورے حصے لوٹا دیے۔ بعض نے صرف وہ چیزیں رکھ لیں ، جن کی انہیں فوری ضرورت تھی۔ بعض مجاہدین کے گھروں میں تھوڑی تھوڑی رقمیں بھجوائی جاتی تھیں ، جن کے متعلقین کے لیے گزارے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ بعض امرا کے نام سید صاحب کے خطوط سے واضح ہوتا ہے کہ انہیں بے نوا مجاہدین کے اقربا کی پرورش پر توجہ دلائی گئی ۔

چوتھا باب

عسکری تنظیمات

(۲)

زخمیوں کا علاج لشکر اسلام میں جراحی کا صیغہ بھی ابتدا ہی سے قائم تھا اور اس میں وقت کے ماہر جراح کام کرتے تھے۔ مثلاً کریم بخش، رحیم بخش، بعد ان کے بھائی نور بخش ساملی والے اور عبدالرحیم[1] جن کا وطن معلوم نہیں۔ ان کے نام بعض واقعات کے سلسلے میں آگئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس محکمے میں کارکنوں کی تعداد خاصی بڑی ہوگی۔ یہ لوگ باقاعدہ زخم دھوتے تھے؛ گولیاں نکالتے تھے۔ جہاں زخموں کو سینے کی ضرورت ہوتی تھی، سیتے تھے اور ان پر مرہم لگا کر پٹیاں باندھ دیتے تھے۔ عام مجاہدین کی طرح یہ لوگ بھی خدمت دین کی غرض سے سید صاحب کے ساتھ ہوئے تھے۔ ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ان میں سے بعض جراح عام مجاہدوں کے دوش بدوش لڑتے لڑتے میدان جنگ میں شہید ہوئے۔ مثلاً رحیم بخش جراح جنگ پھولڑہ میں اور نور بخش جراح جنگ بالاکوٹ میں۔ کریم بخش جراح نے اہل سمہ کی قاتلانہ سازش کے دوران میں بمقام سدم شہادت پائی۔ حاجی جانی میتھوی بھی لشکر اسلام کے بڑے ماہر جراح تھے۔ جانی محمد جراح رامپوری اور عبدالرحیم جراح جالندھری کے نام بھی مذکور ہیں، جنھوں نے جنگ بالاکوٹ کے بعد اگمرائی میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی تھی۔

مجاہدین کو پہلی جنگ اکوڑہ میں پیش آئی تھی۔ اس کے حالات میں واضح طور پر مرقوم ہے کہ زخمیوں کو لشکر گاہ میں پہنچا دیا گیا، جن کی مرہم پٹی کا فوری انتظام ضروری تھا۔ زخمیوں کے رفیقوں میں سے بعض لوگ ان کی تیمارداری کے لیے مقرر ہو جاتے تھے۔ جنگ مایار کے زخمیوں کی تعداد

[1] یہ عبدالرحیم جالندھری کے علاوہ ہیں۔

زیادہ تھی۔ اس لیے زخم سینے، دوا پکانے اور لگانے میں پوری رت صرف ہوگئی۔ بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ جراحوں کی ضرورت کی چیزیں بھی ہندوستان سے بھیجی جاتی تھیں۔

سامانِ جنگ سید صاحب نے ہر قسم کا جنگی سامان خود بھی خریدا اور بہت سے لوگوں نے ہدیۃً بھی ان کی خدمت میں نہایت قیمتی اسلحہ پیش کیے۔ مثلاً چھریاں، تلواریں، خنجر، پستول، بندوقیں وغیرہ۔ جو مجاہدین وقتاً فوقتاً قافلوں کی شکل میں ہندوستان سے سرحد پہنچتے رہے، وہ بھی نقد روپیہ اور مختلف ہتھیار ساتھ لے جاتے تھے۔ میاں محمد مقیم رام پوری کے قافلے کی نسبت واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تمام ساتھی ضروری سامانِ جنگ سے لیس تھے۔

سید صاحب کے توشہ خانے میں ہتھیار جمع رہتے تھے۔ جب ضرورت پڑتی، دے دیے جاتے۔ بعض ہتھیار عہدہ داروں کو بطور اعزاز دیے جاتے۔ مثلاً عبدالحمید خاں کو رسالداری کا عہدہ دیا گیا تو انھیں گھوڑے کے علاوہ ایک سروہی اور ایک تلوار عنایت ہوئی تھی۔

لشکر مجاہدین میں عموماً توڑے دار بندوقیں استعمال ہوتی تھیں، جو ہندوستان میں عام تھیں۔ بعض کے پاس چقماقی بندوقیں تھیں۔ ان کے لیے چقماق کے پتھر سید صاحب منگواتے رہتے تھے۔ ازواج کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں کہ سنگھاسے چقماق جتنے بھی مل سکیں خرید لیں اور کم از کم ایک ہزار تو ضرور خرید کر بھجوا دیں۔

قرابینیں بھی استعمال ہوتی تھیں اور مختلف جنگوں کے سلسلے میں ان کا بھی ذکر آیا ہے۔ آخر میں کچھ زنبورکیں بھی ہاتھ آگئی تھیں جنھیں چھوٹی توپیں سمجھنا چاہیے۔ سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے مجھے بتایا کہ مجاہدین چمڑے کی دو انگل چوڑی پٹیوں سے نہایت عمدہ توپ تیار کر لیتے تھے۔ یہ ہلکی ہوتی تھی، جسے ایک جگہ سے اٹھا کر بسہولت دوسری جگہ لے جاتے تھے۔ اس کی تفصیل یوں بتائی کہ کچا چمڑا مسالے اور سریش میں تر کر لیا جاتا۔ پھر اس چمڑے کی پٹیاں بنائی جاتیں اور سیدھی لکڑی پر یہ پٹیاں گوندھنے کے انداز میں پے بہ پے لپیٹ دی جاتیں۔ دَل چار انچ موٹا ہو جاتا تو لکڑی نکال کر

اندر یا باہر خاص مسالہ لگا دیا جاتا۔ مجھے ایسی کوئی توپ دیکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ شاہین نام ایک آلے کا ذکر بھی آتا ہے۔ یہ ایسا آلہ تھا جو بندوق سے بڑا اور توپ سے چھوٹا ہوتا تھا۔ مجاہدین نے مختلف جنگوں میں اس سے بھی کام لیا۔

سید صاحب کو بڑی توپیں زیدہ اور مایار کی جنگوں میں ملی تھیں۔ زیدہ کی توپیں امب کی طرف جاتے وقت محفوظ مقام پر دفن کرا دی تھیں۔ گڑھی امیر زئی کے محاصرے میں ان کی ضرورت پڑی تو سب ہی منگوا لیں۔ پھر پنجتار ہی میں رہیں اور ہجرت ثانیہ کے وقت انھیں دوبارہ دفن کرا دیا۔

بارود، گولے، تیل اور گنڈاسے

بارود سازی کا کارخانہ پنجتار میں بنایا گیا تھا۔ غالباً بعض دوسرے مقامات پر بھی عارضی انتظام کر لیا جاتا ہو، لیکن مستقل کارخانہ پنجتار ہی میں رہا۔ مولوی سید جعفر علی نقوی رمضان ۱۲۴۶ھ (فروری ۱۸۳۱ء) میں ہندوستان سے پنجتار پہنچے تھے۔ اس وقت سید صاحب امب میں تھے۔ مولوی صاحب لکھتے ہیں: سرکاری بارود ساز اپنے کام یعنی بارود سازی میں مشغول تھے۔[1] انھیں دنوں بارود کو آگ لگ گئی، دو آدمی شہید ہوئے اور بارود کا میگزین بھی جل گیا۔

سید صاحب کے پاس توپیں آ گئیں تو قاسم خیل میں جو پنجتار کے شمال میں واقع ہے، مولانا احمد اللہ ناگپوری اور مولوی نصیر الدین شیرکوٹی نے گولے ڈھالنے کا کارخانہ قائم کر لیا، جس میں ڈیڑھ سیر، تین سیر اور پانچ سیر کے گولے ڈھلتے تھے۔

مجاہدین کی جو جماعتیں پہلی مرتبہ ہزارہ بھیجی گئی تھیں، انھیں دوسرے سامان جنگ کے علاوہ بانس کے پانچ سات سو نلکی بھی دے دیے گئے تھے۔ یہ ڈیڑھ ڈیڑھ بالشت لمبے تھے اور ان میں بارود بھری ہوئی تھی۔ جنگ کے وقت انھیں آگ دے کر دشمن پر پھینکا جاتا۔ چنانچہ ڈمگلہ کی جنگ میں یہ خوب استعمال ہوئے۔ سینگوں اور بھینسوں کی آنتوں میں بھی بارود بھر کر استعمال کرتے تھے۔

اسلامی لشکر کا ایک خاص ہتھیار دندانہ دار گنڈاسا تھا جسے عام لوہار جلد سے جلد کثیر تعداد میں

---

[1] منظورہ ص ۴۲۳

تیار کر لیتے تھے۔ گنڈاسے کو لمبا دستہ لگا دیا جاتا۔ یہ ان مجاہدین کو دیا جاتا جن کے پاس اور کوئی ہتھیار نہ ہوتا یا جو بندوق اور تلوار سے کام نہ لے سکتے۔ مثلاً شیخ محمد اسحاق گورکھپوری کا بایاں ہاتھ جنگ بنارس میں بے طرح زخمی ہو چکا تھا اور وہ بندوق نہ چلا سکتے تھے۔ لہذا جنگ بالاکوٹ میں انھیں گنڈاسا دے دیا گیا۔

فنونِ جنگ کی مشق

مجاہدین سے قاعدہ اور چاند ماری بھی کرائی جاتی تھی۔ مثلاً قیام ہنڈ کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ میر عبدالرحمن بجناوری، حافظ امام الدین رامپوری اور بعض دوسرے حضرات ان مجاہدین سے نشانے کی مشق کرایا کرتے تھے جن کے پاس توڑے دار بندوقیں تھیں۔ حاجی عبداللہ رامپوری، مولوی امام خاں عظیم آبادی، شیخ خوش علی غازی پوری، شیخ بلند بخت دیوبندی، شیخ نصر اللہ خورجوی اور امیر خاں نے چقماقی بندوقوں اور قرابینوں کی تربیت کا کام سنبھال لیا۔ ڈھائی مہینے کے بعد سید صاحب نے مجاہدین کی پریڈ دیکھی تو بہت خوش ہوئے اور تحسین فرمائی۔ ساتھ ہی کہا، مشاقی پر نازاں نہ ہونا، فتح صرف خدا کے فضل پر موقوف ہے۔ قاعدہ کرانے والے اصحاب روزانہ رات کے وقت سید صاحب کی خدمت میں عرض کیا کرتے تھے کہ آج اس طرح سے قاعدہ کرایا۔ سید صاحب بعض اوقات نہایت عمدہ نکتے بیان فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً اُس زمانے میں ایک دستور یہ تھا کہ سپاہی چھرے تھیلی سے نکال کر منہ میں بھر لیتے اور ضرورت کے مطابق تھوڑے تھوڑے بندوق میں ڈالتے جاتے۔ سید صاحب نے فرمایا: اس میں بڑی مضرتیں ہیں۔ مثلاً بندوق گرم ہو جائے تو بارود بھرتے وقت آگ پکڑ سکتی ہے۔ ایسی حالت میں چھرے منہ سے نالی میں ڈالنا خالی از خطرہ نہیں۔ ایک مضرت یہ ہے کہ چھرے منہ میں ہوں تو میدانِ جنگ میں تکبیر نہیں کہی جا سکتی۔

پنجتار کے سامنے میدان میں مجاہدین برابر مختلف فنونِ جنگ کی مشق کرتے رہتے تھے اور یہاں گھڑ دوڑ بھی ہوتی تھی۔ نواب وزیر الدولہ نے فنونِ حرب کی مشق کے سلسلے میں مندرجہ ذیل امور کا ذکر کیا: گھڑ دوڑ، تلوار اور خنجر چلانا، نیزہ بازی، توپ اور بندوق چلانا، جنگ کے قاعدے سیکھنا،

قلعے فتح کرنا، دشمن کو مارنا اس غرض سے ہر قسم کے ہتھیار جمع کر رکھے تھے[1]۔

نواب صاحب فرماتے ہیں کہ مجاہدین :

ہمہ مار زرہ جوش شگاف و پیکاں دوز   ہمہ کماں کش ورزم آزما و دشمن سوز

چو باد حملہ برو چو کوہ حملہ پذیر   چو رعد بانگ زن و چو برق تیغ فروز[2]

یعنی سب بڑے بہادر تھے۔ مخالفوں کی زرہیں چیر کر رکھ دیتے تھے اور پیکان توڑ ڈالتے تھے۔ سب کمان چلانے میں مشاق تھے۔ جنگ کے دھنی اور دشمنوں کو ختم کر دینے والے۔ وہ حملہ کرنے میں ہوا کی مانند تیز تھے۔ جب ان پر حملہ ہوتا تھا تو پہاڑ کی طرح جم جاتے تھے۔ وہ رعد کی طرح نعرے لگاتے تھے اور ان کی تلواریں بجلی بن کر چمکتی تھیں۔

اکھاڑے

ایک موقع پر ہتھیاروں میں مختلف فنون کے لیے الگ الگ اکھاڑے قائم ہو گئے تھے :

۱۔ نیزہ بازی کا اکھاڑا سید صاحب کے زیر اہتمام۔

۲۔ سواری، نیزہ بازی، بندوق اور تلوار کا اکھاڑا شیخ حمید خاں مساندرک کے زیر اہتمام۔

۳۔ پھری گدکا اور رستم خانی کا اکھاڑا شیخ عبد الوہاب اور خدا بخش میرٹھی کے زیر اہتمام۔

۴۔ امروہچ کا اکھاڑا میرزا محمدی بیگ شاہجہان آبادی کے زیر اہتمام۔

۵۔ غفور خانی کا اکھاڑا سید لطف علی اور امام الدین رام پوری کے زیر اہتمام۔

۶۔ بنیٹی کا اکھاڑا استاد حبیب خاں کے زیر اہتمام۔

یہ اکھاڑے روزانہ عصر سے مغرب تک گرم رہتے تھے۔ سید صاحب خود اس موقع پر موجود رہتے اور ہر اکھاڑے کی مشق کا معاینہ فرماتے۔

لشکر کے نشان

لشکر کے بڑے نشان یا پرچم تین تھے :

۱۔ صبغۃ اللہ : یہ جماعت خاص کا نشان تھا اور ابو الحسن نصیر آبادی کے

[1] وصایا ، حصہ دوم صـ۲۸۔   [2] ایضاً صـ۱۹۔

پاس رہتا تھا جو جماعت خاص کے نظم ونسق میں رہتے تھے۔ اس پر پہلے پارے کا آخری رکوع سرخ ریشم سے کاڑھا گیا تھا۔ یہ نشان صرف اس لڑائی میں جاتا تھا جس میں سید صاحب خود شریک ہوتے۔

۲۔ مطیع اللہ: اس پر سورۂ بقرہ کا آخری رکوع سرخ ریشم سے کاڑھا گیا تھا۔ یہ زیادہ تر خان جیو آبادی کے پاس رہتا تھا۔

۳۔ فتح اللہ: اس پر سورۂ صف کی کچھ آیتیں کڑھی ہوئی تھیں مثلاً یا ایہا الذین آمنوا ھل ادلکم علی تجارۃ... یہ نشان پہلے محمد عرب کے پاس رہتا تھا۔ پھر اسے فرخ اللہ شہیدی کے حوالے کر دیا گیا۔

ان کے علاوہ بھی مختلف جماعتوں کے چھوٹے نشان ہوں گے۔ خاص نشان یہی تین تھے۔

متفرق امور

مجاہدین کو قلعوں پر بھی حملے کرنے کی نوبت آئی اور ان لشکروں پر بھی شبخون مارنے پڑے، جنھوں نے حفاظت کی غرض سے اردگرد مضبوط خاربندی کا انتظام کر لیا تھا۔ لہٰذا ایسے موقعوں کے لیے سیڑھیاں بھی بنوائی گئی تھیں اور خاربندی سے گزرنے کے لیے چارپائیاں بھی استعمال کر لیتے تھے۔ مثلاً زمگلر کے شبخون میں آخری تدبیر ہی سے کام لیا گیا تھا۔ جب خادے خاں پر حملے کا فیصلہ ہوا تو معلوم تھا کہ ہنڈ کا قلعہ بہت مضبوط ہے، لہٰذا چیڑ کی لکڑی کے تختے سے دو سیڑھیاں بنوا لی گئیں۔ چھتر بائی کے محاصرے کے وقت بھی مجاہدین کے پاس سیڑھیاں موجود تھیں۔ میدان جنگ میں مختلف صاحب مجاہدین کو پانی پلانے پر مامور ہو جاتے تھے، انھیں "سقا" کا لقب دے دیا جاتا۔ چنانچہ بالا کی جنگ میں سب سے پہلے وہی صاحب شہید ہوئے جو بڑی مستعدی سے مشکیزے بھر بھر کر مجاہدین کو پانی پلا رہے تھے۔ شہدائے بالاکوٹ میں روشن سقا ساکن کونٹلی کا بھی ذکر آیا ہے۔

لڑائی یا شبخون کے لیے لمبا سفر درپیش ہوتا تو مجاہدین کو روغنی روٹیاں تیار کر لینے کا حکم دے دیا جاتا۔ چنانچہ اتمان زئی پر پیش قدمی کے سلسلے میں ہر مجاہد کو ایک ایک سیر آٹا، ایک ایک پاؤ گھی اور ایک ایک پاؤ گڑ دے دیا گیا۔ جس راستے میں پانی کمیاب ہوتا، وہاں جا بجا پہلے سے پانی کا

انتظام کر دیا جاتا۔ جلاوطنے ۔ تمام نذرانی جانے لگے تو مجاہدین کے پیچھے پانی کی مشکوں کا بندوبست کر دیا گیا۔ ایک دستور یہ تھا کہ فوجی اقدامات کو عام لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے کا انتہائی اہتمام کیا جاتا۔ مثلاً شاہ اسمٰعیل سندھ پر حملے کے لیے موضع بازار سے لاہور کو نکلے۔ وہ پہلے گڑھی امان زئی ہوتے ہوئے ترکئی پہنچے۔ وہاں سے نکلے تو پہلے پنجتار کا رخ کیا تاکہ کسی کو خیال نہ ہو کہ پنجتار کے سوا کہیں جانا منظور ہے۔ دو کوس پر نماز عشا ادا کی، وہاں سے ہند کا رخ کیا۔

شجاعت اور حسنِ تدبیر

شاہ اسمٰعیل نے ایک موقع پر فرمایا کہ دشمن سے رزم و پیکار کے لیے انسانوں کی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض صاحبِ تدبیر ہوتے ہیں، بعض شجاع و دلاور، بعض دونوں خصوصیتوں کے جامع ہوتے ہیں یعنی مدبر بھی اور شجاع بھی۔ محض با تدبیر لوگ ہمیں اس مقام پر کام نہیں دے سکتے، اس لیے کہ یہ مقام شجاعت کا ہے نہ کہ تدبیر کا۔

شاہ صاحب کا مقصد یہ تھا کہ سازوسامان اور فوجوں کی قلت کے باعث مجاہدین کو شجاعت و مردانگی کی سب سے بڑھ کر ضرورت تھی۔ محض مردانگی ہی کی برکت سے وہ مسلمانوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتے تھے اور انھیں بہ تعداد کثیر میدانِ جنگ میں لا سکتے تھے۔ لیکن سید صاحب کے مجاہدین میں دونوں قسم کے آدمی شامل تھے۔ شجاعت میں بھی کوئی ان سے برتری کا دعویٰ نہ کر سکتا تھا اور حسنِ تدبیر کی مثالیں بھی سامنے رکھی جائیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ کوئی ماہرِ فنِ حرب ان سے بازی نہ لے جا سکتا تھا۔ دونوں وصفوں کے جامع بہت سے لوگ موجود تھے۔ مثلاً شاہ اسمٰعیل، امام خاں خیر آبادی، مولانا محمد یوسف پھلتی، شیخ ولی محمد پھلتی، شیخ بلند بخت دیوبندی، مولوی خیرالدین شیرکوٹی، مولوی مصطفیٰ کوٹ ہلوری، عبدالحمید خاں رسالدار، ارباب بہرام خاں، قاضی سید محمد حبان وغیرہ۔ ان میں سے کون سا فرد تھا جس کی قیادت ہر فوج کے لیے انتہائی عزّ و اکرام کا سرمایہ نہ ہوتی۔

مجاہدین پر شفقت

سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے:

وفورِ شفقت بر غازیاں چناں بود کہ ہر کس جناب ممدوح را زیادہ از پدر و مادرِ خود می دانست۱؎

سید صاحب مجاہدین پر اتنی زیادہ مہربانی اور شفقت فرماتے تھے کہ ہر شخص آپ کو باپ و ماں سے زیادہ مہربان و شفیق سمجھتا تھا۔

یہ الفاظ بیشک ایک روشن حقیقت کا آئینہ ہیں۔ سید صاحب بالطبع بھی بدرجۂ غایت شفیق تھے۔ جن مجاہدین کو وہ وطن اور اہل و عیال سے نکال کر راہِ خدا میں قربانی کے لیے لا رہے تھے ان پر شفقت کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے، خصوصاً اس یگانہ بزرگ کی شفقت جو دنیا کے تمام رشتے توڑ کر صرف ایک رشتے کے استحکام کو زندگی کا نصب العین قرار دے چکا تھا اور وہ خدا کی محبت و رضا کا رشتہ تھا۔ اسی رشتے نے وقت کے ممتاز ترین ناموں، بڑے بڑے رئیسوں کے جگر بندوں اور عام مسلمانوں میں وہ روحِ ایمان پیدا کر دی تھی کہ وہ خدا کی راہ میں زیادہ سے زیادہ تکلیفیں راحت و شادمانی سمجھتے تھے اور جو شہادت پاتا تھا اس کے متعلق کہتے تھے کہ وہ مراد کو پہنچ گیا۔

۱؎ منظورہ، صفحہ ۹۴۳۔

پانچواں باب

ادارہ و انتظام کا نقشہ

ضروری گزارش سید صاحب ۱۸۲۶ء کے اواخر میں سرحد پہنچے تھے، اور ۲۰۔ دسمبر ۱۸۲۶ء کو پہلی جنگ پیش آئی تھی۔ اس کے بعد کم و بیش تین سال تک کسی بڑے یا چھوٹے علاقے میں حکمرانی کا عملی نقشہ پیش کرنے کی کوئی صورت پیدا نہ ہوئی۔ فروری ۱۸۲۹ء میں بیعت شریعت ہوئی اور مختلف مقامی رئیسوں نے بہ طیب خاطر شرعی نظام کا اجرا قبول کیا۔ اس سلسلے میں سید صاحب کو عشر ادا کرنے کا فیصلہ ہوا لیکن اس میں باقاعدگی قاضی سید محمد حبان نے سرحد کے پورے میدانی علاقے کا دورہ کر کے پیدا کی۔ اُس وقت سے وہ نظام حکومت اپنی ابتدائی شکل میں نافذ ہوا جو سید صاحب ہر جگہ نافذ کرنا چاہتے تھے، مگر اس پر عمل کی مدت بہت تھوڑی ہے۔ اس لیے کہ چند ماہ بعد سرداران پشاور اور بعض دوسرے خوانین نے سازش کر کے مجاہدین کی بہت بڑی تعداد کو بے خبرانہ شہید کر ڈالا اور سید صاحب سرحد کا میدانی علاقہ چھوڑ کر کسی دوسرے مرکز کی تلاش میں نکل پڑے۔ یوں اس نظام پر آٹھ دس مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال کا عملی نقشہ ہمارے سامنے آیا اور جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، وہ بھی بالکل ابتدائی شکل میں۔ اس کے متعلق جتنی تفصیلات مل سکیں، وہ یہاں پیش کی جاتی ہیں ۔

عہدہ داروں کا تقرر سید صاحب کے نظام حکومت میں عہدہ دار زیادہ نہ تھے، اس لیے کہ حکومت براہ راست ان کے ہاتھ میں نہ تھی۔ سرحدی علاقے کے رئیسوں نے عشر دینا منظور کیا تھا، اس کی بنا پر سید صاحب نے جا بجا قاضی مقرر کر دیے کہ لوگوں کے منازعات کا فیصلہ شریعت کے مطابق کریں اور بعض علما کو مختلف علاقوں میں منصب افتا پر مامور کر دیا۔

قاضی سید محمد جان پہلے سے لشکرِ اسلام کے قاضی القضاۃ تھے، انھیں پورے علاقے کے لیے قاضی القضاۃ بنا دیا گیا۔ وہ جنگ ِمردان میں شہید ہو گئے تو یہ عہدہ مولوی محمد رمضان کو دے دیا۔ مختلف علاقوں کے قاضیوں کی پوری تفصیل معلوم نہیں۔ قیاس یہ ہے کہ وہ مقامی علماء تھے۔ مثلاً صاحب زادہ نواب عبدالقیوم مرحوم کے نانا، ملا سید میر (ملا صاحب کوٹھا) کو کوٹھا کا قاضی بنایا گیا تھا اور ملا مفتی اللہ شیوہ کے قاضی تھے۔ صرف پشاور میں مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو عہدۂ قضا دینا پڑا، اس لیے کہ سردار سلطان محمد خاں بارک زئی کی خواہش یہی تھی۔

ملا قطب الدین ننگرہاری پورے علاقے کے لیے محتسب مامور ہوئے اور تیس تفنگچی ان کے ساتھ مقرر کر دیے گئے۔ وہ قریہ بہ قریہ اور دہ بہ دہ دورے کرتے رہتے تھے۔ جہاں کوئی امر خلافِ شرع پاتے، اس کا انسداد کر دیتے۔ ایک مکتوب مظہر ہے:

ملا قطب الدین ساکن ضلع ننگرہار کہ از	ملا قطب الدین ننگرہاری جو طویل مدت سے
مدت مدید بنا بر اقامت جہاد در رفاقت آنجناب	اقامت جہاد کے سلسلے میں سید صاحب کے رفیق
سالہا بسر کردہ ودر دیانت وتقوی بے نظیر بر آمد	ہیں اور دیانت وتقویٰ میں بے نظیر، انھیں تارکین
خدمت احتساب بر تارکین صلوٰۃ سپردہ شد وقریباً	صلوٰۃ پر احتساب کے لیے مقرر کر دیا ہے اور تقریباً
سی مردم تفنگچی از قندھاریاں ہمراہ او متعین کردہ شدہ	میں قریباً تیس بندوقچی ان کے ساتھ کر دیے ہیں۔

راویوں کا بیان ہے کہ تھوڑی ہی مدت میں پورے علاقے کی کایا پلٹ گئی۔ تمام لوگ شریعت کے پابند ہو گئے۔ پتنہ داریاں ٹوٹ گئیں۔ مقدمات کے فیصلے شریعت کے مطابق ہونے لگے۔ ملا قطب الدین کے ساتھیوں میں سے کوئی ایک کسی دوسرے کام کے سلسلے میں بھی کہیں جاتا تو گاؤں کے لوگ دوڑے آتے اور بتاتے کہ یہاں کوئی بے نماز نہیں:

ہر صغیر وکبیر از دیہات مذکور بر ادائے صلوٰۃ	دیہات کے تمام چھوٹے بڑے ادائے نماز

لہ راسے بریلی والے خطوط کا مجموعہ صـ۲۹۔

سوار غصے میں آگئے۔ رسالدار کو اس واقعے کا علم ہوا تو دونوں سواروں کے بیس بیس تازیانے لگوائے۔

مجلس شوریٰ

سید صاحب کا دستور ابتدا سے یہ رہا کہ ہر معاملے کے متعلق اپنے خاص رفیقوں سے مشورہ کر لیتے تھے۔ ذاتی معاملات کے متعلق صرف اقربا یا بعض خاص رفیقوں سے مشورہ کرتے تھے۔ دینی مسائل علما سے پوچھتے تھے۔ جہاد اور نظم و نسق کے متعلق جو اصحاب مختلف اوقات میں مجلس شوریٰ کے رکن رہے، ان کے نام ذیل میں درج ہیں:

مولانا عبدالحی، مولانا شاہ اسمٰعیل، سید احمد علی، سید حمید الدین، سید عبدالرحمٰن (تینوں سید صاحب کے بھانجے تھے)، سید محمد یعقوب (سید صاحب کے بھتیجے)، مولوی وحید الدین، مولانا محمد یوسف پھلتی، خواجہ محمد حسن پوری، ارباب بہرام خاں، مولوی محمد حسن، شیخ بلند بخت، مولوی خیر الدین شیرکوٹی، امام خاں خیر آبادی، سید محمد علی رام پوری، مولوی ولایت علی عظیم آبادی، قاضی سید محمد حبان، سید اکبر شاہ ستھانوی، فتح خاں پنجتاری، ملا لعل محمد قندھاری، ملا قطب الدین ننگرہاری۔

ہر اہم معاملے کے متعلق ان میں سے موجود اصحاب کو بلایا جاتا، ان کی رائے پوچھنے کے بعد قطعی فیصلہ کیا جاتا۔ توشہ خانے اور سلاح خانے کا انتظام پہلے مولانا محمد یوسف پھلتی کے حوالے تھا۔ اس انتظام کے سلسلے میں مولانا موصوف ہی سے مشورہ کرتے تھے۔ جب وہ فوت ہو گئے اور شیخ ولی محمد ان کی جگہ مامور ہوئے تو مال، اسباب اور ہتھیاروں کے متعلق ان کی رائے لیتے تھے۔

امان نامے اور عطیے

مجموعۂ مکاتیب میں بعض ایسی تحریریں بھی موجود ہیں جنھیں امان ناموں سے موسوم کیا گیا ہے یا بعض لوگوں نے ملکیتوں کی بازیافت کے متعلق درخواستیں پیش کیں تو فرمایا کہ جب وہ علاقے ہمارے قبضے میں آئیں گے اور ملکیتوں کا ثبوت مل جائے گا تو یہ واپس کر دی جائیں گی۔ اس قسم کی تمام تحریرات میں مختلف شرطیں مذکور ہیں، مثلاً:

۱ - بہ شرط اتباع احکام شریعت

۲ - بہ شرط ادائے عشر

۳ - بہ شرط اتباع شرع و رفاقت مجاہدین

۴ - بہ شرط اتباع شریعت و خدمت دین

بعض علماء کو قضا و افتاء کے منصب پر مامور کرتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی خدمت سونپی گئی۔ بعض رؤسا و خوانین کو جاگیروں کی بحالی سے متعلق تحریریں دی گئیں۔ ان تحریروں میں بھی اتباع شریعت کی شرط موجود ہے[1]۔

اتباع شریعت

سید صاحب کو اس بات کا خاص خیال تھا کہ تمام مسلمان ہر معاملے میں شرعی احکام کے پابند ہو جائیں۔ بیعت شریعت کے وقت خوانین نے خود اقرار نامے پیش کر دیے تھے کہ وہ شرعی احکام سے سرمو انحراف نہ کریں گے۔ ان میں فتح خاں پنجتاری بھی شامل تھا جس کا وطن سید صاحب کا مرکز جہاد تھا۔ آپ بار بار فرماتے:

رسوم ریاست و سیاست و ساز / حکومت و سیاست اور دوسرے امور

رسوم غیر مشروعہ کہ بنا بر تحصیل مال و جاہ وابستہ / میں جو غیر شرعی طریقے مال اندوزی کی غرض سے

بود آں ہمہ را یک قلم ترک نمایید[2] / جاری کر رکھے ہیں ان سب کو یک قلم چھوڑ دو۔

عام لوگوں کی طرح ہماری رفاقت اختیار کرو اور شرعی احکام کے مقابلے میں دوستوں، عزیزوں کی پاسداری سے کنارہ کش ہو جاؤ۔

اعلان عام

ایک اعلان تمام مخلص مسلمانوں اور لشکر مجاہدین کے نام ہے جس کے ترجمہ[3] کا ضروری حصہ ذیل میں درج ہے:

۱ - لوگوں میں جھگڑا پیدا ہو تو اس کا فیصلہ خود نہ کریں بلکہ قاضی سے کرائیں۔ کسی بھائی کو اس معاملے میں دخل دینا مناسب نہیں۔

۲ - ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ جو کچھ کہنا ہو قاضی کے سامنے کہے۔ اگر وہ بہانہ کرے گا تو

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل قلمی ص [illegible]–۱۴۲۔ [2] [illegible]۔

تعدی کا اندیشہ رہے گا اور تعدی خدا و رسولؐ کے نزدیک حد درجہ ناپسندیدہ ہے:

اگر کسے از لشکریان این جانب کارروائی بدون معرفت قاضی پیش خواہد آمد و در آں چیزے جور و تعدی خواہد شد، قاضیان او را سزا خواہند داد و اگر قاضیان چیزے قصور خواہند کرد، اینجا تنبیہ واقع خواہد شد و ہر کسے را کہ اجرائے حکم منظور باشد بمعرفت قاضی نماید[1]۔

اگر ہمارا کوئی لشکری قاضی کے بغیر کوئی حکم جاری کرے گا اور اس میں ظلم و تعدی کا پہلو ہوگا تو قاضی اسے سزا دیں گے۔ اگر قاضیوں سے کوئی قصور سرزد ہوگا تو ہماری طرف سے تنبیہ کی جائے گی جس شخص کو کوئی حکم جاری کرانا منظور ہو، وہ قاضی کی معرفت کرائے۔

"سید احمد شہید" میں ہم بتا چکے ہیں کہ سید صاحب نے جنگ مایار کے بعد پشاور پر پیش قدمی کی تھی تو راستے میں ہر مقام پر عام لوگ زمینداروں کی شکایتیں لے کر آتے اور کہتے کہ وہ ہم سے پیداوار کا نصف حصہ لے لیتے اور تحصیل و انتظام کا پورا خرچ ہم پر ڈالتے۔ اس طرح پیداوار میں سے بمشکل ایک تہائی حصہ عام کسانوں، کاشتکاروں اور زمینداروں کو ملتا تھا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہمیں پیداوار کا صرف ایک تہائی حصہ دیتے جانا۔ اسی میں ہم اپنا خرچ چلائیں گے۔ بہرحال سید صاحب صرف یہ چاہتے تھے کہ عدالت، فیصلۂ مقدمات اور انتظامات میں شرعی اصول و مقاصد کے مطابق عمل ہو اور ظلم و فسق کا خاتمہ ہو جائے۔

اس سرسری انتظامی نقشے کو پیش نظر رکھتے ہوئے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سید صاحب کا مجوزہ نظام حکومت عوام کے لیے کس درجہ باعث رحمت تھا اور جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، یہ بالکل ابتدائی نقشہ ہے۔ اگر انھیں کسی علاقے میں مستقل حکومت قائم کرنے کا موقع مل جاتا تو وہ ہمارے لیے نہایت عمدہ نمونہ بن جاتا۔

جرائم کے لیے سزائیں جو تفصیلات ہمارے سامنے آئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر

---

[1] مجموعۂ مکاتیب شاہ اسمٰعیل، قلمی نسخہ صفحہ ۲۶۲-۲۶۳

زور نماز کی پابندی پر دیا جاتا تھا۔ اس لیے کہ لوگ اس اہم ترین فرض کی بجا آوری میں تساہل کرتے تھے۔ جو مرد نماز ادا نہ کرتے تھے امان خان گنج پوری قاضی کے احکام کے مطابق انھیں تازیانے لگائے جاتے۔ عورتوں کو خود سید صاحب زنانے میں لے جا کر سزا دیتے تھے۔ قیام اسب کے زمانے میں صرف دو عورتوں کو سزا ملی، ایک تارک صلوٰۃ تھی، دوسری نے شوہر کے ہوتے ہوئے اپنے آپ کو بیوہ ظاہر کیا۔ دریا پر ننگے نہانے والوں کو پہلے جرمانے کی سزا دی جاتی تھی۔ پھر ان کے لیے تازیانے کی سزا مقرر ہوگئی۔ جانوروں کی چراگاہوں میں فصلوں کے نقصان کی شکایتیں موصول ہوئیں تو شروع میں ہر جانور کے لیے جرمانہ مقرر ہوا۔ بعد میں حکم دے دیا گیا کہ ہر فصل کے نقصان کا اندازہ کر کے مالک کو پورا تاوان دلایا جائے۔ اصلاح معاشرت کے سلسلے میں مختلف برائیوں کا انسداد کیا گیا، مثلاً لڑکیوں کی شادی کے لیے بھاری رقمیں چاہنا، دیر تک لڑکیوں کو بیٹھے رکھنا اور شادیاں نہ کرنا یا پیسے وصول کرنے کی غرض سے رخصتی کو التوا میں ڈالنا، گروہ بندیوں کا انسداد، انتقام گیری کے سلسلے میں خونریزی کو تمنا ہی بنا دینے کا سد باب۔

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں ترک نماز پر فی نماز دو روپے جرمانہ لیا جاتا تھا لیکن یہ عام لوگوں سے اٹھا لئے۔ غیر شرعی رسموں کے سلسلے میں موتی پر نوحہ و سینہ کوبی کو بھی روکا گیا۔

چھٹا باب

دفتری ترتیبات

محکمۂ تحریر سید صاحب کے انتظامی معاملات اگرچہ ابتدائی مراحل سے آگے نہ بڑھنے پائے؛ تاہم انھوں نے شروع ہی سے ایک محکمۂ تحریر قائم کر لیا تھا، جسے اصطلاح میں "منشی خانہ" کہتے تھے۔ منشی محمدی انصاری برروانی اس محکمے کے رئیس یا سرمنشی تھے۔ سید صاحب انھیں "انصاری بھائی" کہہ کر پکارتے تھے۔ انھیں نگارش میں ایسا کمال حاصل تھا کہ کسی موقع پر اندھیرے میں بھی کچھ لکھنا پڑتا تو بے تکلف لکھتے۔ نہ کوئی حرف خطا ہوتا، نہ الفاظ آپس میں ملتے اور نہ سطریں ٹیڑھی ہوتیں۔

متعدد اصحاب منشی خانہ سے وابستہ تھے، جن میں سے بعض کو قلمدان ملے ہوئے تھے، یعنی وہ باقاعدہ منشی سمجھے جاتے تھے۔ بعض کے پاس قلمدان نہ تھے، اگرچہ وہ عام طور پر منشیوں ہی میں شمار ہوتے تھے۔ اس محکمے کے کارکنوں میں منشی محمدی، انصاری کے علاوہ مندرجہ ذیل اصحاب کا ذکر آیا ہے:

حافظ صابر، حافظ عبداللہ، منشی خواجہ محمد، مولوی محمد قاسم پانی پتی، منشی فضل الرحمٰن برروانی (یہ منشی محمدی انصاری کے ماموں تھے)، میر فیض علی گورکھ پوری (سید جعفر علی نقوی صاحب "منظورۃ السعداء")، حافظ عبدالعلی پھلتی، مولوی ریاست علی موہانی۔

سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ آخری دو صاحبوں کے پاس قلمدان نہ تھے اور ان کے لیے منشی خانہ میں بیٹھنا بھی لازم نہ تھا۔

اطلاعات کا اہتمام جب لشکر کا کوئی حصہ کار دیار جہاد کے لیے باہر بھیجا جاتا تھا تو اس کے ساتھ بھی ایک یا دو منشی ضرور جاتے تھے تاکہ تمام حالات کے متعلق روزانہ اطلاعات مرکز میں پہنچتی رہیں اور سالار لشکر کو مختلف خوانین یا سرداروں کے نام خط

بھیجنے پڑیں تو کوئی دقت پیش نہ آئے۔ مثال کے طور پر سید احمد علی رائے بریلوی کو پھولڑہ بھیجا گیا تو وہ سید جعفر علی نقوی کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ میر فیض علی گورکھپوری مدت سے "منشی خانہ" میں مامور ہیں اور لشکر اسلام کے رسوم خطاب نیز طریق مکاتبت سے بخوبی واقف ہیں، ان کا مرکز میں رہنا بہتر ہوگا۔ سید صاحب نے میر فیض علی سے فرمایا کہ یہ آپ کا بھائی (سید جعفر علی نقوی) بڑی لمبی منزلیں طے کر کے آیا ہے اور ابھی ماندگی دور نہیں ہوئی لہٰذا آپ ہی چلے جائیں۔ انھوں نے عرض کیا بسر و چشم۔ چنانچہ وہ گئے اور جنگ پھولڑہ میں شہادت پائی۔

بعض اوقات مکاتیب یا اعلانات کی متعدد نقلیں کرانا ضروری ہوجاتا تھا۔ ایسے مواقع پر مزید آدمیوں کو امداد کی غرض سے منشی خانہ میں بلوا لیا جاتا تھا، مثلاً حکیم قمر الدین پھلتی، نور محمد نگرامی، عبدالوہاب قاسم خلف، غلام محمد پانی پتی (والد منشی محمد قاسم)۔

طریقِ مکاتبت

جب شاہ اسمٰعیل مرکز میں ہوتے تو تمام مکاتیب وہی لکھواتے۔ سید صاحب مضمون بتا دیتے اور شاہ صاحب اسے عبارت کا لباس پہنا دیتے۔ وہ مضمون بولتے جاتے اور منشیوں میں سے کوئی ایک لکھتا جاتا۔ سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ خود شاہ صاحب کو کتابت پر ویسی قدرت حاصل نہ تھی جیسی کہ ہونی چاہیے تھی۔[1]

ہر تحریر پر میر منشی صاحب ایک خاص نشان بنا دیتے جو انھیں کو معلوم ہوتا۔ اس کے بغیر کسی تحریر پر مہر نہ لگائی جا سکتی تھی۔ منشی محمدی انصاری ہر تحریر کو بغور پڑھ لیتے۔ مہر ہوجانے کے بعد اسے جہاں بھیجنا ہوتا بھیج دیا جاتا۔ توضیحات کے التزام کا یہ حال تھا کہ جو مکتوب بزورِ دست سید صاحب کے زبان سے لکھا جاتا اس کے ایک گوشے میں "حضور" لکھ دیا جاتا، جو شاہ اسمٰعیل کی وساطت سے موصول ہوتا اس کے کسی گوشے میں "مولانا" تحریر کر دیا جاتا۔ یعنی اس کا مضمون براہ راست نہیں بلکہ بوساطت

---

[1] منظورہ صفحہ ۔۔۔ اس باب کی تمام اطلاعات زیادہ تر "منظورہ" ہی سے ماخوذ ہیں۔ کتابت کے متعلق منظورہ کے الفاظ یہ ہیں: "قدرت بر کتابت چنانکہ باید داشتند" مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے کتابت کی مشق نہ کی اور وہ مشاق آدمیوں کی طرح لکھ نہ سکتے تھے۔

میدانِ جنگ میں وہ عام سپاہیوں کی طرح کام کرتے تھے۔ قلمدان چھُری کی طرح کمر میں لٹکا لیتے۔ جب لکھنے کی ضرورت ہوتی، بے توقف لکھنے لگتے۔

سردار پائندہ خاں تنولی کا منشی محمد غوث سردار کو چھوڑ کر سید صاحب کے پاس آ گیا تھا۔ وہ منشی خانہ کے سامان کی سادگی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سید جعفر علی نقوی کے پاس پرانا قلمدان اور ایک پرانی قینچی تھی۔ منشی محمد غوث نے کہا کہ میں آپ کو نیا چاقو اور نیا قلمدان لا دوں گا۔ سید جعفر علی نقوی نے فرمایا:

مرا حاجت بہ قلم تراشِ شما نیست۔ خدمتِ دین نمائید۔ ہمیں امر از شما راضی خواہم شد۔ مرا شغل عمدہ با سرکارہائے دنیا نہ باید شناخت۔ ایں جا جاروب کش و منشی یکساں است۔ اخلاص کامل می باید۔ چوں کار بدیں قلمدان و مقراض کہنہ ہم ممکن است و بہ شراکت از قلم تراش دیگراں درستی قلم ہم می شود۔ حاجت ہیچ چیزے نمی افتد۔[1]

مجھے آپ کے چاقو کی ضرورت نہیں۔ دین کی خدمت بجا لائیں۔ یہی امر میرے لیے خوشنودی کا باعث ہوگا۔ مجھے دنیا دار حکومتوں کے کارکنوں کی طرح نہ سمجھیے۔ ہمارے ہاں جھاڑو دینے والے شخص اور منشی کی شخصیت ایک سی ہے۔ یہاں اخلاص کامل درکار ہے۔ جب اس پرانے قلمدان اور پرانی قینچی سے کام چل سکتا ہے اور دوسروں کا چاقو لے کر قلم بھی بنایا جا سکتا ہے تو مجھے کسی چیز کی کیا ضرورت ہے؟

غور طلب حقیقت

سید جعفر علی نقوی کا جواب محض ایک تاریخی واقعے کے طور پر نہ پڑھیے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ سید صاحب نے اپنے مخلصین میں کس قسم کی روحِ فکر و عمل پیدا کر دی تھی۔ وہ لوگ اپنی زندگیاں راہِ خدا میں وقف کر چکے تھے۔ اگر نئے قلمدانوں یا نئی قینچیوں اور چاقوؤں کی خواہش کرتے تو یہ ایسی خواہش نہ تھی کہ سید صاحب کے لیے محدود وسائل کے باوجود سے پورا کر دینا غیر ممکن ہوتا۔ لیکن وہ لوگ صرف ایک ہی غرض لے کر آئے تھے کہ جس طور بھی ممکن ہو مقاصدِ دین پورے کریں۔ سید صاحب کی تربیت اور مردم گری کا کمال یہ ہے کہ مجاہدین نے یہ سادگی یا

[1] "منظورہ" ۱۰۶۶

سامان کی فروانگی مجبوری کی حالت میں قبول نہ کی تھی بلکہ وہ اس پر ہر لحاظ سے قانع اور خوش تھے اور اسے عند اللہ ثواب میں زیادتی کا باعث سمجھتے تھے۔ یہ اخلاص ہندوستان میں سید صاحب کی جماعت کے سوا اور کس جماعت کو نصیب ہوا؟ یہ مسلمانوں کے لیے ایک نمونہ تھا کہ جہاد فی سبیل اللہ محض سامانوں کی فراوانی اور شان و شوکت پر نہیں بلکہ ایمان کی پختگی اور استقامت پر موقوف ہے۔ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو جب لڑائیاں پیش آئی تھیں تو دشمنوں کے مقابلے میں ان کے پاس کہاں سا سامان تھا؟ لیکن تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ جن دشمنوں کا شکوہ و دبدبہ دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہو جاتی تھیں، وہ ایمان و استقامت کے مقابلے میں غبارِ راہ بن کر اڑ گئے۔ سید صاحب ہندوستان میں اخلاص کا وہی منظر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے نمونہ پیش کر دیا جس کی درخشانی زمانے کی گردش سے ماند نہیں پڑ سکتی۔ باقی رہا یہ امر کہ حسب مراد فوری نتیجے کیوں پیدا نہ ہوئے تو قدرت کی مصلحتوں کا بھید کسی پر آشکارا نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں نے فوائد کا راستہ سوداگری اور تجارت نہیں کہ سرمایہ لگایا اور نفع کے امیدوار بن گئے۔ فرمانبردار بندوں کو بہرحال احکامِ الٰہی کا پابند رہنا چاہیے۔ رضا جوئی کا تقاضا یہی ہے۔ نتیجے سے انھیں بالکل بے پروائی اختیار رکھنی چاہیے۔ ان کے سازِ وجود کا ترانہ یہی ہوتا ہے:

به دُرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقیِ ما ریخت عینِ الطاف است

راہِ حق کے علمبرداروں کی زندگیوں کا جائزہ لیا جائے تو ان میں رنج و مشقت، قید و بند، دار و رسن اور قتل و شہادت کے سوا کیا مل سکتا ہے؟ گویا ہر لمحہ ان کے لیے ثبات و استقامت کی ایک نئی امتحان گاہ ہوتا ہے۔ شاید خواجہ حافظ نے اسی حقیقت کے پیش نظر کہا تھا:

در طریقِ عشقبازی امن و آسایش خطاست
ریش باد آن دل کہ با دردِ تو جوید مرہمے

ساتواں باب

خط وکتابت

مجموعۂ مکاتیب سید صاحب نے تقریباً ساڑھے چار سال سرحد میں گزارے اور اس تھوڑی سی مدت کے نیل ونہار کا بیشتر حصہ جہاد کی دعوت، لشکر کی تنظیم، ایک دوسرے کے۔ ۔ ۔ خوانین کی مصالحت اور لڑائیوں کی کشاکش میں گزرا۔ ان حالات میں انھیں خط وکتابت کے لیے بہت کم وقت مل سکتا تھا۔ تاہم ان کے مکاتیب کا جو مجموعہ ہمارے سامنے ہے اسے دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے کہ وہ کیوں کر یہ سب کچھ لکھواتے اور جا بجا بھجواتے رہے۔ جن مسلمان سلاطین، امرا، رؤسا، خوانین، علما اور اکابر تک ان کی آواز بذریعۂ تحریر پہنچ سکتی تھی، انھوں نے پہنچانے میں توقف نہ کیا۔ ان کے مکاتیب واعلانات کا خاصا بڑا ذخیرہ موجود ہے اور معلوم ہے کہ بہت سے مکاتیب ضائع ہو گئے۔ اگر وہ بھی موجود ہوتے تو ذخیرہ کم از کم دوگنا ہوتا اور یہ صرف چار پانچ سال کا مجموعہ ہوتا جن کا ایک ایک لمحہ نہایت اہم مشاغل میں بسر ہوا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے تحریری دعوت کا فرض بھی کس اعلیٰ پیمانے پر انجام دیا۔ لطف یہ کہ ان کے اکثر مکاتیب آیات واحادیث سے مزین ہیں اور جو کچھ ان کی جانب سے لکھا گیا، وہ دینی تعلیمات کا خلاصہ اور نچوڑ ہے۔

مرموز خط وکتابت آج کل ڈپلومیٹک مقاصد کے لیے تمام حکومتوں نے خاص کوڈ (مرموز الفاظ) بنا رکھے ہیں۔ سید صاحب نے آج سے سوا سو سال پیشتر سری خط وکتابت کے لیے کوڈ بھی تیار کرا لیا تھا۔ اور اس خط وکتابت کو خاص آدمیوں کے سوا کوئی نہ سمجھ سکتا تھا۔ یہ اس حقیقت کی شہادت ہے کہ ان کی تحریک کس طرح ہر پہلو سے مکمل اور منظم تھی اور فکر وعمل کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ان کی دقیقہ رس نگاہوں سے اوجھل رہا۔

ایک مثال

رموزِ خطوط و کتابت کی ایک مثال یہاں پیش کی جاتی ہے: ہنڈ کا رئیس خادے خان قتل ہو چکا تھا۔ اس کے اہل و عیال کو شاہ اسمٰعیل رہا کر دینا خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔ زیدہ کا رئیس مقرب خان، جو خادے خان کا قریبی رشتہ دار تھا نیز خادے خان کے بھائی سید صاحب سے ملتمس رہتے تھے کہ مقتول کے اہل و عیال کو چھوڑ دیا جائے۔ سید صاحب ہنڈ سے دور بیٹھے تھے اور جو حالات شاہ صاحب کے سامنے تھے، وہ سید صاحب کے سامنے نہ تھے لہٰذا انھیں خادے خان کے اہل و عیال کو چھوڑ دینے میں کوئی حرج نظر نہ آتی تھی اور انھوں نے شاہ صاحب کو لکھ بھیجا کہ انھیں چھوڑ دیا جائے۔ آخر شاہ صاحب نے ایک رموز خط سید صاحب کو لکھا جس میں تمام متعلقہ حقیقتیں کھول کر بیان کر دیں۔ اس میں یہ بھی عرض کر دیا کہ ان حالات میں اہل و عیال کی رہائی خلافِ مصلحت ہے اور یہ خط بے تکلف مقرب خان کے حوالے کر دیا۔ اس نے اپنے منشی سے پڑھوایا تو کچھ سمجھ میں نہ آیا اور سمجھ لیا کہ یہ خود اس کی شکایتوں پر مشتمل ہے، چنانچہ اس نے یہ خط سید صاحب کے پاس نہ پہنچایا، نہ سرداری پر قائم رہا بلکہ اس علاقے سے پہاڑوں میں چلا گیا۔

شاہ اسحٰق اور شاہ یعقوب کے نام خطوط

سید صاحب نے فراہمیِ زر کے جو مرکز بنا رکھے تھے ان میں سب سے بڑا مرکز دہلی میں تھا، جس کے انتظام کے ذمہ دار شاہ محمد اسحٰق اور شاہ یعقوب تھے۔ یہ عموماً ہنڈیوں کے ذریعے سے روپیہ سید صاحب کے پاس بھیجتے تھے۔ بعض اوقات خاص قاصد سرحد سے دہلی آکر روپیہ لے جاتے تھے۔ ان سے زیادہ تر خط و کتابت روپیہ کے متعلق ہوتی تھی۔ طبعاً اندیشہ تھا کہ ممکن ہے یہ خطوط اجنبیوں کے ہاتھ لگ جائیں، اس لیے سید صاحب نے ان کے متعلق خاص احتیاطی تدبیریں اختیار کیں۔ مثلاً:

۱۔ یہ خطوط عموماً عربی میں لکھے جاتے تھے۔ میرے علم میں جتنے خط آئے ان میں سے صرف دو فارسی میں تھے۔

۲۔ ایک یا دو خطوں کے سوا کسی میں سید صاحب نے اپنا نام صراحتاً لکھا اور نہ مکتوب الیہما

کے ناموں کی صراحت کی ۔

۳ - روپے کی رسید عموماً ایسے انداز میں بھیجی جاتی تھی کہ مکتوب الیہا کے سوا کوئی اسے سمجھ نہ سکتا تھا

۴ - ایک خط کے آخر میں ایسے مرموز الفاظ درج ہیں، جن کا مطلب کوشش کے باوجود سمجھ میں نہ آیا۔

اب ان کی مثالیں ملاحظہ فرمائیے :

کاتب اور مکتوب الیہا کے اسماء

سید صاحب اپنے متعلق مختلف خطوں کے آغاز میں لکھتے ہیں :

۱ - من عبداللہ المنتہض لاعلاء کلمۃ اللہ

۲ - 〃 〃 〃 〃 الناصح لکافۃ المسلمین

۳ - 〃 〃 〃 لنصرۃ الدین الملقب بامیر المومنین

مکتوب الیہا کا ذکر ملاحظہ فرمائیے :

۱ - الاخوان بکلمۃ اللہ الناصحان لدین اللہ اما اکبرہما فلا شک انہ انقی الاعراق، صفی الاخلاق، وصی الآفاق و اما اصغرہما فلا ریب فی انہ ذوالخلق المرغوب، طاہر اذناس العیوب

۲ - شیخین جلیلین، للدرایۃ غلیین و للروایۃ ازکیین و للسماحۃ یدیین و للشہادۃ عشقین للعبادۃ قدیین و للهدایۃ علمیین۔ اما اکبرہما فلا ریب فی انہ شجرۃ ناضرۃ الاصول والاعراق ناضرۃ الغصون والاوراق و اما اصغرہما فلا شک فی انہ ثمرۃ طعمہا مرغوب وریحہا محبوبۃ

۳ - الی کریم الاخلاق، طیب الاعراق، فارج الاغلاق والی اخیہ المحبوب ذی الخلق المرغوب

ظاہر ہے کہ دونوں بھائیوں کے لیے جو الفاظ لائے ہیں وہ اخلاق اور خصوصیات کے ہم قافیہ بھی ہیں۔ اس کی اور مثالیں بھی ملتی ہیں ۔

قاصدوں کی کیفیت

کہیں قاصدوں کے نام صراحتاً درج کر دیے ہیں۔ اکثر ان کے متعلق بھی رمز و کنایہ کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ مثلاً دو قاصدوں کے متعلق لکھتے ہیں:

۱ - احدہما صغیر اسناً و کبیر جسماً و ثانیہما فی القامۃ قصیر المسمی بہ حزب اللہ القدیر ۔

۴ - ایک خط میں لکھتے ہیں کہ جو قاصد بھیجے جا رہے ہیں۔ وہ تمام مجاہدوں کے نزدیک معتبر ہیں

احدھما لیسمیٰ بما ہو ضد الادبار والثانی شیخ منسوب الیٰ سید الابرار ۔

ان کے سوا مختلف مکاتیب میں مندرجہ ذیل قاصدوں کا ذکر آیا ہے : احمد علی، اخلاص نشان

چنانچاں حاجی بہادر شاہ خاں، ابراہیم جو غزنی سے ہجرت کر کے لشکر اسلام میں پہنچا تھا، جہان خاں،

چھتا، پیر محمد ۔

رقموں کی رسید

رقموں کی رسید کے متعلق بھی عموماً مرموز پیرایہ اختیار کرتے ہیں۔ مثلاً :

۱ - چودہ سو کی رسید دینی تھی تو لکھا کہ رقم پہنچی جو اصحاب بیعت الرضوان

کی تعداد کے مطابق تھی ۔

۲ - سات سو روپے کی رسید کے متعلق لکھتے ہیں۔ مرتبۂ ثالثہ میں اقلیموں کی تعداد کے مطابق ۔

۳ - چار سو کی رسید کے متعلق فرماتے ہیں : مرتبۂ ثالثہ میں خلفائے راشدین کی تعداد کے مطابق ۔

۴ - چھ سو کے متعلق ارشاد ہوتا ہے : مرتبۂ ثالثہ میں تعداد جہات کے مطابق ۔

۵ - آٹھ سو کے متعلق لکھتے ہیں : مرتبۂ ثالثہ میں ابواب جنان کی تعداد کے مطابق ۔

۶ - دو ہزار پانچ سو کی رسیدیں دیتے ہیں : اثنین من المرتبۃ الرابعۃ وخمس من الثالثۃ

کہیں سات سو کے لیے کواکب سیارہ کی تعبیر اختیار کی گئی اور کہیں ایام ہفتہ کی ۔

مرموز الفاظ

ایک خط کے آخر میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے :

والسلام علیکم و علی من لدیکم۔ ابتث، خجیذ، ذرذس، ششضضظ،

ضضغو، قکلم، نزہن ۔

کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے اور کسی ایسے بزرگ سے ملاقات کا شرف بھی حاصل

نہ ہوا جو ان مرموزات کی کلید سے آگاہ ہوتے ۔

رقوم کے متعلق ہدایات

عام طور پر ہنڈیاں قریۂ منارہ کے دو ہندو ساہوکاروں موتی اور سنتو کے نام آتی تھیں، جو ایک سو میں سے بارہ روپے ہنڈی کاٹتے

تھے یعنی ایک سو کے چھیاسی روپے دیتے تھے۔ سید صاحب نے متعدد خطوں میں تاکید فرمائی کہ ہنڈیاں چھوٹی رقموں کی بھیجی جائیں۔ غالباً اس لیے کہ بڑی رقموں کی ہنڈیوں کا روپیہ حاصل کرنے میں دیر لگتی ہوگی۔ مختلف خطوط میں تاکید کی گئی ہے کہ کچھ رقم الگ کر لی جائے اور وہ ان مجاہدین کے پس ماندوں کو دے دی جائے جن کے گزارے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ بعض اوقات اپنے دولت مند دوستوں کو لکھ بھیجتے تھے کہ اتنی رقم فلاں فلاں مجاہدین کے متعلقین کو پہنچا دی جائے۔ عموماً یہ رقمیں بیس پچیس یا پچاس سے متجاوز نہ ہوتی تھیں۔ حاجی زین العابدین کو ایک مرتبہ ایک سو روپے دے دینے کی ہدایت کی گئی تاکہ وہ مختلف اصحاب میں بانٹ دیں۔ شاہ اسمٰعیل کی ہمشیرہ اور ان کے صاحبزادے کو ایک ایک سو روپیہ دیا گیا۔

مجاہدین کا عمل

مجاہدین بھی تمام مواقع پر انتہائی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ مثلاً ایک مرتبہ سب سے سید صاحب کے پاس پیغام بھیجنا منظور تھا۔ اندیشہ تھا کہ یہ پیغام کسی کے ہاتھ نہ لگ جائے۔ چنانچہ ایک معتمد علیہ [illegible] تلاش کیا اور جو پیغام بھیجنا تھا، لکھ کر اس کے جوتے کے تلے میں سلوا دیا۔

جب اہلِ سمہ کی غداری کے باعث بہت سے مجاہدین قتل ہو چکے تھے تو مولوی خیر الدین شیرکوٹی وند خوڑ میں مقیم تھے۔ انھیں حفاظت کی غرض سے اپنا مقام چھوڑنا پڑا۔ پنجتار نہ پہنچ سکتے تھے، اس لیے کہ راستہ سخت خطرناک تھا، لہٰذا پڑان غار کا قصد کیا جو اوند خوڑ کے شمال مغرب میں ایک محفوظ مقام تھا۔ سید صاحب کے پاس یہ خبر پہنچانے کی کوئی صورت نہ بنی۔ راستے میں مولوی صاحب کو ایک شخص مل گیا، اس کی کتاب کے حاشیے میں ایک جگہ یہ عبارت لکھ دی:

"تا اینجا از فضل و کرم خدا آمدہ ایم و در پڑان غاری بودیم، آں جناب دعا فرمانید کہ باز زیر قدم آں جناب حاضر شویم۔"

خدا کے فضل و کرم سے ہم اس مقام تک آ گئے اور پڑان غار جا رہے ہیں۔ دعا فرمائیں کہ پھر آپ کے قدموں میں پہنچنا نصیب ہو۔

آٹھواں باب

دعوت و تبلیغ

تحریک کی بنیاد: سید صاحب کی تحریک خالص دینی اصول پر قائم ہوئی تھی اور اس کی ترقی و توسیع کا انحصار دعوت و تبلیغ پر تھا۔ سید صاحب نے ابتدا ہی سے اس کے لیے بھی خاص انتظامات فرما دیے تھے۔ پہلے وہ خود اپنے خاص رفیقوں کو لے کر دورے کرتے رہے۔ پھر مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل دعوت و تبلیغ ہی کے لیے وقف ہو گئے۔ سرسید احمد خاں شاہ اسمٰعیل کے حالات میں لکھتے ہیں:

> بموجب ارشاد سید اصفیا یعنی پیر طریق ہدیٰ (سید صاحب) کے اس طرح سے تقریر وعظ کی بنا ڈالی کہ مسائل جہاد فی سبیل اللہ بیشتر بیان ہوتے اور یہاں تک آپ کے سیقل تقریر سے مسلمانوں کا آئینہ باطن مصفا اور مجلا ہو گیا اور اس طرح سے راہ حق میں سرگرم ہوئے کہ بے اختیار دل چاہنے لگا کہ سر ان کا راہ خدا میں فدا ہو اور جان ان کی اعلائے لوائے محمدی میں صرف ہو[1]۔

مولانا عبدالحی کے متعلق سرسید فرماتے ہیں کہ انھوں نے بھی وعظ کہنا شروع کر دیا تھا:

> لوگوں کو نہایت ہدایت حاصل ہوئی اور بہ اتفاق مولوی محمد اسمٰعیل صاحب کے ... ترغیب جہاد فی سبیل اللہ میں سرگرم رہے[2]۔

۱؎ یہ حالات آثار الصنادید کی طبع اول میں شائع ہوئے تھے۔ انجمن ترقی اردو نے انھیں اپنے سہ ماہی رسالہ "تاریخ و سیاسیات" میں بالاحتیاط چھاپ دیا۔ اقتباس کے لیے ملاحظہ ہو "تاریخ و سیاسیات" بابت نومبر ۱۹۵۱ء ص ۸۔ ۲؎ ایضاً ایضاً ص ۶۹۔

مولوی سید محمد علی رامپوری | مولوی سید محمد علی رامپوری کے متعلق "وقائع" کا بیان ہے کہ انھیں سید صاحب نے حیدرآباد دکن جانے کا حکم دیا:

انھوں نے عذر کیا کہ مجھ کو نہ اس قدر علم ہے کہ کسی عالم سے مباحثہ یا مناظرہ کر سکوں اور نہ یہ سلیقہ ہے کہ لوگوں کے روبرو وعظ و درس کہوں۔

سید صاحب نے فرمایا کہ جس بات کا آپ عذر کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ عذر دور کر دے۔ پھر آپ نے اپنی ٹوپی، کرتہ اور پاجامہ انھیں پہنایا اور پانچ آدمی ان کے ہمراہ کیے جن میں سے تین کے نام یہ ہیں: نعیم خاں رامپوری، عنایت اللہ خاں اور عبید اللہ۔ اور حکم دیا کہ پیر کوٹ میں پیر جی صاحب سے ملتے ہوئے کراچی سے کشتی پر سوار ہوں اور بمبئی میں اتر کر حیدرآباد جائیں۔[1]

مولوی صاحب موصوف کچھ مدت حیدرآباد میں رہے۔ پھر مولوی ولایت علی عظیم آبادی حیدرآباد میں مقرر ہو گئے اور مولوی سید محمد علی کو مدراس جانے کا حکم مل گیا۔ وہ محرم ۱۲۴۸ھ (جون ۱۸۳۲ء) میں مدراس پہنچے اور چند ہی مہینوں میں مسلمانانِ مدراس میں زبردست دینی انقلاب پیدا کر دیا، جس کی پوری کیفیت "تنبیہ الضالین" سے معلوم ہو سکتی ہے۔[2]

مولوی ولایت علی عظیم آبادی | مولوی ولایت علی عظیم آبادی کے متعلق راویوں کا بیان ہے کہ سید صاحب کے تعلق میں ان کی حیثیت وہی تھی، جیسے مردہ غسال کے ہاتھ میں ہو:

کوئی کار ہو، خواہ حضرت ان کو فرماتے، حیلہ و عذر و انکار جانتے ہی نہ تھے۔ نہ اپنی رائے کو کسی امر میں دخل دیتے، بلکہ اکثر اوقات فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے امر دین میں سید صاحب کو بہت حاذق کیا ہے۔ ہمارے نفع و ضرر کو وہی خوب سمجھتے ہیں۔ جس کو جو مناسب جانتے ہیں، وہ کام فرماتے ہیں۔

مولوی سید محمد علی کی طرح انھیں بھی اپنی ٹوپی، کرتا، پاجامہ پہنا کر سینے اور پشت پر ہاتھ پھیرا اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تمھاری مدد کرے۔ وصیت فرمائی کہ کلمۂ حق کے بیان میں کسی کا خوف اور ملاحظۂ خاطر نہ کریں

[1] وقائع صفحہ ۔ [2] تنبیہ الضالین عن طریق سید المرسلین، قلمی نسخہ۔

نیز انہوں نے سید کرامت اللہ، مولوی عبدالقادر اور مولوی عبدالماجد کو ان کے ہمراہ کر دیا۔ یہ تینوں مولوی صاحب کے ہم وطن تھے[1]۔

ان کے کام کی مفصل کیفیت بھی الگ بیان ہوگی۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ دعوت و تبلیغ سے انھوں نے ہزاروں مسلمانوں کو راہِ حق پر لگا دیا اور بہت سے آدمی ان کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے جن میں سکندر جاہ والیِ مملکت آصفیہ کے فرزند مبارز الدولہ نیز گوہر علی خاں بھی شامل تھے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد مولوی صاحب دورہ کرتے ہوئے عظیم آباد پہنچے۔ ان کا طریقہ یہ تھا کہ قریہ بہ قریہ وعظ فرماتے۔

مولوی عنایت علی عظیم آبادی

وقائع کا بیان ہے کہ سید صاحب نے مولوی صاحب ممدوح کو بلا کر فرمایا:

آپ کو واسطے ترغیب جہاد کے بنگال بھیجتے ہیں۔ انھوں نے عرض کیا کہ حاضر ہوں مگر دل چاہتا ہے کہ یہاں کا بھی کوئی واقعہ دیکھ لیتا۔ آپ نے فرمایا کہ وہاں آپ کے ہاتھوں سے اللہ تعالیٰ کا کام بہت نکلے گا اور آپ کا وہاں رہنا واسطے کوشش کار خدا کے گویا ہمارے ساتھ یہاں رہنا ہے[2]۔

انھیں بھی عمامہ اور کرتا عنایت فرمایا اور انھیں کے رفیقوں میں سے چھ آدمی ہمراہ کر دیے۔ مولوی صاحب موصوف نے بنگال میں جو کارنامے انجام دیے، وہ تفصیل سے ان کے حالات میں بیان ہوں گے۔ یہاں اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ مشرقی بنگال میں آج جو دینی روح نظر آ رہی ہے وہ مولوی صاحب موصوف ہی کی سرگرم کوششوں کا نتیجہ ہے۔

باقی اصحاب

باقی اصحاب میں سے مولوی محمد قاسم پانی پتی کو وعظ و نصیحت اور دعوت و جہاد کے لیے بمبئی روانہ کیا[3]۔ حافظ قطب الدین کو ہندوستان بھیجا۔ سید اولاد حسن قنوجی کو بھی ارشاد و ہدایت ہی کی غرض سے واپس بھیج دیا تھا۔ چنانچہ ان کی زندگی کے تمام باقی اوقات اسی کام میں صرف

---

[1] وقائع صفحہ [illegible]۔ [2] وقائع صفحہ [illegible]۔ [3] وقائع صفحہ [illegible]۔ [4] ایضاً صفحہ [illegible]۔

ہوئے۔ اپنے بھانجے سید حمید الدین اور ان کے بھتیجے سید ابوالقاسم (بن سید احمد علی خواہر زادہ سید صاحب) کو بھی دعوت و ارشاد ہی کے لیے میدان جنگ سے واپس کیا گیا تھا۔

نتائج دعوت و تبلیغ کے انتظامات کا یہ سرسری مرقع ہے، جس کے حالات میں نے سیرت کے مختلف مآخذ سے اخذ کیے۔ سید صاحب نے ہندوستان کے طول و عرض میں احیاءِ دین و اسلامیت کا جو عظیم الشان کارنامہ تھوڑی سی مدت میں انجام دیا تھا، وہ دعوت و تبلیغ ہی کی برکات کا ایک کرشمہ تھا۔ لہٰذا یقین ہے کہ یہ نظام بہت منظم اور وسیع ہوگا۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد بھی مدت دراز تک لوگ جہاد کی نیت سے سرحد پہنچتے رہے۔ کم از کم ۱۸۶۳ء تک اس سلسلے میں کوئی فرق نہ آیا اور یہ اس نظام کی پختگی کا طبعی نتیجہ تھا جو سید صاحب نے اپنی زندگی میں قائم کر دیا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں جماعت کے اکابر گرفتار کر لیے گئے اور ان پر مقدمے چلے۔ پھر مقدموں کا قصہ کئی سال جاری رہا۔ اس کے بعد تحریک کی پہلی سرگرمی تو باقی نہ رہی تاہم مجاہدین اکا دکا برابر سرحد پہنچتے رہے اور یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا، جب انگریز ہندوستان سے رخصت ہو گئے۔

نواں باب

مالی انتظامات

ابتدائی دور | سید صاحب نے راہِ ہجرت میں قدم رکھنے کے وقت ٹونک سے جمع شدہ رقم نکلوائی تو دس ہزار روپے نکلے۔ آپ نے پانچ ہزار ازواج کے حوالے کر دیے جو آپ کے بعد ہجرت کرنے والی تھیں، صرف پانچ ہزار اپنے لیے رکھے۔ یہ روپے چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں ڈال کر انھیں مختلف مجاہدین کی کمروں میں باندھ دیا۔ گویا ہندوستان کی تطہیر کے لیے اٹھے تھے تو صرف پانچ ہزار روپے اور تقریباً ساڑھے پانچ سو مجاہد ہمراہ تھے۔ یہ سروسامان ایسا نہ تھا کہ کسی بھی شخص کے نزدیک قابلِ توجہ قرار پاتا لیکن بے سروسامانی کی فراوانی آپ کی عزیمت کی عناں گیر کبھی نہ ہوئی۔ وہ ہمیشہ فرض کی پکار پر سر بہ کف میدانِ عمل میں پہنچتے رہے۔ پھر جو کچھ انھیں پیش آیا ہمیشہ شکر و صبر سے قبول کیا۔

ازواج کو پانچ ہزار اس غرض سے دیے تھے کہ انھیں نہایت کٹھن سفر درپیش تھا اور کچھ معلوم نہ تھا کہ منزلِ مقصود کون سی ہے اور اس پر پہنچنے میں کتنا وقت لگے گا۔ یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ عالمِ غربت میں زندگی کے دن کیونکر بسر ہوں گے۔ اغلب ہے سید صاحب کے نیازمندوں نے بیبیوں کی خدمت میں بھی کچھ رقمیں بطور نذر پیش کی ہوں۔ تاہم اس مقدس خاندان کی شانِ ایثار و قربانی کے سلسلے میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ جب بیبیوں کو سندھ پہنچ کر سپہ سالار کی عسرت کا علم ہوا تو انھوں نے دس ہزار روپے کی رقم ہنڈیوں کی شکل میں حاجی بہادر شاہ خاں کے ہاتھ سید صاحب کے پاس بھیج دی:

ایں سلسلہ از طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

متفرق تحائف | سید صاحب کے نیازمند قدمِ ہجرت کے ساتھ ہی مختلف قسم کے تحائف

پیش کرنے لگے۔ مثلاً گھوڑے، تلواریں، بندوقیں، کپڑے، خیمے، برتن، قلمی قرآن مجید اور نقد
روپے۔ یقین ہے کہ گوالیار، ٹونک کے والیوں اور اکابر نے بھی خاصی بڑی رقمیں پیش کی ہوں گی،
لیکن راستہ بہت کٹھن اور طویل تھا، پانچ چھ سو آدمی ساتھ تھے، لہٰذا خرچ بھی خاصا ہوتا ہوگا۔ ایک
ہزار روپے، ایک بندوق اور طمنچوں کی ایک جوڑی امیر ابن سندھ نے پیش کی۔ اس کے بعد دورانِ سفر میں
صرف امرائے کابل سے کچھ رقمیں ملی ہوں گی۔ بس یہی سرو سامان تھا جس کی بنا پر سید صاحب نے
۲۰-دسمبر ۱۸۲۶ء کو جہاد کا آغاز کیا۔

سرحد کے حالات سرحد میں پہنچنے کے بعد وقتاً فوقتاً دقتیں تو ہوتی رہیں لیکن بظاہر
نقد روپیہ کہیں سے نہ ملا۔ جنگ شیدو سے پیشتر اور بعد مجاہدین پر بڑی ہی عسرت کا زمانہ گزرا، یہاں تک
کہ ایک موقع پر زیادہ سے زیادہ مٹھی بھر جوار روزانہ ہر مجاہد کو ملتی تھی اور بعض اوقات وہ درختوں کے پتے
ابال کر کھاتے رہے۔

جب ہندوستان سے مجاہدین کے قافلے پہنچنے لگے تو کچھ روپے اور سامان سید صاحب کے پاس
جمع ہوا۔ اس دور میں ایک مصیبت یہ تھی کہ سید صاحب جو انتظام فرما کر سرحد گئے تھے، اس کے مطابق
ہنڈیاں پشاور کے ساہوکاروں کے نام پہنچنے لگیں۔ پشاور کے سرداروں نے ان ہنڈیوں کا روپیہ رکوا دیا۔
آخر بڑی پریشانیاں اٹھانے کے بعد ستارہ کے ساہوکاروں سے ربط پیدا کیا گیا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔
وہاں کے دو ساہوکاروں کے نام روایتوں میں آئے ہیں: ایک موتی، دوسرا سنتو۔ یہ سو روپے کی ہنڈی
پر بارہ روپے ہنڈوی لیتے تھے۔ یعنی سید صاحب کو سو روپے کے صرف اٹھاسی روپے ملتے تھے۔ ان مشکلات
کو صبر سے برداشت کر لینے کے سوا چارہ نہ تھا۔

قیامِ خہر کے زمانے میں ایک مرتبہ تنگی اس حد تک پہنچ گئی کہ مجاہدین نے سید صاحب کی اجازت سے
اجرت پر گنے چھیلنے کا کام شروع کر دیا۔ اجرت کے علاوہ ہر شخص کو آٹھ آٹھ دس دس گنے بھی مل جاتے تھے۔

دو نئی کشائش جب ستارہ میں ہنڈیوں کا انتظام ہو گیا تو روپیہ پہنچنے لگا۔ چنانچہ سید صاحب نے
اماں زئی پر پیش قدمی کی تھی تو ان کے پاس تیس پینتیس ہزار روپے نقد جمع تھے۔ ان میں سے پانچ ہزار

کی رقم ساتھ لے لی گئی۔ باقی روپیہ ٹونک میں محفوظ مقام پر دفن کردیا گیا۔ اتمان زئی سے واپسی پر یہ روپیہ نکالا گیا۔

تھر سے مراجعت پر نظام شرعی کے اجراء کے لیے دو مرتبہ پنجتار میں علمائے افغان کا اجتماع ہوا اور دونوں مرتبہ کم وبیش ڈھائی ہزار آدمیوں کے لیے کھانے کا انتظام کرنا پڑا۔ یہ خرچ سید صاحب کے بیت المال ہی سے ہوا۔

کشائش کا مستقل انتظام اس وقت سے ہوا جب قاضی سید محمد حبان نے عشر کا انتظام کردیا۔ لیکن یہ سلسلہ صرف چند مہینے قائم رہا۔ پھر مجاہدین کے خلاف سازش قتل کے بعد سید صاحب پشاور کے میدانی علاقے سے کشمیر کی جانب چلے گئے اور راستے میں بالاکوٹ کی جنگ پیش آئی۔

خطوط کی شہادت مختلف خطوں میں متفرق ہنڈیوں کی رسیدیں درج ہیں۔ مثلاً:

صفحہ	ہنڈی
۱۹۶ کا مکتوب	دو ہزار پانچ سو
۱۹۷ ,,	دو ہزار چار سو
۲۱۲ ,,	سات سو
۲۳۳ ,,	ساڑھے چار ہزار
۲۳۶	چار ہزار ایک سو پچاس
۲۳۸ ,,	سات ہزار نو سو پچاس[1]

یہ تعداد صرف چند مکاتیب سے ماخوذ ہیں۔ یقین ہے کہ ایسے اور مکاتیب بھی ہوں گے جو میرے علم میں نہ آسکے یا ضائع ہوگئے لیکن ظاہر ہے یہ رقمیں ایسی نہیں جنھیں سکھوں اور انگریزوں جیسی جنگی قوتوں کے خلاف جہاد کے سلسلے میں قابل ذکر سمجھا جاسکے۔ با ایں ہمہ سید صاحب نے انھیں وسائل کی بنا پر وہ کارنامے انجام دیے جو ہمیشہ جریدۂ عالم کے صفحات کی زینت بنے رہیں گے۔

[1] صفحات کے حوالے اس مجموعۂ مکاتیب کے ہیں جسے میں مکاتیب شاہ اسمٰعیل کے نام سے تعبیر کرتا ہوں۔

میاں دین محمدؒ کا بیان | میاں دین محمد سید صاحب کے خاص خادم اور معتمد علیہ قاصد تھے اور وقتاً فوقتاً اس غرض سے ہندوستان آتے رہتے تھے کہ سید صاحب کے نیازمندوں اور مقرر کیے ہوئے مرکزوں سے روپیہ جمع کر کے سرحد لے جائیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ واقعۂ بالاکوٹ کے وقت میں شاہ اسحٰق کے پاس دہلی میں تھا اور اس وقت میرے پاس چھبیس ہزار روپے تھے۔ ان میں سے ڈھائی ہزار ہنڈی کی شکل میں سید صاحب کے اہل و عیال کے لیے سندھ بھیج دیے[1]۔

حیات النسا بیگم کا واقعہ | حیات النسا بیگم بنارس کی ایک مسلمان خاتون تھی جس نے مسٹر بروک نامی ایک انگریز سے شادی کر لی تھی۔ پھر وہ انگریز سے علیحدہ ہو کر سید صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہو گئی۔ اس نے ہزاروں روپے نقد، ہزاروں کا مال اور مکان سید صاحب کی خدمت میں پیش کر دیا۔ آپ نے یہ نذر قبول نہ کی اور فرمایا کہ مال خبیث ہے۔ پھر حکیم سلامت علی خاں، مولوی غلام یحییٰ، میرزا کریم اللہ بیگ اور مولوی عبدالقادر نے مل کر دس ہزار روپے جمع کیے اور دو سو روپے ماہانہ کرائے پر ایک مکان لے کر حیات النسا بیگم کی طرف سے تجارت شروع کر دی۔ اس میں بہت نفع ہوا۔ نفع میں سے پانچ ہزار کی رقم میاں دین محمد کی خدمت میں پیش کی گئی۔ انھوں نے بھی قبول نہ کی اور کہا کہ بے اجازت نہیں لے سکتا۔

شاہ اسحٰق اور شاہ یعقوب کے تو سوم ایک مکتوب میں بھی حیات النسا بیگم کا ذکر ہے[2]۔ میاں دین محمد نے سفر سے واپس جا کر سید صاحب سے اس امر کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ اچھا کیا، لیکن یہ روپیہ لے لینے میں کچھ حرج نہ تھا۔

پانچ ہزار کی تقسیم | میاں دین محمد پھر ہندوستان آئے تو پانچ ہزار روپے لے گئے۔ ان میں سے ڈھائی ہزار سید صاحب کے حکم کے مطابق مختلف اصحاب میں تقسیم کر دیے۔ کچھ مدت بعد حیات النسا کا انتقال ہو گیا، ساتھ ہی تجارت کا کاروبار بگڑ گیا۔ میاں دین محمد نے باقی رقم بھی مختلف مجاہدوں کے اہل و عیال اور متعلقین میں بانٹ دی۔ بیت المال میں سے ان مجاہدین کی بھی امداد کی جاتی تھی جن کے پاس

---

[1] "وقائع" صفحہ ۵۹۹۔ [2] "مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل" قلمی نسخہ صفحہ ۱۲۷۔

سرحد تک سفر کے لیے کوئی سرمایہ نہ ہوتا تھا اور بضرورت متعدد مجاہدین کے اہل وعیال کی امداد کے حالات
پیش کیے ہی جا چکے ہیں۔ یہاں یہ حقیقت بھی واضح کر دینی چاہیے کہ ان مجاہدین نے خود کبھی کوئی رقم نہ مانگی
سید صاحب اپنی معلومات کی بنا پر جو کچھ کسی کو دینا مناسب سمجھتے تھے، دے دیتے تھے۔

ضروری گزارش | فراہمی زر و مال کی اس سرگزشت سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب نے
کتنی تھوڑی رقم سے تمام تنظیمات کیں۔ یہ روپے زیادہ تر عام مسلمانوں سے ملتے تھے۔ عوام کا طریقہ یہ تھا کہ
ہر گھر میں ایک گھڑا رکھا رہتا، کھانا پکانے کے وقت مٹھی بھر چاول یا کوئی دوسری جنس اس میں ڈال دی جاتی۔
ہفتے کے بعد یہ جنس جمع کر کے فروخت کر دی جاتی۔ تجارت کے جو وسائل آج کل موجود ہیں، یہ اس زمانے
میں موجود نہ تھے۔ لیکن دیکھیے کس طرح مالی انتظامات اس درجۂ کمال پر پہنچا دیے تھے کہ ایک حبہ بھی کہیں
ضائع نہ ہوتا تھا۔ ہمارے زمانے کے جماعتی نظاموں میں عوام کا جمع کیا ہوا روپیہ کم ہی محفوظ رہا یا صحیح
مقاصد پر صرف ہوا۔ لیکن سید صاحب کے نظام میں چھوٹی چھوٹی رقمیں مختلف دیہات و قریات سے
بالکل محفوظ بڑے مرکزوں میں پہنچتی تھیں۔ وہاں سے منزل بہ منزل سرحد پہنچائی جاتی تھیں۔ یہ نظام سنہ ۱۸۹۰ء
تک اعلیٰ پیمانے پر جاری رہا اور ہمارے زمانے میں بھی اس دینی نظام کا مالی حصہ ہر خلل سے پاک [illegible]
سال کی مدت میں معمولی سی خیانت کی بھی کوئی شکایت پیش نہ ہوئی۔ ایک مقام سے دوسرے مقام پر رقمیں
پہنچانے والے لوگ سارا کام فی سبیل اللہ انجام دیتے تھے اور پائی تک اجرت نہ لیتے تھے۔ خالص دینی نظام
ہی اس امتحان میں پورا اتر سکتا تھا اور سید صاحب نے اس نظام کی دینی بنیادیں ہر لحاظ سے پختہ و استوار
کر دی تھیں۔

دسواں باب

جماعت کی اسلامی اور اخلاقی شان

(۱)

کھوں کیا لوا سے امامت کا درج !

کہیں غوث و ابدال سب اہل فرج !

اسلامیت کا لُبِّ لباب جماعت کی اسلامی اور اخلاقی شان اسی سے ظاہر ہے کہ جب اہل ستم نے خفیہ سازش کر کے بہت سے مجاہدین کو جا بجا شہید کر دیا تو سید صاحب نے فرمایا تھا کہ ان شہدا میں سے ہر ایک اپنے وطن کی انسانیت کا "خلاصہ" اور اسلامیت کا "لُبِّ لباب" تھا۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان کے آسمان نے ایسا کوئی لشکر نہ دیکھا جو علم و فضل، زہد و تقویٰ، حُبّ و حمیتِ اسلام، شجاعت و جواں مردی، ایثار و فداکاری اور بے غرضی و بے نفسی میں سید صاحب کے لشکر کا نمونہ ہوتا۔ اس لشکر میں قرآن کے حافظ، مفسر، محدث، فقیہہ، صوفیہ کرام غرض ہر مذاق و مشرب کے اصحاب شریک تھے، جنھیں اپنے حلقوں میں عزت کے بلند مراتب حاصل تھے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنھوں نے بچپن ہی سے امارت و ریاست کی آغوش میں تربیت پائی۔ لہٰذا جسمانی تکلیف کا تصور بھی دماغ میں قائم نہ کر سکتے تھے، لیکن سید صاحب کی دعوت و تربیت نے ان میں ایسا جذبۂ صادقہ راسخہ پیدا کر دیا کہ وطن، اہل و عیال، اعزہ و اقارب اور وسائل راحت و عزت کو ترک کر کے انتہائی تکلیفوں کی زندگی بہ خوشی گوارا کر لی۔ ان کی رگوں میں دوڑنے والے خون کی سب سے بڑی بے قراری یہ تھی کہ وہ حق میں بہ کمال احیاء اسلامیت کا موجب بنے۔ کمال یہ ہے کہ سید صاحب کے ساتھ تعلق پیدا ہونے سے پیشتر بہ تمام اصحاب بالکل ویسی ہی زندگیاں بسر کرتے تھے جو ہندوستان کے مسلمانوں کو عموماً میسر تھیں، لیکن سید صاحب کی دعوت

حق اور ان کی حقانی تربیت نے ان لوگوں کی کایا ہی پلٹ دی اور وہ مردِ خدا کے ایسے مجاہد بن گئے کہ اسلامی ہند کی تاریخ ان کی مثالیں شاید ہی مل سکیں۔ سید صاحب کی تربیت اور مردم گری کے یگانہ کمال کی اس سے بڑی شہادت کیا ہو سکتی ہے

للہیت کی شان سید صاحب خود ایک مقام پر لکھتے ہیں :

ما مردم بنا بر امتثال احکام رب العالمین
و احیاء سنت سید المرسلین ترک اہل و عیال
خود گزیدیم و مہاجرت اخوان و اوطان ورزیدیم
و جمیع ماسوی اللہ را پس پشت انداختیم و اطاعت
و انقیاد احکام رب العباد قبلۂ ہمت ساختیم
و علائقے را کہ با فرزند و عیال و مال و منال
و اوطان و اخوان می باشد از سویداے قلب
بر کندیدیم و انواع رنج و تکالیف بر خود پسندیدیم
و تعطیل و اہمال را ہیچ گونہ در مقدمۂ اقامت
این رکن رکین و نصرت دین سید المرسلین بدل
توقع منفعتے از منافع دنیا روا نہ دیدیم و از
پاسداری محبان قدیمی و اخوان صمیمی درین مادہ
گذشتیم۔ از ملاحظۂ منافع و مضار جان خود
درین باب دست برداریم و از پاسداری غیر
ماسوی اللہ درین راہ بیزاریم[1] *

ہم لوگوں نے رب العالمین کے احکام
کی پیروی اور سید المرسلین کی سنت کے احیاء
کی خاطر اہل و عیال کو چھوڑا۔ بھائی بندوں اور
وطنوں سے ہجرت اختیار کی۔ ہم نے خدا کے
سوا ہر شے کو پس پشت ڈالا اور خدا کے
احکام کی اطاعت و فرماں برداری کو اپنا
نصب العین بنایا۔ انسان کو بال بچوں، اہل و
عیال، مال و منال، وطنوں اور بھائی بندوں
سے جو مضبوط رشتے ہوتے ہیں، وہ سب دل
کی گہرائیوں سے نکال کر باہر پھینک دیے۔
طرح طرح کے رنج اور تکلیفیں اپنے لیے پسند
کیں ہیں۔ رکنِ اعظم کے قیام اور سردار انبیاء
کے دین کی تائید میں کسی قسم کی سستی اور
کوتاہی گوارا نہ کی۔ دنیوی فائدوں میں سے
کسی فائدے کی امید ہم نہیں رکھتے۔ قدیم
دوستوں اور مخلص بھائیوں کی پاس داری
چھوڑ دی۔ اپنی جان کے نفع و نقصان سے بھی

[1] مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل، قلمی نسخہ ص ۱۱ *

دست بردار ہو گئے اور اس راہ میں خدا کے

سوا ہر شے کی پاس داری سے ہم بیزار ہیں ۔

یہ سب کچھ زبان سے کہ لینا چنداں مشکل نہیں لیکن جس بزرگ نے یہ سب کچھ فرمایا، وہ اپنے اصل نصب العین کے لیے ایک ایک دنیوی رشتے کو بے پروائی سے توڑ چکا تھا اور ماسوی اللہ سے کامل بے تعلقی کی کٹھن منزل طے کر کے اس مقام پر پہنچا ہوا تھا، جہاں سے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی یہ کیفیت بیان کی۔

سید المرسلینؐ کا اتباع ایک اور مکتوب میں فرماتے ہیں کہ میرے پاس امراء و سلاطین کی طرح درہم و دینار کے خزانے نہیں۔ میرا خزانہ توکل علی اللہ ہے۔ ہر روز ربانی خزانے سے میرے لیے خرچ پہنچ جاتا ہے:

طریقہ من طریقہ جد خود سید المرسلین است یک روز نان خشک سیر می خورم و شکر خدا بجای آرم و یک روز گرسنہ می مانم و صبر می کنم۔ لشکر من ہمیں چندے از مہاجرین صادقین است کہ بنا بر مجرد خدمت دین رب العالمین کمر بستہ و از طرف خود جان خود را بکشتن داده حق جل و علا ایشاں را بمنصب شہادت سرفراز کند یا بنصرت و فتح موفق گرداند۔ بالجملہ حال ظاہر ما حال فقرا و مہاجرین است کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم و اصحاب ایشاں را در اوائل زمان ہجرت در پیش بود۔[1]

میرا طریقہ وہی ہے جو میرے نانا سردار انبیاءؐ نے اختیار فرمایا۔ ایک روز سوکھی روٹی پیٹ بھر کر کھا لیتا ہوں اور خدا کا شکر بجا لاتا ہوں، ایک روز بھوکا رہتا ہوں اور صبر کرتا ہوں۔ میرا لشکر انھی چند سچے مہاجرین پر مشتمل ہے جنھوں نے محض رب العالمین کے دین کی خدمت کے لیے کمر باندھی اور اپنی طرف سے جانیں راہ خدا میں قربانی کے لیے پیش کر دیں۔ دعا ہے کہ خدا انھیں منصب شہادت سے سرفرازی بخشے یا فتح و نصرت کی توفیق عطا فرمائے۔ غرض ہمارا ظاہری حال ان فقیروں اور مہاجروں کا سا ہے جس سے رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپ کے اصحاب کرامؓ

---

[1] مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیلؒ قلمی نسخہ ص ۲۸۲ ۔

کو ہجرت کے ابتدائی زمانے میں سابقہ پڑا تھا۔

راہِ رضا سید صاحب اور ان کے رفیقوں کے پیشِ نظر اعلاءِ کلمۃ اللہ اور رضائے باری تعالیٰ کے سوا کچھ نہ تھا۔ ان کے نزدیک بیعت کا مقصود ہی یہ تھا کہ خدا کی رضا حاصل ہو۔ فرماتے ہیں:

مشائخ طریقت کے ہاتھ پر بیعت کا	مقصود از بیعت بدست مشائخ طریقت
مقصود صرف یہ ہے کہ خدا کی رضا حاصل ہو	ہمین ست کہ راہِ رضامندیٔ حضرت حق بدست
اور خدا کی رضا روشن شریعت کی پیروی پر	آید و رضامندیٔ حضرت حق منحصر در اتباع
موقوف ہے۔ جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	شریعت غراست ہر کہ سوائے شریعت مصطفویہ
کی شریعت کے سوا رضائے حق حاصل کرنے کا	طریق تحصیل رضامندیٔ حق بگمارد پس
قائل ہے، وہ جھوٹا اور گمراہ ہے۔ اس کا دعویٰ	بے شک آں شخص کاذب و گمراہ است و
باطل ہے اور سنا جانے کے لائق نہیں۔	دعویٰ او باطل و نامسموع و اساس شریعت
رسول اللہ صلعم کی شریعت کی بنیاد دو باتیں ہیں:	مصطفویؐ دو امر است اول ترک اشراک
ایک ترک اشراک، دوسری ترک بدعات۔	ثانی ترک بدعات[1]۔

پھر دونوں کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ترک اشراک یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کو مشکلوں اور بلاؤں کا دور کرنے والا نہ سمجھا جائے۔ نبی، ولی، صالح لوگ اور فرشتے خدا کی بارگاہ کے مقبول ہیں۔ خدا کی رضا حاصل کرنے میں ان کی پیروی کرنی چاہیے۔ اس راہ میں انھیں اپنے پیشوا ماننا چاہیے۔ انھیں زمانی حوادث پر قادر مان لینا یا عالم الغیب جاننا ہرگز مناسب نہیں۔ ترک بدعات یہ ہے کہ تمام عبادات، معاملات نیز معاشی اور معادی امور میں آنحضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے پر مضبوطی اور اولوالعزمی سے جمے رہنا چاہیے۔ دوسرے لوگوں نے جو نئی رسمیں پیدا کر لی ہیں، ان سے دور رہنا چاہیے۔

سید صاحب نے جماعت کی تعمیر و تنظیم انھیں اصول پر کی تھی اور اس حقیقت میں کوئی شبہ

---

[1] مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل، قلمی نسخہ، نمبر ۱

نہیں کہ جماعت ہر منزل اور ہر مرحلے میں انھیں اصول کا عملی مرقع بنی رہی۔

اخلاص فی العمل نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے۔ سید صاحب جماعت مجاہدین کو ہمیشہ تاکید فرماتے رہتے تھے کہ کبھی نفس و شیطان کے تقاضے کی بنا پر میدان کارزار میں قدم نہ رکھنا:

بہ رحمت حضرت جہاں پناہ جل و علا آں سپاہ تقویٰ دستگاہ را اخلاص فی العمل بداں مرتبہ شدہ بود کہ اگر مجاہد تقویٰ یک یک سپاہی از لشکر ظفر انتسابی بہ قلم آید دفترے باید غیر متناہی کہ ترقیم بہ انجام رسد۔[1]

خدا کی رحمت سے اس تقویٰ شعار سپاہ کا اخلاص اس مرتبے پر پہنچا ہوا تھا کہ اگر ایک ایک سپاہی کی للہیت کے محاسن تحریر کیے جائیں تو انھیں پورا کرنے کے لیے لامتناہی دفتر چاہیے۔

جنگ اتمان زئی سے پیشتر تمام مجاہدین کو ہدایت کر دی گئی تھی کہ جو لڑے اور مقابلہ کرے اس سے لڑو، جو امان طلب کرے، اسے امان دے دو۔

سید صاحب کے نزدیک بندگی کا معیار یہی تھا کہ ہر شے خدا کی رضا کے لیے قربان کر دی جائے۔ وہ فرماتے ہیں:

بندہ کہ در مقابلۂ اعدائے مولائے خود غیرت و حمیت نمی دارد فی الحقیقت بندہ نیست و محبے کہ جان و مال و عزت و آبروئے خود را در تحصیل رضائے محبوب خود نگاہ دارد فی الحقیقت محب نیست۔[2]

جس بندے کے دل میں آقا کے دشمنوں کے خلاف غیرت و حمیت کی حرارت پیدا نہ ہو وہ بندہ نہیں اور محبت کا دعویدار محبوب کی خوشنودی کے لیے جان و مال اور عزت و آبرو قربان کرنے میں دریغ کرے اس کا دعوائے محبت بے اصل ہے۔

ایک اہم اصل جماعت کی تربیت میں سید صاحب کے پیش نظر ایک اہم اصل تھی، جس کا ذکر سید جعفر علی نقوی نے یوں کیا ہے:

---

[1] وصایا، حصہ دوم صفحہ [illegible]۔ [2] مجموعۂ مکاتیب شاہ اسمٰعیل، قلمی نسخہ صفحہ ۱۰۹۔

مسلمان را می باید کہ در مقام خواہش نفسانی و مشتہیات از قسم طعام لذیذ و شیرینی و انواع فواکہ دیگر برادران مسلمین را بر نفس تقدیم دہد و خود از آنہا مؤخر شود و روا نہ دارد کہ زیادہ از ایشان بر حظوظ نفسانی محظوظ گردد بلکہ درین ہر کمی بجانب خویش پسند نماید و در مقام رنج و تکلیف نفس خود را بر دیگران مقدم سازد و آمدن بلا و تکلیف بر آنہا نہ پسندد۔[1]

مسلمان کو چاہیے کہ لذیذ کھانوں، میٹھی چیزوں یا قسم قسم کے میووں وغیرہ کے سلسلے میں، جن کی خواہش ہر شخص کو ہوتی ہے، دوسرے مسلمان بھائیوں کو اپنے آپ پر مقدم رکھے اور خود پیچھے رہے۔ اس کے لیے مناسب نہیں کہ حظوظ نفسانی میں دوسروں سے زیادہ حصہ لے جائے۔ بلکہ ایسے معاملات میں اپنے لیے کمی پسند کرنی چاہیے۔ جب رنج و تکلیف کا موقع پیش آ جائے تو اپنے آپ کو دوسروں سے آگے رکھے اور ان پر بلا و تکلیف کا آنا ناپسند کرے۔

تسلیم و توکل سید صاحب نے اس تعلیم و تربیت کا عملی نمونہ پیش کر دیا۔ جب وہ سرحد پہنچے تھے تو اہل سرحد میں سے اکثر رؤسا نے ان کی دعوت قبول کر لی تھی۔ مثلاً خلزئی، منگل تاری، شنواری، آفریدی، مہمند، خلیل، خٹک، سدوزئی، تنولی، ان کے علاوہ کشمیر کے رئیسوں اور سوات، بنیر، باجوڑ اور پکھلی کے باشندوں نے امداد کے پختہ وعدے کر لیے تھے۔ سید صاحب اس کامیابی کو محض اللہ کا فضل قرار دیتے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

ہر روز شکر بجا می آرم و بر حال خود تعجب می نمایم کہ این ذرۂ بے مقدار و عاجز خاکسار را باین نعمت عظمیٰ و عطیۂ کبریٰ مورد گردانید یعنی جان و مال این ضعیف و ناتوان بے سر و ساماں را بہ موقف قبول خود رسانید . . .

ہر روز خدا کا شکر بجا لاتا ہوں۔ اپنے حال پر تعجب ہوتا ہے کہ مجھ بے حقیقت ذرے اور مجھ خاکسار عاجز کو اس بڑی نعمت اور اس عظیم عطیے سے سرفرازی بخشی گئی۔ یعنی مجھ ضعیف، کمزور اور بے سر و ساماں کے جان

[1] منظورہ، ص ۱۰۵۔

عجیب تر آنکہ در تمامی این کاروبار زندگی ہیں
نشیب و فراز دل اخلاص منزل بہ عشق باد
و کلی مشحون در ہم و بہم رضا و تسلیم مقرون سینہ
صفا گنجینہ آرزو ہے انقیاد احکام رب العباد
بالا دل مست و از نشیب و فراز زمانہ مبرا ؎

حال کو اللہ تعالیٰ نے درجہ قبول بخشا۔ اس سے
بھی عجیب تر امر یہ ہے کہ اس کاروبار اور دو رنگی
میں میرا دل توکل سے لبریز ہے اور تسلیم و رضا
سے ہم کنار۔ میرا سینہ احکام الٰہی کی پیروی کے
ذریعے سے مالا مال ہے اور زمانے کے نشیب
فراز سے بالکل پاک۔

ان اقتباسات سے جماعت کی عمومی کیفیت کا صحیح اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے۔ آئندہ باب میں تعلیم و تربیت کے باقی انوار ملاحظہ فرما لیجیے۔

سیدہ صاحبہ کا نمونہ تسلیم و رضا اور اللہ کی رضا میں ماسوی اللہ سے دل گرفتگی کا جو پیمان، قرون گذشتہ زہد سید صاحب نے پیش کیا تھا اس کی مثالیں تاریخ میں متعدد جگہ ملتی ہیں۔ مثلاً راہ ہجرت میں قدم رکھتے ہی وہ اعزہ و اولاد سے الگ ہو گئے۔ پھر اس دنیا میں ان سے ملاقات مقدر نہ تھی۔ اس کے بعد ان کے چند قریبی رشتہ دار ساتھ رہے۔ مثلاً سید محمد علی، ان کے صاحبزادے سید موسیٰ، سید ابو محمد، سید ابو الحسن۔ یہ سب ان کی زندگی میں یا ان کے ساتھ شہید ہوئے۔ ان کی دونوں بیویاں اور بعض اقربا ستھانہ میں رہے۔ بیویوں نے وطن ہی میں غرض چھوڑا تھا کہ سید صاحب کے پاس پہنچ جائیں لیکن پیر کوٹ کے بعد آگے جانے کی کوئی صورت پیدا ہوئی اور نہ لوٹ سکتی تھیں۔ پھر اقربا اسی نیت سے گھر بار چھوڑ کر نکلے اور ٹونک سے آگے نہ بڑھ سکے۔ باقی وطن ہی میں رہے۔ تجرد و مفارقت کی سرگزشت بیان کر دینا سہل ہے لیکن انسان کے لیے اپنے اوپر وارد کرنا سہل نہیں۔ عشق حق میں تنہائی استقامت کے بغیر یہ منزل طے نہیں ہو سکتی۔

پھر مہاجرت کا مسئلہ بہت دشوار اور مصیبت خیز تھا اور ایک دوسرے کے متعلق پریشانی کی خبریں سن کر دلوں پر جو کچھ گزرتی ہوگی اس کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے؟ ایک مرتبہ ایک معتمد علیہ قاصد نے بیویوں

؎ "مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل" قلمی نسخہ ص ۱۹۲-۱۹۳

کو ایسی خبریں سنا دیں جن کا نتیجہ یہی ہو سکتا تھا کہ وہ رنج و غم میں مبتلا ہو جائیں۔ سید صاحب کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو لکھا کہ ہم با اطمینان اپنے کام میں مشغول ہیں، تشویش یا قلق کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر آپ کو صرف اس بات پر قلق ہوا کہ

گزران ما مساکین از ہجوم اعدائے کفار و منافقین در کمال ضیق است و باب جہاد مفتوح نہ شدہ و ہیچ راہ مقصود کشادہ نہ گردیدہ و محض بے سر و سامان در میان کوہستان گردش می کنیم لیکن ایں معنی را موجب رنجش خود ہا ہرگز نباید کرد باید کہ باطاعت اللہ بحمد اللہ ہمیشہ خوش و بے غم بودہ ایم و گاہے تکلیف ایں راہ را تکلیف نہ شمردہ ایم۔

ہم مسکینوں کے لیے کافروں اور منافقوں کے ہجوم کے باعث عرصہ حیات تنگ ہے۔ جہاد کا دروازہ ابھی کھلا نہیں اور مقصود کا راستہ صاف نہیں ہوا بلکہ بے سر و سامانی کی حالت میں کوہستان کے درمیان چکر لگا رہے ہیں تو اس پر قطعاً رنج نہ ہونا چاہیے۔ الحمد للہ کہ ہم اللہ کی فرماں برداری میں ہمیشہ خوش اور بے غم رہے ہیں اور اس راہ کی تکلیفوں کو کبھی تکلیف نہیں سمجھا۔

پھر فرماتے ہیں کہ ماسوی اللہ کے رشتوں میں آپ کے ساتھ جو رشتہ ہے وہ سب سے بڑھ کر عزیز ہے اور یہ رشتہ بھی صرف اس لیے عزیز ہے کہ خدا کی رضا کے تقاضوں میں شامل ہے۔

اطاعت رب العالمین کی لذت

ایک مکتوب میں بیویوں کو تحریر فرماتے ہیں کہ اگرچہ آپ کو سب کچھ معلوم ہے اور لکھنے کی حاجت نہیں لیکن محض تذکیر و نصیحت کے خیال سے لکھتا ہوں:

آنچہ در اطاعت رب العالمین آرام و لذت است در چیز دیگر متصور نیست ہمیں راہ راست موجب سرخروئی دارین و بہبود نشأتین و در چیز دیگر تکمیل ایں سعادت و اتمام ایں دولت نصیب نہ شود۔

رب العالمین کی فرماں برداری میں جو آرام اور لذت ہے وہ کسی دوسری چیز میں متصور نہیں۔ یہی سیدھا راستہ دونوں جہان کی سرخروئی اور بہتری کا باعث ہے۔ کسی دوسری چیز میں اس سعادت کی تکمیل اور اس دولت کا اتمام نصیب

نہیں ہو سکتا۔

مہاجرات میں سید صاحب کی خوشدامن (سیدہ زہرہ کی والدہ ماجدہ اور سیدہ سارہ کی نانی) بھی تھیں جب انھوں نے ایک مرتبہ وطن واپس جانے کا خیال ظاہر کیا۔ سید صاحب کو یہ بات معلوم ہوئی تو لکھا کہ پریشان نہ ہوں۔ اس راستے پر قدم جمائے رکھیں جو منشائے حق ہے۔ تمام متعلقین کو تسلی دیں۔ اللہ تعالیٰ کی مخالفت وبال کا باعث ہوتی ہے:

بر ضمیر منیر آشکار است کہ این بندہ ضعیف
را از ہمہ علاقہ با خوردان و بزرگان مے باشد مخلص
شد فی اللہ می باشد۔ پس اگر احدے از خوردان
و بزرگان مخالفت خدا لازم گیرد علاقہ او از دل
اخلاص منزل ہم بدر مے رود و لازمہ کہ بعد ازین ضعیف
ایں وسوسہ را از خاطر شریف بدر فرمودہ بہ تسلی
و تشفی دیگراں پرداختہ و اثبات قدم را بتوجہ فرا
واہم ساختہ ند

آپ پر روشن ہے کہ مجھے چھوٹے سے
بڑے جو تعلق ہے وہ صرف خدا کے لیے ہے۔ اگر
ان میں سے کوئی خدا کے خلاف راستہ اختیار
کرے گا تو میرے دل سے بھی اس کی محبت
نکل جائے گی۔ ضروری ہے کہ آپ استغفار سے
کام لیں اور یہ وسوسہ اپنے دل سے نکال لیں۔
دوسروں کے لیے تسلی و تشفی کا باعث ہوں اور
اس راستے میں ثابت قدمی اپنے اوپر واجب و
لازم بنا لیں۔

یہی نمونہ تھا جس نے جماعت کے تمام افراد کو استقامت کی چٹان بنا دیا۔ ان کے دل عشقِ حق سے معمور ہوئے اور انھوں نے دین کی راہ میں قربانی کے وہ طریقے پیش کیے جن کی مثالیں ہندوستان کی تاریخ میں عموماً کمیاب ہیں۔

جنگی سامان موجود تھا۔ اس لشکر پر چھاپے کے لیے جو مجاہدین بھیجے گئے، ان میں سے صرف ایک سو چھپن ہندوستانی تھے؛ اور باقی قندھاری۔ کچھ کم سات سو مقامی لوگ تھے۔ جنگ کا سب سے بڑا بوجھ صرف مجاہدین نے اٹھایا اور شاندار فتح حاصل کی۔ زیدہ کی لڑائی میں یار محمد خاں کا لشکر آٹھ دس ہزار سے کم نہ تھا تاہم صرف سات سو مجاہدین نے اسے شکست فاش دی۔ مجاہدین میں سے صرف دو شہید ہوئے اور چار زخمی۔ مایار کی لڑائی میں دُرّانیوں کے چار ہزار پیادوں اور آٹھ ہزار سواروں سے مقابلہ تھا۔ مجاہدین صرف ساڑھے تین ہزار تھے اور میدان انھیں کے ہاتھ رہا۔ یہ واقعات یقیناً ایسے ہیں جن سے سید صاحب کی شانِ تربیت اور کمالِ مردم گری روزِ روشن کی طرح آشکارا ہے۔

کمالِ عجز و انکسار

پھر قابلِ توجہ امر یہ ہے کہ ان میں سے کسی بھی کارنامے پر مجاہدین کے دل میں غرور پیدا نہ ہوا۔ جنگ مایار کے بعد ہر شخص کی زبان پر یہ الفاظ تھے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنی قوت و قدرت سے ہمیں زور آوروں پر فتح عطا کی جو ملک و خزائن کے مالک تھے اور اطمینانِ قلب کا یہ حال تھا کہ خونریز جنگ میں وہ اس طرح شریک ہوتے، جیسے لوگ کسی کے ہاں دعوتِ طعام کے لیے جاتے ہیں۔

سید صاحب نے ایک موقع پر تحریر فرمایا تھا:

الحمد للہ والمنۃ کہ مومنین صادقین را نہ در ہنگام فتح نخوت و غرور ے بہم می رسد و نہ در وقت شکست تقاعد و فتور ے[1]۔

اللہ تعالیٰ کا شکر اور احسان ہے کہ مخلص مومنوں کے دل میں نہ فتح کے وقت کبر و غرور پیدا ہوتا ہے، نہ شکست کے وقت ان میں انتشار اور افسردگی آتی ہے۔

میدانِ جہاد میں انھیں گوناگوں مشکلات سے بھی سابقہ پڑا اور بعض اوقات شدید ضربیں بھی لگیں۔ تاہم نہ انھوں نے ہمت ہاری، نہ اپنی بے سروسامانی کے پیشِ نظر اصل کام سے کنارہ کشی اختیار کی۔ وہ جہاد کو ایک نہایت اہم اسلامی فرض سمجھتے تھے؛ وہ اس کی بجا آوری میں تادمِ آخر اسی طرح سرگرم و مستعد رہے جس طرح مخلص مسلمان نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے فرائض ادا کرنے کے لیے مستعد رہتے ہیں۔

[1] مجموعہ مکاتیب شاہ اسمٰعیل، قلمی نسخہ صفحہ ۸۵۔

طریقِ زندگی وہ سرحد پہنچے تھے تو معیشت کی تنگی بڑی پریشان کن تھی۔ ان میں سے شاید ہی کوئی ہو جو اپنے وطن میں راحت و آسائش کی زندگی بسر نہ کر چکا تھا۔ بعض بڑے بڑے رئیسوں کے لختِ جگر تھے۔ مثلاً میر فیض علی ابن میر ذوالفقار علی خاں رئیس گورکھپور، شیخ امجد علی ابن شیخ فرزند علی رئیس غازی پور، لیکن کوئی تکلیف ان کے عزم میں تزلزل پیدا نہ کر سکی۔ عام طریقہ یہ تھا کہ رات کے کھانے سے فراغت کے بعد نماز ادا کرتے۔ پھر سے دار پہروں پر کھڑے ہو جاتے۔ باقی مجاہدین سید صاحب کے ارشادات سے مستفیض ہونے کے اشتیاق میں آپ کے پلنگ کے اردگرد بیٹھ جاتے۔ وہیں زمین پر سو رہتے۔ مولوی فتح علی فرماتے ہیں

> حضرت کے پلنگ کے اردگرد اکثر لوگ آپ کی باتیں سنتے سو رہا کرتے تھے اور اس کثرت سے رہا کرتے تھے کہ کسی کا سر کسی کا پیر، کسی کا پیٹ اور کسی کی پیٹھ، جس نے جہاں کہیں جگہ پائی، بے تکلف سو رہا۔

"منظورہ" سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے:

از غایت بے تکلفی بستر جداگانہ بود و سیلہ	بے تکلفی کا یہ عالم تھا کہ کسی کا الگ
اہل دنیا را باشد نہ بود بلکہ پاے یکے بر سوے	بستر نہ تھا اور اہل دنیا کے طور طریقوں سے
سر دیگرے و پہلوے کسے خلاف احدے گذیدہ	وہ بالکل پاک تھے۔ ایک کا پاؤں دوسرے کے سر کی طرف اور کسی کا پہلو کسی کے خلاف ہوتا۔

نیکی میں سبقت ہر شخص کی آرزو تھی کہ نیکی کے کاموں میں سب سے آگے رہے۔ اس کی بیسیوں مثالیں جا بجا پیش کی جا چکی ہیں۔ امب کا ایک واقعہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ یہ مقام اس زمانے میں فتح ہوا تھا، جب گندم کی فصل پکنے کے قریب تھی۔ سید صاحب نے اعلان فرما دیا تھا کہ اہلِ امب میں سے جو شخص چاہے، بہ اطمینان واپس آ کر اپنی فصل سنبھال لے۔ جو لوگ واپس نہ آئے، ان کی فصلوں کی دیکھ بھال مجاہدین کرنے لگے۔ فصل کٹ کر غلہ جمع ہو گیا۔ ابھی اٹھا کر قلعے میں نہ پہنچایا گیا تھا کہ بارش شروع

ئہ وقائع، صفحہ ۱۴۲۴

ہو گئی۔ سید صاحب نے مجاہدین کو غلہ اٹھانے کا حکم دیا۔ منشی جی اس کام میں شریک ہو گئے۔ میر فیض علی گورکھپوری نے بھاری بوجھ اٹھا لیا اور انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ یہ حالت دیکھ کر سید صاحب نے منشیوں کو یہ خدمت معاف فرما دی۔ میر فیض علی پھر بھی اس کام میں لگے رہے۔ سید جعفر علی نے کہا کہ اب کیوں تکلیف اٹھاتے ہیں؟ فرمایا:

ہر چند فرضیت از ما ساقط شد، اما استحباباً	اگرچہ یہ کام فرض نہ رہا لیکن ایک
برائے بجا آوری ایں کار می روم۔	پسندیدہ امر کی بجا آوری کے خیال سے جا رہا ہوں۔

"سیرت سید احمد شہید" میں یہ قصہ تفصیلاً بیان ہو چکا ہے کہ ایک مرتبہ رات کے وقت شیخ بلند بخت، شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کی تلاش میں آئے۔ سید جعفر علی نے کہا کہ وہ سرکاری گھی خریدنے کے سلسلے میں دن بھر پھرتے رہے، اب سو رہے ہیں۔ کہتے تھے کہ طبیعت اچھی نہیں۔ مجھے جگایا نہ جائے۔ اگر کوئی ضروری کام ہو تو مجھے فرمائیے۔ شیخ بلند بخت نے فرمایا کہ پائندہ خان کی زنبورکیں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں، انھیں لانا ہے۔ چنانچہ سید جعفر علی اسی وقت روانہ ہو گئے۔ ساری رات سفر میں گزری۔ اگلے دن چاشت کے وقت تک تمام زنبورکیں لے آئے۔ سفر اتنا کٹھن تھا کہ سید جعفر علی کو بخار آ گیا۔ شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری بار بار ان سے جھگڑتے تھے کہ جب حکم میرے نام آیا تھا تو آپ نے کیوں یہ تکلیف اٹھائی؟

عبدالمجید خاں آفریدی ساکن جہان آباد (رائے بریلی) کا واقعہ بھی "سیرت" میں بیان ہو چکا ہے۔ جنگ اکوڑہ کے موقع پر انھیں بخار آتا تھا اور خاصے کمزور ہو گئے تھے۔ اس وجہ سے سید صاحب نے انھیں جنگ کے لیے منتخب نہ فرمایا۔ وہ بیتاب ہو کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض پرداز ہوئے:

حضرت! میں کچھ ایسا بیمار تو نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو۔ یہ پہلا محاربہ ہے جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی۔ میرا نام ضرور شامل فرما دیجیے۔ تاکہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔

سید صاحب نے ان کا ذوق و شوق دیکھ کر خواہش پوری کر دی اور دعا کی۔ خان موصوف نے کمزوری کے باوجود چودہ آدمی اپنے ہاتھ سے قتل کیے۔ پھر ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مولوی امیر الدین ولایتی نے اپنی ایک

تو راہیں دے دی۔ اس سے پہلے کئی ساتھیوں کو موت تک گھاٹ اتارا۔ آخر خود بھی خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔

شہادت یا منزل مراد! اقبال نے لکھا ہے:

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

اس شعر کی عملی تصویر بے صرف جماعت مجاہدین میں پائی جاتی ہیں۔ جو مجاہد شہادت پاتا تھا، اس کے متعلق سب یہی کہتے تھے کہ وہ جو مراد لے کر خدا کی راہ میں وطن سے نکلا تھا۔ پوری ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رضامندی کی راہ میں صرف کر دے اور ہم سب سے راضی ہو۔

اہل ستھانہ کی غداری کے موقع پر مولوی خدا بخش نام پیروں جگہ میں تھے۔ ایک ملا کی سعی و کوشش سے وہ اور چند دوسرے مجاہد محفوظ رہے۔ ایک روز وہ بیٹھے کے ملا سید محمد سے باتیں کر رہے تھے۔ مجاہدین کی مظلومیت کا ذکر چھڑ گیا تو ملا صاحب بے اختیار اشکبار ہوگئے۔ مولوی خدا بخش نے کہا:

دریغا کہ ہمیں شہادت از مقام دور	ہم شوق شہادت ہی لے کر وطن دور از
دست ندہ ایم۔ کسانیکہ شہید شدند بمراد خود	سے یہاں آئے تھے۔ جو لوگ شہید ہوئے، وہ
رسیدند و کسانیکہ باقی ماند ہمیں ارادہ دارند۔	مراد کو پہنچ گئے۔ جو باقی ہیں، ان کا ارادہ بھی
اللہ تعالیٰ امام ما را سلامت دارد۔ انشاء اللہ	یہی ہے کہ راہ حق میں جانیں دے دیں۔ اللہ
سامان جہاد باز مجتمع خواہد گردید[1]	ہمارے امام کو سلامت رکھے۔ انشاء اللہ ان
	کی برکت سے پھر جہاد کا سامان جمع ہو جائے گا۔

موت سے بے پروائی! کیا خوب فرمایا شیخ بلند بخت دیوبندی نے کہ ڈر خوف مرگ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم اپنی جانیں خدا کی راہ میں قربان کر چکے ہیں، پس ہمیں کیا ڈر ہے؟

[1] "منظورہ" صفحہ ۹۹۶۔

سید صاحب کی تربیت نے مجاہدین کے دل سے خوفِ مرگ زائل کر دیا تھا۔ تربیت کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا جس پر خاص توجہ مبذول ہونی چاہیے۔ کوئی قوم زندگی کی منزل میں ترقی نہیں کر سکتی جب تک خوفِ مرگ سے کاملاً پاک نہ ہو جائے۔ تاریخ ایسے لوگوں کے بھی تذکروں سے لبریز ہے جنھوں نے دنیوی عزت و دولت اور حکومت و فرماں روائی کے لیے موت سے بے پروائی اختیار کی۔ اسلام نے توحید کے استحکام، خدا اور یومِ آخرت پر کمالِ ایمان کے نسخۂ شافی سے خوفِ مرگ کی بیماری کا علاج کیا۔ سید صاحب نے اتباعِ سنتِ نبوی میں یہی نسخہ استعمال کیا۔ جو جماعت خوفِ مرگ سے آزاد ہو جائے، اسے دنیا کی کوئی طاقت ہراساں نہیں کر سکتی۔ اقبال نے ایک نعت کے آغاز میں یہی دعا کی تھی کہ مسلمانوں کو خوفِ مرگ سے نجات مل جائے:

اے تو ما بے چارگاں را ساز و برگ
وا رہاں ایں قوم را از ترسِ مرگ

مقرر کر لیا تھا کہ ہر شخص کو باری باری رسد دیتے ۔ مولوی امام علی عظیم آبادی نو وارد تھے اور دستور تقسیم کا انھیں علم نہ تھا ۔ انھوں نے جلد رسد لینے کے جوش میں مولوی صاحب کو دھکا دے دیا ۔ یہ حالت دیکھ کر بعض مجاہدین غصے میں آگئے اور امام علی کو مارنے کے لیے تیار ہو گئے ۔ مولوی صاحب نے انھیں روک دیا اور کہا : امام علی میرا بھائی ہے ۔ دھکا دیا تو مجھے دیا ، آپ لوگ کیوں جوش میں آگئے ؟ یہ بات سید صاحب تک پہنچی ۔ آپ نے مولوی عبدالوہاب سے پوچھا ۔ انھوں نے عرض کیا کہ امام علی نیک بخت آدمی ہیں ۔ وہ رسد لینے آئے تھے ۔ باری ان کی نہ تھی ۔ انھوں نے جلدی کی اور مجھے دھکا لگ گیا ۔ امام علی نے خود سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی زیادتی کا اقرار کر لیا اور عرض کیا کہ میرا قصور معاف کرا دیجیے ۔

۳ ۔ اہلِ سمہ کی غداری کے وقت حافظ عبدالعلی اور مولوی محمد رمضان بھی شیوہ میں تھے ۔ سید امیر علی بیت المال کا روپیہ لے کر پنجتار چلے گئے ۔ انھیں حافظ عبدالعلی نے گاؤں کے باہر پہنچا دیا لیکن خود یہ کہہ کر لوٹ گئے کہ میں اس نازک وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا ۔ مولوی محمد رمضان کو شیوہ کے رئیس اپنے ہاں لے جانا چاہتے تھے ، لیکن انھوں نے بھی رفیقوں سے علیحدگی گوارا نہ کی اور ان کے ساتھ شہید ہوئے ۔

۴ ۔ میٹی میں جن مجاہدین کو قاتلانہ حملے کا ہدف بننا پڑا ، ان میں خیبر کا ایک نوجوان حبیب خاں بھی شامل تھا ۔ بلوائی بار بار اسے آوازیں دیتے تھے کہ تم ہمارے ہم قوم ہو ۔ ہندوستانیوں سے الگ ہو کر ہمارے پاس چلے آؤ ۔ اس نے ہر مرتبہ یہی جواب دیا کہ مجاہدین کے ساتھ شہید ہو جانا میرے نزدیک ہزار درجہ بہتر ہے اور تمھارے ساتھ جینا منظور نہیں ۔

مسلمانوں سے جنگ سید صاحب کی تحریک کے سلسلے میں ایک مسئلہ خاص توجہ کا مستحق ہے اور وہ یہ کہ انھیں سرحدی سرداروں اور خوانین سے لڑائیاں پیش آئیں ۔ "سید احمد شہید" میں ان لڑائیوں کے اسباب تفصیلاً بیان ہو چکے ہیں ۔ سید صاحب کسی مسلمان سے لڑنے کے روادار نہ تھے ، لیکن بعض مسلمان رئیس خود سید صاحب کے خلاف اغیار کے جاسوس یا معاون بن گئے اور ان کی وجہ سے قدم قدم پر تنظیمات جہاد میں رکاوٹیں پیدا ہوتی رہیں ، مثلاً پشاور کے درانی سردار ، خادے خاں رئیس ہنڈ ، پائندہ خاں تنولی

رانی امب۔ سید صاحب نے ایک موقع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا :

ہم لوگ اتنی مدت سے اس ملک میں واسطے جہاد فی سبیل اللہ کے آئے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کی ریاست سمجھ کر یہاں اترے ہیں۔ فقط اس نیت سے کہ سب مسلمان بھائیوں کے اتفاق سے دین اسلام کا کام درست ہو۔ لیکن یہاں کے مسلمان بھائیوں کی نااتفاقی کا یہ حال ہے کہ اگر ہم کوئی صورت کفار کو زیر کرنے کی نکالتے ہیں تو انھیں مسلمانوں سے ایک نہ ایک ان کا حامی ہو کر بیچ میں حارج ہوتا ہے ۔

اس کے بعد یار محمد خاں اور خادے خاں کی مخالفانہ کارروائیوں کو تفصیلاً بیان کیا۔ جنگ مایار کے بعد پشاور پر پیش قدمی شروع ہوئی تو اس وقت بھی مختلف اہل سرحد سے فرمایا :

ما برائے تائید دین اسلام آمدہ ایم و شراکت مسلمانان در این امر توقع داشتیم۔ سرداران شما (سلطان محمد خان) از کج فہمی خود شراکت گزیدہ با کفار زنگوں ساز گردید ۔	ہم اسلام کی حمایت کے لیے یہاں آئے اور مسلمانوں کو اس کام میں شریک کر لینے کے خواہاں تھے۔ آپ کا سردار سمجھ کی کجی سے ہمارا ساتھ چھوڑ کر کافروں کے ساتھ مل گیا ۔

ان حالات میں سید صاحب کے لیے دو ہی صورتیں تھیں: یا ان فتنوں کا انسداد کرتے یا کاروبار جہاد سے دست کش ہو جاتے۔ انھوں نے پہلا راستہ اختیار کیا اور یہی ان کے لیے زیبا تھا۔ ان مسلمان رئیسوں کے سامنے ذاتی اغراض کے سوا کوئی دینی، قومی یا ملکی مقصد نہ تھا ۔

عزیمت جماعت مجاہدین کی پوری زندگی عزیمت کی داستان ہے۔ گھر بار، اہل و عیال، اعزہ و اقربا سے علیحدگی، راحت و آسائش کا ترک، غربت میں گوناگوں تکلیفوں کا اختیار، یہ چیزیں عزیمت ہی کا کرشمہ تھیں۔ وہ ہر لحظہ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر لیے پھرتے تھے۔ یہ بھی نہیں کہ موجودہ زمانے کے عام جماعتی کارکنوں کی طرح انھیں شہرت و ناموری کی امید ہو یا سمجھ رہے ہوں کہ فتح و کامرانی کی حالت میں بڑے بڑے عہدے پائیں گے۔ ان کے پیش نظر خدمت دین کے سوا کچھ نہ تھا اور جو کچھ کر رہے تھے، صرف خدا کے لیے کر رہے تھے۔ عزیمت کا مفہوم اور کیا ہوتا ہے؟ انھوں نے ہر میدان عمل میں اخلاص و عزیمت کے حیرت انگیز نمونے پیش کیے۔

جن کی مثالیں اسلامی ہند کی تاریخ میں شاذ ہی مل سکیں گی۔ یہاں صرف چند واقعات بطور نمونہ پیش کیے جاتے ہیں:

۱۔ امب اور چھتر بائی فتح ہو چکے تھے۔ سید صاحب پنجتار تشریف لے گئے تھے۔ تجربے سے مجاہدین ان دونوں قلعوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ اس حالت میں معلوم ہوا کہ سردار پائندہ خان تنولی بھاری لشکر جمع کر کے دونوں قلعوں پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ دریا کے مختلف حصوں سے سکھ فوج کی گولیاں بھی آ رہی تھیں۔ چھتر بائی کے لیے خطرہ بہت زیادہ تھا۔ شیخ ولی محمد روزانہ صبح کو سو مجاہدین کے ساتھ امب سے چھتر بائی جاتے۔ دن وہاں گزارتے اور رات کی تاریکی میں واپس آتے۔ گویا خاصی لمبی مدت تک آمدورفت کا یہ سلسلہ جاری رہا۔

۲۔ اہلِ سمہ کی غداری کے باعث بہت سے مجاہدین مظلومانہ شہید ہو چکے تھے۔ سید صاحب نے پنجتار سے کشمیر کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ امب اور چھتر بائی کے قلعے بدستور مجاہدین کے قبضے میں تھے۔ شیخ بلند بخت امب کی جماعت مجاہدین کے سالار تھے اور حافظ مصطفیٰ کاندھلوی کو چھتر بائی میں قلعہ داری کا منصب حاصل تھا۔ دونوں سالاروں یا جماعتوں کے لیے نہ سید صاحب کے حکم کے بغیر قلعہ چھوڑنا ممکن تھا، نہ انھیں تک پہنچ سکتی تھی بلکہ خاص اطلاعات کے بغیر وہ کہیں جا بھی نہ سکتے تھے۔ اس اثنا میں ان کے پاس سکھوں کا پیغام پہنچا کہ ہم آپ کو بڑے سے بڑا عہدہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ ہمارے پاس چلے آؤ۔ دونوں سالاروں کا جواب ایک تھا۔ ہم یہاں شیخ بلند بخت کا جواب نقل کرتے ہیں۔ فرمایا:

> اپنے سردار سے کہو: ہم امیر المومنین کے تابع فرمان ہیں۔ حضرت کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اپنے وطنوں سے اس لیے آئے ہیں کہ کافروں سے جنگ کریں۔ نہ ملک چاہتے ہیں نہ مال۔ ہمیں نوکری سے کیا غرض؟ ہماری موت اور زندگی امیر المومنین کے ساتھ ہے۔ قادر ذوالجلال کے سوا ہم کسی سے نہیں ڈرتے . . . اگر رنجیت سنگھ بھی اپنا لشکر لے کر آئے تو نہ ڈریں گے۔ ڈر خوفِ مرگ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم اپنی جانیں خدا کے راستے میں قربان کر چکے ہیں۔ پس ہمیں کیا ڈر ہے؟ ہماری طرف سے کہہ دینا کہ پھر ہمیں ایسا پیام نہ بھیجا جائے۔[1]

---

[1] منظورہ، ص ۱۰۶۔۱۰۹

۳ - جب سید صاحب کو یقین ہو گیا کہ سکھ بالاکوٹ پر حملے کا پختہ ارادہ کر چکے ہیں تو آپ نے بھگڑں سے بالاکوٹ جانے کی تیاری کر لی لیکن درہ بھوگڑمنگ کی حفاظت کا انتظام ضروری تھا، اس لیے کہ اندیشہ تھا، شاید سکھ ادھر حملہ کر دیں۔ آپ نے روانگی سے پیشتر میاں ضیاء الدین پھلتی اور خضر خاں قندھاری کو ایک جیش دے کر بھوگڑمنگ میں اقامت کا حکم دیا۔ خضر خاں نے بڑے عجز سے عذر پیش کرتے ہوئے کہا: جنگ درپیش ہے، اس حالت میں حضرت کی رفاقت نہ چھوڑوں گا۔ اس جانباز مجاہد کو بڑے اصرار سے روکا گیا کہ بھوگڑمنگ کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی کہ جنگ میں رفاقت۔

تحمل شدائد | مجاہدین کی پوری زندگی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرنے میں گزری۔ ان کے لیے دوران ہجرت و جہاد میں آسائش کے چند لمحے بھی نہ آئے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وقت پر کھانا نہ ملتا یا ملتا تو ضرورت سے بہت کم ہوتا، لیکن ان کی زبان پر کبھی شکایت کا ایک حرف بھی نہ آیا۔ مثال کے طور پر مایار کی لڑائی کے دن انھیں صبح سے شام تک کھانے کا موقع نہ ملا۔ رات کو قصد پہنچے تو اتنے تھک چکے تھے کہ کھانا کھانے کا ہوش ہی نہ رہا۔ سید جعفر علی نقوی منشی خانہ کے معزز رکن تھے۔ جنگ مایار کے بعد جن اصحاب کو شاہ اسمٰعیل کے ساتھ مردان جانے کا حکم ملا، ان میں سید جعفر علی بھی تھے۔ وہ فرماتے ہیں: میں نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ رات کو کچھ نہ کھایا تھا۔ دن کے وقت ایک خشک ٹکڑا ملا، وہی کھا کر پانی پی لیا۔ اجازت ہو تو جلدی جلدی دو نوالے کھا لوں۔ انھوں نے فرمایا کہ روٹی ساتھ لے لو اور تورو سے باہر نکل کر کھانا۔ سید جعفر علی نے اسی پر عمل کیا۔

مردان سے پشاور پر پیش قدمی شروع ہو گئی۔ اس سفر میں بھی ایک موقع پر رسد نہ مل سکی۔ تھوڑا سا غلہ ہاتھ آیا، وہ قندھاریوں میں تقسیم کر دیا، جو لشکر سے آگے بڑھ کر دریا کے کنارے مورچے بنائے بیٹھے تھے۔ باقی مجاہدین نے صرف گائے کے گوشت کی ایک ایک بوٹی پر اکتفا کی۔ سید صاحب بھی مجاہدین کی طرح فاقے سے رہے۔

بعض اوقات تکلیفیں بہت بڑھ جاتی رہیں۔ مثلاً ابتدائی دور میں مجاہدین زیادہ تر ساگ پات پر گزارہ کرتے رہے۔ چنگلئی میں رسد کی تنگی کے علاوہ اکثر مجاہدین بیمار ہو گئے۔ مولوی فتح علی کہتے ہیں کہ سیکڑوں مجاہدین

میں سے صرف چھ سات تندرست رہے ہوں گے اور ان کی حالت یہ تھی کہ دن رات کا ایک ایک لمحہ بیماروں کی تیمارداری اور دوا دارو ہی میں صرف ہونے لگا۔ سید رستم علی چلکانوی اکوڑہ میں زخمی ہو کر دوا شفا خانے میں صاحب فراش رہے۔ چنگلی پہنچنے پہ ان کی صحت پوری طرح بحال نہ ہوئی تھی تاہم تنہا چالیس بیماروں کی تیمارداری کا بار اٹھالیا اور حتی المقدور کسی کو بھی تکلیف نہ ہونے دی۔

ہاتھ سے کام مجاہدین کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ کسی کو بھی ہاتھ سے کام کرنے میں تامل نہ تھا۔ سید صاحب اپنے واقعات سناتے رہتے تھے کہ ہم نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے اور کپڑے دھونے کے لیے جاتے تو اپنے آٹھ دس ساتھیوں کے کپڑے بھی دھولاتے۔ ایک مرتبہ مردان میں ٹھہرے تو مسجد کے پاس کی جگہ ہاتھی بندھنے کے باعث گندی ہو گئی تھی۔ سید صاحب نے خود کدال لیا، شاہ اسمٰعیل نے ٹوکری سنبھال لی اور تھوڑی دیر میں ساری جگہ صاف کر دی۔

پنجتار میں جو جگہ نماز کے لیے مخصوص کر لی تھی اس کے گرد ایک احاطہ تھا، نہ چھت نہ فرش۔ نماز پڑھتے وقت مجاہدین کے کنکر چبھتے تھے۔ ایک روز سید صاحب مجاہدین کو لے کر جنگل میں نکل گئے، وہاں سے گھاس کاٹ لائے کر فرش پر ایک نٹ موٹی تہ بچھادی گئی۔ اسی طرح چند روز بعد چھپر بنا کر چھت کا انتظام کر لیا۔ مجاہدین ہی نے مسجد میں توسیع کر لی، انھیں نے اپنے لیے نئے مکان بنا لیے۔ منظورہ میں مرقوم ہے:

> حضرت کی تعلیم کے مطابق کسی کو کسی کام میں عار نہ تھی۔ سب اپنے ہاتھ سے کپڑے دھوتے کھانا پکاتے۔ جنگل سے لکڑی لاتے۔ چکی پیستے۔ بیماروں اور معذوروں کی تے ور نجاست ٹھا کر باہر پھینکتے۔ جو لوگ بعد میں آتے انھوں نے پہلوں کو دیکھ کر سبق حاصل کر لیا۔

حق گوئی میں بیباکی مجاہدین سید صاحب کا اتنا ادب کرتے تھے کہ اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ تاہم حق بات کہنے میں کسی کو باک نہ تھا۔ سید صاحب نے خود کئی مرتبہ مجاہدین سے فرمایا تھا کہ میں بشر ہوں اگر کسی وقت کوئی بے جا یا خلاف شریعت بات میری زبان سے صادر ہو تو ضرور مجھے آگاہ کرنا ورنہ قیامت کے روز سب کا دامن پکڑوں گا۔ چنانچہ ایک مرتبہ میاں عبداللہ کے لیے بے اختیار "مردود" کا لفظ زبان مبارک سے نکل گیا۔ میاں نظام الدین چشتی نے آپ کو یاد دلایا کہ یہ لفظ کسی مسلمان کے لیے کیسا ہے؟ فرمایا۔

شرمندہ قصور ہو، پھر سب کے سامنے میاں عبداللہ سے معافی مانگی۔ شاہ اسمٰعیل نے تو خود انھیں یہ واقعہ سنایا، ساتھ ہی بے تکلف اپنے معافی مانگنے کا ذکر کیا۔

ایک مرتبہ حسن زئی قبیلہ نے سید صاحب سے عشر معاف کر دینے کی درخواست کی۔ آپ نے تالیف قلوب کی غرض سے درخواست منظور کر لی۔ اس کا چرچا ہوا تو شاہ اسمٰعیل نے صاف کہہ دیا کہ عشر حقوق شرعی میں سے ہے، ورنہ امام بھی اسے معاف نہیں کر سکتا۔

اسی پر حملے کا خطرہ پیدا ہوا تو سید صاحب نے شاہ اسمٰعیل کو لکھا کہ مستورات کو قلعے سے نکال کر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے۔ شاہ صاحب سمجھتے تھے کہ مستورات کو نکالا تو لوگوں کے دلوں میں ہراس پیدا ہو جائے گی۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل کو خلاف مصلحت بتایا۔ سید صاحب نے دوبارہ یہی لکھا کہ مستورات کو قلعے میں نہ رکھنا چاہیے۔ شاہ اسمٰعیل اگرچہ تعمیل حکم میں ہمیشہ مستعد رہتے تھے۔ لیکن اس حکم کے خلاف اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا کہ اگر اس پر عمل کرنے سے شوکت اسلام کو نقصان پہنچا تو خدا کے نزدیک اس کی جواب دہی آپ کے ذمے ہو گی۔

عفت و پاک بازی: مجاہدین کی عفت و پاک بازی درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی تھی۔ قیام پنجتار کے زمانے میں ایک مرتبہ مرزا حکیم خوند زادہ نے گاؤں کی عورتوں کو آپس میں باتیں کرتے سنا کہ سید بادشاہ کے ساتھی یا تو نفسانی خواہشات سے محروم ہیں یا اولیاء ہیں۔ یہیں چشموں پر پانی بھرنے آتے ہیں۔ وہاں عورتیں بھی ہوتی ہیں لیکن کیا مجال کہ آج تک کسی مجاہد کی نگاہ عورت کی طرف اٹھی ہو۔ ملا حکیم نے کہا: وہ واقعی اولیاء ہیں۔ یہ سید صاحب کی صحبت و تربیت کا اثر ہے کہ ان کی نظر شریعت کے خلاف قطعاً نہیں اٹھتی۔

پشاور پر پیش قدمی کے دوران میں مجاہدین چارسدہ سے نکلے ہوئے جب مٹ پہنچے تو لشکر کی حق شناسی دیکھ کر لوگ پکار اٹھے:

این عجب لشکر است با وجود لشکرکشی — یہ عجیب لشکر ہے، اگرچہ چھ سات ہزار
هفت هزار سوار و پیادہ نزول کردہ اند و با این — سوار اور پیادے اترے ہوئے ہیں لیکن کسی
کسے نالہ نمی رود — پر ظلم نہیں ہوتا۔

محض تحریکات ہی نہیں بلکہ روایات و تشبیہات سے بھی گریز کا یہ حال تھا، اپنی تحریک کو اس قسم کی چیز سے بھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ عبدالغفار خاں پشاوری کا واقعہ بیان ہو چکا ہے۔ اسے قلب سازی میں کمال حاصل تھا۔ کہتا تھا کہ جتنے روپے چاہیں، بنا کر دے سکتا ہوں اور ان سے سب کچھ خرید سکتے ہیں۔ سید صاحب نے صاف صاف فرما دیا کہ ہمارے ساتھ رہنا ہے تو قلب سازی چھوڑ دو ورنہ سکھوں کے علاقے میں چلے جاؤ۔

شانِ تربیت | سید صاحب کا طریق تربیت یہ تھا کہ کسی کو مخصوصاً حکم نہ دیتے تھے۔ عموماً فرما دیتے تھے کہ فلاں کام ہونا چاہیئے یا خود کام شروع کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ قیام ہسب کے زمانے میں پانی کی ضرورت پیش آگئی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ کوئی بھائی دو چار مشکیں دریا سے لے آئے۔ ہر شخص نے سمجھا کہ پانی آگیا ہوگا۔ جب معلوم ہوا کہ پانی نہیں آیا تو سید صاحب نے خود مشک اٹھالی۔ پھر تمام مجاہدین مشک، پکھال، ڈول، بدھنا، گھڑا لے کر دوڑ پڑے۔ سید صاحب پانی لے کر آئے تو فرمایا کہ میری خاص ذات سے کام نہ کرنا چاہیئے للّٰہیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر بھائی ہر کام صرف خدا کی رضا کے لیے کرے۔ "منظورہ" کا بیان ہے:

آنجناب را منظور بود کہ حکم علی العموم	سید صاحب کو منظور یہ تھا کہ حکم علی العموم
باشد و مسلماناں بر آں سبقت کنند و بالخصوص	دیا جائے اور مسلمان اس کی تعمیل میں پیش قدمی
کسے را حکم داده نشود[1]	کریں۔ تخصیص سے کسی کو حکم نہ دیا جائے۔

سیادت | ہمارے زمانے میں سیادت کے احترام و عزت پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سید صاحب کے تصورِ سیادت کا بھی اندازہ کر لینا چاہیئے۔ قیام ہسب کے زمانے میں ایک آدمی سید صاحب کے پاس کچھ مانگنے کے لیے آیا۔ آپ نے جہاد کی ترغیب دی۔ اس نے کہا کہ میں ضعیف ہوں اور میرے بال بچے سکھوں کے علاقے میں رہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں لشکر بھیج کر تمہارا سامان اور بال بچے منگوا لوں گا۔ وہ بولا اس طرح جانیں تلف ہوں گی اور اگر دشمن کامیاب ہو گیا تو مصیبت پیش آئے گی۔ سید صاحب نے فرمایا کہ اسے دو روپے دے دیے جائیں۔ وہ بولا کہ میں سید ہوں۔ حضرت یہ سنتے ہی غصے میں آگئے اور فرمایا:

---

[1] "منظورہ" صفحہ ۶۳۴۔

وقتیکہ بشما کارے فرمودم کہ بر دیگراں واجب و بر سادات واجب است، آں وقت عذر کردید۔ اکنوں برائے یک دو روپیہ سیادت خود را می فروشید! ایں عجب است کہ شخصے برائے بجا آوردن احکام الٰہی اظہار سیادت نمی کند، چرا اقدام و سبقت در امور عبادت شایان شان سیادت است، و در مقام طمع اظہار سیادت خود می نماید[1]۔

جب تمہیں ایک ایسے کام کا حکم دیا جو دوسروں کے لیے لازم اور سادات کے لیے بدرجہا لازم ہے، اس وقت تم نے عذر کر دیا۔ اب ایک دو روپے کے لیے اپنی سیادت بیچ رہے ہو۔ کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ اس شخص نے خدائی کام بجا لانے کے سلسلے میں تو سیادت کا اظہار نہ کیا اگرچہ معاملات عبادت میں سبقت اور پیش قدمی سیدوں کے شایان شان ہے اور طمع کی خاطر اپنے سید ہونے کی نمائش کرتا ہے۔

بے شک سیادت کا دعویٰ اسی صورت میں زیبا ہے کہ انسان کا عمل اس کے شایان شان ہو۔

آخری گزارش یہ اس جماعت کی ترتیب و تنظیم اور اسلامیت کا ایک سرسری خاکہ تھا، جو مختلف ماخذ سے متفرق حالات جمع کر کے مرتب کیا گیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے جماعت کی پوری تصویر آ گئی۔ لیکن اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب نے تھوڑی سی مدت میں اپنی بے مثال تربیت سے کیسی جماعت پیدا کر دی تھی، جس کی اسلامیت زوال کے تاریک دور میں آفتاب جہاں تاب کی طرح درخشاں ہے اور اس کی روشنی کبھی ماند نہ پڑے گی۔ اسی نقشے سے سید صاحب کی مردم گری کا درجہ بھی آشکارا ہو سکتا ہے۔ آپ کے ظہور سے پیشتر یہ لوگ انھیں مشاغل میں مصروف تھے جن میں لاکھوں دوسرے افراد کی زندگیاں بسر ہو رہی تھیں، لیکن آپ نے پانچ چھ سال میں ایسا گروہ پیدا کر دیا، جس کے نمونے یہاں ہماری صدیوں کی تاریخ میں بہت ہی کم ملیں گے۔ اس مردم گری کے مزید کمالات ان مجاہدین کے حالات میں پیش ہوں گے جن کے مختصر سے سوانح آئندہ ابواب کی زینت ہیں۔

[1] "منظورہ" صفحہ ۶۹۲۔

تیرھواں باب

پیر محمد قاصد کا ایک سفر

سید صاحب کے قاصد سید صاحب کے تمام قاصدوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ ان میں سے بعض پنجاب کے راستے ہندوستان آتے۔ جن شہروں اور قصبوں میں سید صاحب کے نیازمند اور مخلصین موجود ہوتے، ان میں ٹھہرتے اور پیغامات پہنچاتے ہوئے دہلی جاتے جو پیغامات اور وصول و ارسال زر کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ وہاں سے حسب ضرورت پورب اور ٹونک کا چکر بھی لگا لیتے۔ اسی راستے سے وہ واپس جاتے تھے۔ روپیہ دوسرے ذریعوں سے بھی دہلی پہنچ جاتا تھا۔ بعض اوقات قاصد بھی مختلف مقامات سے مجموعہ روپیہ لے کر دہلی پہنچاتے۔ وہاں شاہ محمد اسحاق ہنڈیاں تیار کرا دیتے یا کبھی کبھی روپوں کو اشرفیوں میں تبدیل کر کے کپڑے میں اس طرح سی دیا جاتا کہ کسی کو خبر نہ لگ سکے۔ پنجاب ہی کے راستے وہ واپس چلے جاتے۔ چونکہ ان کا لباس فقیرانہ اور سیدھا سادہ ہوتا اس لیے عموماً کسی مقام پر تعرض نہ کیا جاتا۔ بعض قاصد سرحد سے سندھ جاتے جہاں سید صاحب کے اہل و عیال پیرکوٹ میں مقیم تھے۔ پھر مارواڑ ہوتے ہوئے ٹونک پہنچتے۔ یہیں سے پلٹ کر سندھ ہوتے ہوئے یا سرحد چلے جاتے۔ میاں دین محمد کے ایک سفر کے متعلق بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک مرتبہ بنارس بلکہ اس سے بھی آگے تک ہو آئے تھے۔ بہرحال سید صاحب نے مخابرت و مکاتبت کا پختہ انتظام کر لیا تھا اور قاصد مقاصد اخفا کا بھی پورا خیال رکھتے تھے۔

پیر محمد قاصد ان معتبر قاصدوں میں سے ایک کا نام پیر محمد تھا، جو سید صاحب کے قیام سرحد کے دوران میں خدا جانے کتنی مرتبہ ہندوستان آیا اور واپس گیا۔ اس کے تمام سفروں کی کیفیت تو محفوظ نہیں۔ حسن اتفاق سے صرف ایک سفر کی تفصیلات روایات کے ذخیرے میں محفوظ رہ گئی ہیں، جنھیں اس غرض سے یہاں درج کیا جاتا ہے کہ اندازہ ہو جائے سید صاحب اور ان کے رفقا مشکلات و مصائب کے کیسے

خوفناک ہجوم میں اپنا دینی اور قومی فرض ادا کرتے رہے۔ یہ سفر ستمبر ۱۸۲۹ء میں شروع ہوا تھا اس لیے کہ میاں پیر محمد کا اپنا بیان ہے، اسے جنگ زیدہ میں فتح و کامرانی کا نامۂ بشارت دے کر بھیجا گیا تھا اور جنگ زیدہ ۴ یا ۵۔ ستمبر ۱۸۲۹ء کو ہوئی تھی ◆

بہر حال پیر محمد فقیرانہ بھیس میں سرحد سے چلا اور پنجاب سے گزر کر مظفر نگر میں مولوی خدا بخش میرٹھی کے پاس پہنچا جو انگریزی کچہری میں ملازم تھے۔ انھیں نامۂ فتح دکھایا اور وہ بہت خوش ہوئے۔ خط کی نقل رکھ لی۔ رخصت کے وقت سات سو روپے کی اشرفیاں اور تین سکھ کا ایک تھان سید صاحب کے لیے دیا۔ دس یا بیس روپے منشی محمدی انصاری کے لیے دیے جو سید صاحب کے میر منشی تھے۔ پیر محمد کو راستے کے خرچ کے لیے کچھ رقم دی ◆

مظفر نگر سے دہلی

مظفر نگر سے دہلی تک کے سفر کی اجمالی کیفیت ذیل میں درج ہے :

۱۔ مظفر نگر سے پیر محمد پھلت گیا اور مولوی وحید الدین سے ملا۔ ان کے بھائی حافظ قطب الدین چند ہی روز پیشتر سید صاحب سے رخصت لے کر آئے تھے۔ نامۂ فتح کی نقل انھوں نے بھی لے لی اور قاصد کو خرچ راہ بھی دیا ہوگا۔ روایت میں اس کا کوئی ذکر نہیں ◆

۲۔ پھلت سے پیر محمد میرٹھ پہنچا۔ وہاں شیخ محمد تقی اور شیخ عبداللہ سے ملا جو انگریزی فوجوں میں گوشت کے ٹھیکیدار تھے۔ ان کے علاوہ داروغہ محمد اعظم اور قاضی حیات بخش سے بھی ملاقات کی۔ آخر الذکر کے فرزند قاضی حمداللہ سید صاحب کے پرانے رفیقوں میں سے تھے اور جہاد کی غرض سے سرحد میں تشریف فرما تھے۔ ان حضرات نے بھی قاصد کو خرچ راہ دیا۔ قاضی صاحب نے اپنے فرزند کے نام ایک خط بھی حوالے کیا۔ چونکہ وہ بہت تنگ دست تھے اس لیے خرچ کے واسطے صرف ایک روپیہ پیش کر سکے ◆

میرٹھ سے رخصت ہو کر پیر محمد دہلی پہنچا اور شاہ اسحاق کی درسگاہ میں مقیم ہوا ◆

قیام دہلی

دہلی میں شاہ اسحٰق اور شاہ یعقوب سے ملاقات کی اور لشکر اسلام کے پورے حالات سنائے۔ شاہ اسماعیل نے ایک خط دیا تھا، وہ شاہ صاحبان کو پہنچایا۔ اس خط میں مولوی سید محبوب علی دہلوی کے متعلق کچھ سخت باتیں درج تھیں جو مجاہدین کا قافلہ لے کر سید صاحب کی خدمت میں پہنچے تھے لیکن بعض

ناگزیر تکالیف سے دل تنگ ہو کر واپس چلے آئے تھے۔ شاہ اسحاق نے وہ خط چھپا لیا۔ لیکن مولوی سید محبوب علی کو کسی ذریعے سے خبر مل گئی اور پیر محمد ملا تو اصرار کیا وہ خط لا کر دکھاؤ۔ چنانچہ پیر محمد نے شاہ اسحٰق سے خط لے کر مولوی صاحب کو دکھایا۔ پڑھ چکنے کے بعد انھوں نے کہا کہ شاہ اسمٰعیل کا کچھ قصور نہیں۔ دہلی کے مفسدوں نے جو مجھ سے عناد رکھتے ہیں، مجھ پر بہتان و افترا باندھ کر لکھے ہوں گے۔

پیر محمد نے مولوی محبوب علی کی معیت میں شاہ اسماعیل کی ہمشیر سے بھی جو پس پردہ تھیں، باتیں کیں اور حکیم مومن خاں سے بھی وہ ملا۔

سفرِ ٹونک پیر محمد دہلی سے ٹونک گیا جہاں اس زمانے میں سید صاحب کے بھانجے سید عبدالرحمٰن آئے ہوئے تھے۔ چنانچہ ان سے ملاقات کی۔ نامۂ فتح دکھایا۔ سید عبدالرحمٰن نے وہ خط نواب امیر الدولہ کو دکھایا۔ وہ بھی بہت خوش ہوئے۔ نواب وزیر الدولہ اس وقت سرونج میں تھے۔ ان سے ملنے کے لیے پیر محمد سرونج گیا اور بیس بائیس روز وہاں رہا۔ نواب وزیر الدولہ سید صاحب کے متعلق بار بار مختلف باتیں پوچھتے تھے۔ رخصت کے وقت تاکید کی کہ ہماری طرف سے حضرت کے ہاتھ پر بیعتِ امامت کرنا اور آپ کے لیے توشہ خانہ سے دو عمدہ چھریاں لیتے جاؤ۔ ان میں سے ایک کا دستہ شیر ماہی کا تھا اور دوسری کا سنگِ یشب کا۔

واپسی کی تیاری پیر محمد ٹونک سے دہلی آیا۔ شاہ اسحاق نے تین ہزار کی ہنڈی اور تین سو روپے کی اشرفیاں دیں۔ سات سو روپے کی اشرفیاں، جو خدا بخش میرٹھی نے دی تھیں پہلے سے ان کے پاس جمع تھیں۔ ان رقموں کی حفاظت کا مناسب انتظام کر کے واپسی کے سفر کی تیاری کر لی۔ عین اس وقت معلوم ہوا کہ پیر محمد کے ہندوستان آنے کی اطلاع رنجیت سنگھ کی حکومت کو مل گئی ہے اور کل حلیہ بھی بتا دیا گیا ہے۔ چنانچہ لاہور سے سکھ حکومت کے مختلف کارندوں کو حکم بھیج دیے گئے کہ اس حلیے کا آدمی جہاں ملے گرفتار کر لیا جائے۔ حکومتِ پنجاب کے وکیل دہلی کے پاس بھی یہ حکم آیا۔ اس سے یہ ذکر سن کر ایک مخلص نے شاہ اسحٰق تک اطلاع پہنچائی۔ پیر محمد خود کہتا ہے:

میں سفر میں فقیرانہ لباس رکھتا تھا۔ میرے پاس بڑے بڑے دانوں کی ایک تسبیح،

ایک روئی دار میرزئی اور ایک پانی بھرنے کی ڈور تھی اور ایک تونبا تھا اور ایک دوہرا کرتا اور ایک دوپٹا ۔

سفر مراجعت اور گرفتاری خطرے کا علم ہو چکا تھا لیکن پیر محمد کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ پنجاب ہی کے راستے واپس جاتا چنانچہ خدا پر بھروسا کرتے ہوئے چل پڑا۔ ہر روز پچیس تیس کوس کی منزل طے کرتا ہوا دریائے ستلج کو عبور کر کے کپور تھلہ پہنچا۔ اس سفر میں چھ دن گزر گئے۔ ایک روز کپور تھلہ میں ٹھہر کر چلا اور دریائے بیاس عبور کیا۔ وہاں تین آدمی مل گئے جن کا بیان یہ تھا کہ وہ سید صاحب کے پاس جا رہے ہیں۔ ایک رات جنڈیالہ میں گزری۔ اگلے روز امرتسر پہنچے اور ایک مسجد میں قیام کیا۔ اگلے سفر میں سے ایک جگہ عبور دریائے راوی کا ذکر ہے اور دوسری جگہ امین آباد میں قیام کا۔ پیر محمد کہتا ہے کہ میں کھانا نہیں کھاتا تھا۔ جیسے میری وضع قطع اور فقیرانہ لباس سے کوئی مناسبت نہ تھی۔ ایک مسلمان دکاندار نے یہ کیفیت دیکھی تو سمجھا کہ یا تو میرے پاس دست غیب ہے یا میں کیمیا گر ہوں۔ چنانچہ اس نے اصرار کیا کہ مجھے بھی کوئی تبرک عنایت فرمائیے۔ پیر محمد نے کہا کہ سو بار سورۂ فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھا کرو۔ خدا روزی میں برکت دے گا ۔

امین آباد سے پیر محمد اور ساتھی گجرات اور کھاریاں ہوتے ہوئے جہلم پہنچے۔ وہاں راستے میں دو سوار مل گئے، انھوں نے پیر محمد کی طرف غور سے دیکھا اور اپنے ایک سوار سے کہا کہ اسے اپنے ڈیرے میں لے چلو ۔

تلاشی اور قید پیر محمد کا بیان ہے کہ میں ڈیرے پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ سوار شاہ میر خاں آفریدی کے رسالے کے ہیں۔ ان لوگوں نے بھی مجھے پہچان لیا اور بہت متاسف ہوئے کہ بھائی بہت بے وقت پہنچے ہو۔ شاہ میر خاں وہاں موجود نہ تھے اور لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں نے چاہا کہ اپنی رقمیں، ہنڈی اور خطوط انھیں دے دوں۔ اس اثنا میں ایک سکھ سوار مجھے ساتھ لے جانے کے لیے آگیا اور میں کوئی شے بھی اپنے سے جدا نہ کر سکا۔ تلاشی میں ساری چیزیں نکل آئیں۔ مجھے زد و کوب بھی کیا گیا۔ بالآخر ایک ڈیرے میں قید کر دیا گیا ۔

وہاں سے لاہور روانہ ہوئے۔ مجھے بھی پابہ زنجیر ساتھ لے لیا۔ میں نے ہر چند کہا کہ میں قاصد ہوں مجھے

کیا معلوم لوگ خطوں میں کیا کچھ لکھتے ہیں، میں تو خط پہنچانے کا ذمہ دار ہوں۔ ونتورا نے کہا کہ سب کچھ سچ سچ بتا دو ورنہ تمھیں پھانسی کی سزا دوں گا۔

حالاتِ اسیری لاہور پہنچے تو پیر محمد کو انارکلی کی چھاؤنی میں قید رکھا گیا۔ اس کا بیان ہے کہ ایک جنگی کو میرا ساتھی بنا دیا گیا۔ اس میں مجھے نماز کی سخت تکلیف تھی۔ ونتورا سے ایک روز میں نے شکایت کی تو اس نے سکھوں کو سخت سست کہا چنانچہ یہ مصیبت رفع ہو گئی۔ کھانا مجھے اچھا نہ ملتا تھا لیکن ایک شخص رحمو "نرم نواز" تھا۔ اس نے اپنے ہاں سے میرے لیے کھانا مقرر کر دیا۔ پھر مجھے وزیر سنگھ کے پاس بھیجا گیا جو ایک مرتبہ سید صاحب کے پاس سفیر بن کر آ چکا تھا اور آپ کا بہت احترام کرتا تھا، بلکہ سید صاحب کے حلقے کا خیال تھا کہ خفیہ خفیہ مسلمان ہو چکا ہے۔ وزیر سنگھ نے چوکی پہرا موقوف کر دیا۔ پیر محمد صرف بیڑی پہنے ہوئے رہتا تھا اور وزیر سنگھ کے ہاں سے اسے نفیس کھانا بھی مل جاتا تھا۔

وہیں سید انور شاہ امرتسری سے ملاقات ہوئی جو سفرِ ہجرت میں سید صاحب کے ساتھ تھے اور واقعہ بالاکوٹ تک ساتھ رہے، پھر انھیں سید صاحب نے واپس بھیج دیا۔ وزیر سنگھ نے کچھ مدت بعد پیر محمد کو کوتوالی میں بھیج دیا اس زمانے میں خدا بخش نام ایک شخص کوتوال تھا۔ اس نے پیر محمد سے بہت اچھا سلوک مرعی رکھا۔ یہاں تک کہ عام قیدیوں کی رپورٹ میں اس کا ذکر ہی نہ کرتا تھا کہ مبادا کوئی غیر مناسب حکم اس کے متعلق جاری ہو جائے۔ اسیری ہی کے زمانے میں یہ خبر ملی کہ سید صاحب نے مایار کی لڑائی میں درانیوں کو شکست دی، وہ پشاور میں داخل ہو گئے۔ چند روز بعد پیر محمد کو رہا کر دیا گیا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ پیر محمد کی گرفتاری اور اسیری کی خبر ہندوستان میں بھی پہنچ گئی تھی۔ و حکیم مغیث الدین سہارن پوری نے بیگم سمرو سے کہہ کر ونتورا کو ایک خط لکھوایا کہ پیر محمد کو رہا کر دیا جائے۔ خود ان سلطانوں نے بھی رہائی کے لیے کوششیں کی ہوں گی جو سید صاحب سے عقیدت و ارادت رکھتے تھے اور پیر محمد کے حالات سے آگاہ ہو چکے تھے۔

رہائی کے بعد رہائی کے بعد پیر محمد لاہور ہی میں تھا کہ خبر ملی سید صاحب نے سلطان محمد خاں درانی

سے عہد و پیمان کے بعد پشاور اس کے حوالے کر دیا ہے۔ سید نور شاہ بھی ان دنوں لاہور ہی میں مقیم تھے۔
کچھ مدت پیر محمد نے ان کے پاس گزاری۔ وہ خود کہتا ہے :

وہ (سید نور شاہ) بڑے نامی شخص تھے۔ بہت لوگ ان کے مرید اور معتقد تھے اور
وہ عجیب خوش طبع اور بے تکلف اور صاف گو آدمی تھے۔ امیروں میں امیر، غریبوں میں غریب،
درویشوں میں درویش، بڈھوں میں بڈھے، جوانوں میں جوان۔ سیدوں میں سید، لڑکوں
میں لڑکے، اور پنجاب میں ان کی قدر و منزلت ہر کسی کے روبرو تھی۔ یہاں تک کہ سکھ لوگ بھی
ان کی عزت و توقیر کرتے تھے، اور جس کو وہ سخت سست کہتے تھے کوئی برا نہ مانتا تھا۔[۱]

اسی زمانے میں درانیوں اور بعض سرداروں نیز خوانین سمہ کی سازش سے مجاہدین کے جا بجا شہید ہونے کی
دردناک خبریں ملیں، لہذا سید نور شاہ نے پیر محمد کو مشورہ دیا کہ اب سرحد جانے کے بجائے تحقیق حال تک
یہیں رہنا چاہیے۔

لاہور سے دہلی چنانچہ پیر محمد لاہور سے ہندوستان روانہ ہو گیا۔ سات آٹھ روز سہارنپور میں حکیم
مغیث الدین کے مکان پر رہا۔ انھوں نے رخصت کے وقت خرچ راہ دیا۔ پھر پیر محمد پانی پت میں شیخ محمد تقی اور
شیخ عبداللہ کے پاس پہنچا۔ میرٹھ شہر میں قاضی حیات بخش سے ملاقات کی اور دہلی پہنچ گیا۔

اہل سمہ کی سازش اس کے المناک نتائج اور پنجتار سے سید صاحب کی ہجرت کے متعلق اطلاعات دہلی
پہنچ چکی تھیں۔ پیر محمد بہرحال واپس جانے پر مصر تھا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ بے شک چلے جاؤ لیکن ہم کوئی رقم
یا ہنڈی اس وقت تک نہیں بھیج سکتے جب تک قطعی طور پر معلوم نہ ہو جائے کہ سید صاحب نے کہاں
اقامت اختیار کی ہے۔ غرض پیر محمد دہلی سے دوبارہ سرحد کی طرف نکل پڑا، صرف پچاس روپے پاس تھے۔

دوسرا سفر دہلی سے روانگی کے بعد شاملی میں قیام کا ذکر ہے۔ جہاں کا نور بخش جراح لشکر اسلام میں
تھا۔ ان کے مکان سے قریب ایک مسجد تھی جس میں پیر محمد ٹھہرا۔ نور بخش کے باپ اور بھائیوں سے ملاقات کی۔
وہاں قصبہ بڑلی کے امداد علی خاں تحصیل دار تھے۔ پیر محمد ان سے بھی ملا۔ انھوں نے مسجد سے اٹھوا کر اپنے ہاں

[۱] وقائع احمدی جلد آخری ص ۱۳۱۔

ٹھہرالیا۔ وہاں چند پٹھان کام کر رہے تھے۔ تحصیلدار سے کہہ کر ان سے لکڑی کا ایک کشتی نما پیالہ تیار کرایا جس کے پیندے میں روپے رکھنے کے لیے ایک خانہ بنوالیا اور روپے رکھ کر اس پر ڈاٹ لگادی۔ پھر مرتسر ہوتا ہوا گجرات پہنچا، جہاں سے سیالکوٹ اور کشمیر کا راستہ اختیار کر لیا اس لیے کہ عام افواہ یہ تھی سید صاحب کشمیر کی طرف تشریف لے گئے ہیں۔

ایک سید کی شفقت: پیر پنجال سے دو ڈھائی کوس ورے خان پور نام ایک مقام تھا۔ پیر محمد وہاں کی مسجد میں اترا۔ ایک کشمیری آیا اور اس نے کہا کہ یہاں سے اٹھ جاؤ۔ پیر محمد وہاں جا نہ کچھ دیر بعد وہ کشمیری دوبارہ آیا اور پیر محمد کو اپنے ہاں کے ایک سید کے پاس لے گیا۔ اس نیک بخت نے پیر محمد کو اپنے پاس ٹھہرالیا۔ کھانا کھلایا، تنہائی میں پوچھا کہ اپنا حال سچ سچ بتا دو۔ جب معلوم ہوا کہ پیر محمد سید صاحب کا قاصد ہے تو اس کی دلداری اور تواضع میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ یہ بھی بتایا کہ ہمیں جو خبریں مل رہی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب پکھلی میں ہیں۔ شاہ اسماعیل لشکر لے کر بالاکوٹ پہنچے ہوئے ہیں اور مولوی خیر الدین شیرکوٹی مظفر آباد میں ہیں۔ چار پانچ روز کے بعد اس سید نے پیر محمد کے لیے اون کے پاتابے اور گھاس کی چپلی تیار کرا دی جس کے بغیر برفستانی علاقے میں سے گزرنا مشکل تھا۔

ایک فقیر کی دغابازی: پیر پنجال کی چڑھائی میں ایک فقیر اور ایک کشمیری پیر محمد کے ساتھی بن گئے۔ پہاڑ سے گزر جانے کے بعد ایک گوجر کے مکان میں ٹھہرے اور روٹی پکوائی۔ ساتھی فقیر نے پیر محمد کے آٹے میں کوئی نشہ آور چیز ملادی جسے کھاتے ہی آہستہ آہستہ غفلت طاری ہوگئی۔ کمر میں جو تھیلی بندھی ہوئی تھی اس میں چار پانچ روپے تھے، وہ فقیر نے کھول لی اور پیر محمد کا ہاتھ پکڑ کر ایک نالے پر چھوڑ گیا جو کوس سوا کوس پر تھا۔ سارا اسباب خود لے گیا۔

کشمیری کی مہربانی: تین روز نالے پر گزرے۔ پھر ہوش آیا تو ایک بستی میں پہنچا۔ ایک مسلمان کشمیری سے اشارۃً کہا کہ میں بھوکا ہوں۔ اس نے روٹی ... تھی، وہ شہد لاکر پیش کیا۔ ہوش ٹھکانے ہوئے تو اس کشمیری سے کہا کہ بھائی میں بے یارومددگار ہوں۔ کوئی ایسی جگہ بتادو جہاں آٹھ دس روز گزار لوں۔ جسم میں کچھ طاقت آجائے تو چلا جاؤں۔ کچھ کھانا دے دیا کرو گے تو مہربانی ہوگی ورنہ تم پر کچھ الزام نہیں۔ اس

دردمند شخص نے ایک موٹا کمبل اوڑھنے کے لیے دے دیا اور ایک جگہ بتا دی جہاں کونڈوں اور تکیوں کا انتظام کر دیا۔ پھر نوکروں کو تاکید کر دی کہ جو کچھ چاہیے ان شاہ صاحب کو کھلا دیا کرو۔

دغاباز فقیر کی تلاش: وہاں کا حاکم رام پور کا پٹھان تھا۔ کشمیری نے اس سے ذکر کیا تو پیر محمد کو بلوا لیا گیا۔ سارے حالات سنے۔ سپاہی بھیجے کہ اس فقیر کو تلاش کریں۔ گوجروں سے پتہ چلا کہ وہ دور کی کوہ کی بستیوں میں رہتا ہے۔ پہلے اس کے متعلقین پکڑے آئے۔ پھر وہ فقیر بھی گرفتار ہو کر آیا۔ پیر محمد نے حاکم کو بتا دیا کہ میرا سارا اسباب یہ لے گیا ہے۔ چالیس روپے تو کشتی نما پیالے میں تھے۔ پانچ روپے میری تھیلی میں تھے۔ حاکم نے کہا چند روز ٹھہر جاؤ تو ہر چیز مل جائے گی۔ لیکن پیر محمد کو قوت بحال ہوتے ہی یہ اضطراب پیدا ہوا کہ جلد سے جلد سید صاحب کی خدمت میں پہنچ جائے۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی ٹھہرنا دوبھر ہو گیا۔

آخری منازل: چنانچہ وہ دوسرے روز چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ کشمیری نے ناشتے کے لیے کچھ روٹیاں پکوا دیں اور دو روز کا آٹا دے دیا۔ ایک شخص پشاور جا رہا تھا اور وہ راستے سے خوب واقف تھا۔ اس کا ساتھ ہو گیا۔ راستے میں ایک گہرا نالا ملا جس پر لکڑی کا پل بنا ہوا تھا۔ منزل بمنزل مظفر آباد پہنچا۔ اس سے پیشتر مولوی خیر الدین مظفر آباد سے جا چکے تھے اور سکھوں کی عملداری پہلے کی طرح بحال ہو چکی تھی۔[1]

اس کے بعد پیر محمد نے متعدد بستیوں کا ذکر کیا ہے جن کے نام درج نہیں اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ کس راستے سے بالاکوٹ گیا لیکن اس نے تکلیفیں بہت اٹھائیں۔ دو وقت سڑک کے قریب سے کچا ساگ کھا کر گزارہ کیا۔ اپنی سپر زری ایک شخص کو دے کر بالاکوٹ کا رہبر بنایا اور اس زمانے میں بالاکوٹ پہنچا جب شاہ اسماعیل سید صاحب کی طلب پر بالاکوٹ سے پکھلی جا چکے تھے اور شیخ بلند بخت بالاکوٹ والے لشکر کے افسر تھے۔ پیر محمد بالاکوٹ سے پکھلی جانا چاہتا تھا لیکن شیخ بلند بخت نے روک لیا کہ حضرت خود چند روز میں یہاں آنے والے ہیں۔

غور طلب نکتے: یہ صرف ایک سفر کی کہانی ہے۔ خدا جانے ان قاصدوں نے مسلسل سفروں میں

---

[1] روایت کا یہ حصہ [illegible]

کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں، لیکن اپنا کام وہ اس انداز میں انجام دیتے رہے گویا یہ ایک اہم دینی فرض تھا۔ سید صاحب کا کمال یہ ہے کہ ہر کام کے لیے صحیح موزوں آدمی انتخاب فرما لیتے تھے۔ پھر ان قاصدوں کی شان دیانت ملاحظہ فرمائیے کہ جو رقم سید صاحب کے لیے دی جاتی تھی، اس میں سے ایک حبّہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہ کرتے تھے۔ ذاتی تکالیف کی نفس نے کبھی پروا نہ کی، ہمیشہ یہ امر پیش نظر رہتا تھا کہ جو کام امام نے انھیں سونپا ہے اسے احسن طریق پر جلد از جلد پورا کر دیں۔ ان تمام برکات کا سرچشمہ یہ تھا کہ سید صاحب کی پوری تحریک دینی تھی اور جو اصحاب بھی اس میں شامل ہوئے، خواہ وہ کسی کام پر لگائے گئے، اسے کارِ حق سمجھ کر پورا کرتے تھے اور ہر قسم کی دنیاوی مشقتیں اس لیے خوشی خوشی برداشت کرتے تھے کہ بارگاہ باری تعالیٰ سے اجر و ثواب پائیں گے۔ دنیوی منافع کے خیال سے بھی ان کا دامن طلب کبھی آلودہ نہ ہوا۔

شہید و غازی و تیغ محمد　　امام و سید السادات احمد

شریعت را رسید از وے رواجے　　طریقت یافت بر سر طرفہ تاجے

بشست از ملک ہندستاں رشادش　　سواد شرک و بدعت از سوادش

بہ ملک سکہ چو تیغ او علم شد　　سر ہر سرکشش از دستش قلم شد

بہ دار الضرب دیں زد سکہ زانساں　　کہ رفت از ہند شورش تا خراساں

چو از ذوق شہادت تشنہ لب بود

بجامش یافت بشد خوش رفت و آسود

دوسری نظم | سید عبدالرزاق حسنی حسینی متخلص بہ کلامی رائے بریلی کے باشندے تھے اور ٹونک میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ انھوں نے صمصام الاسلام یا مجاہدات الاخیار کے نام سے فتوح الشام کو نظم کیا تھا۔ اس میں حمد، نعت، مناقب اصحاب و اہل بیت و مناقب سید عبدالقادر جیلانیؒ کے بعد حضرت شمس العارفین امام المجاہدین مجدد مائۃ ثالث و عشر سیدنا و مرشدنا و مولانا جناب سید احمد غازی و شہید کے مناقب یوں لکھتے ہیں:

قلم کو ہیں میرے ہزار افتخار　　کہ لکھتا ہے وصف شہ نامدار

شہ منصب سیادت احمد بنام　　سپہر ہدایت کے ماہ تمام

وہ تھے نور چشم امام رسلؐ　　وہ تھے عاشق ذات جز و کل

وہ ساقی جام شراب طہور　　فرشتہ بہ سیرت تھے صورت میں نور

عیاں شان سے ان کے تھی شان حق　　کہ مخلص جو تھے ان کے قربان حق

نہیں ہند میں کوئی شہر و دیار　　کہ مخلص نہ ہوں ان کے واں بے شمار

عنایت سے جس پر نظر ڈال دی　　وہیں ہو گیا بس وہ کامل ولی

وہ امّی تھے ایسے کہ عالم بڑے　　ہوئے مستفیض اور خادم رہے

وہ تھے اہل حق اور فنائی الرسولؐ　　گریزاں تھے ان سے ظلوم و جہول

یہی اب تو کچھ آ گیا ہے خیال　　کہ گردن کشوں کو کروں پائمال

بہت کوشش و جاں نثاری کروں　　کہ شرع پیمبر کو جاری کروں

دکھا دوں بس انجام الحاد کو　　نہ چھوڑوں کہیں نام الحاد کا

نہ کیونکر ہوں اس کام میں ناشکیب　　ظہور امام زماں ہے قریب

وہ خضر طریق رسول خدا　　کہ سایے سے جس کے مخجل ہما

زہے سید احمد قبول خدا　　سر امتحان رسول خدا

نکو گوہری کا نہ پوچھو شرف　　علیؓ و حسینؓ و حسنؓ کا خلف

رہے حشر تک زندہ وہ نیک ذات　　ہے کفار کی موت اس کی حیات

خدا نے مجاہد بنایا اسے　　سر قتل کفار آیا اسے

دم اس دست و بازو پہ دیوے اجل　　لب تیغ کے بوسے لیوے اجل

اجل میں ہمیشہ رواں ہو ظفر

رکاب اس کی پکڑے رواں ہو ظفر

کہوں کیا ہوا ہے امامت کا اوج　　کہ ہیں غوث و ابدال سب اہل فوج

خبردار ہو جاؤ اے اہل دل　　کہ رحمت برستی ہے اب متصل

ہوا مجتمع لشکر اسلام کا　　اگر ہو سکے وقت ہے کام کا

خبردار ایسے مجمع میں ہو شریک　　کہ خوش تم سے ہو وحدہٗ لاشریک

جو داخل سپاہ خدا میں ہوا　　فدا جی سے راہ خدا میں ہوا

حبیب حبیب خداوند ہے　　خداوند اس سے رضامند ہے

امام زمانہ کی یاری کرو

خدا کے لیے جاں نثاری کرو

سمجھ لو جو کچھ بھی ہے تم کو تمیز　　زبان آفریں سے کروں جاں عزیز

میں لکھے تھے۔ یہ کتاب دساتیری فارسی میں لکھ کر نواب وزیر الدولہ کی خدمت میں پیش کی گئی تھی۔ مجھے اس کا ایک قلمی نسخہ اپنے عزیز دوست خلیل الرحمٰن صاحب داؤدی کے پاس دیکھنے کا موقع ملا۔ جو غالباً اصل کتاب کا واحد نسخہ تھا اس میں سید صاحب کے متعلق مرقوم ہے:

تابش گوہر خدا دانی	رہبر جمسار یزدانی
سرور آگہان راز نہان	پیشوائے ستودگان جہان
سید احمد گزیدۂ دادار	تحفۂ پاک احمد مختار
مصطفیٰ را ستودہ فرزندے	مرتضیٰ را گزیدہ دل بندے
دل نہ بستہ درین نشیمن تنگ	پا فشردہ براہ ایزد پاک
یادگار گزیدگان خدا	پیشوائے رسیدگان خدا

سرمۂ چشم دل ز خاکش باد

مہر یزداں بہ جان پاکش باد

حصہ دوم
مجاہدین و رفقاء

پہلا باب

مولانا عبدالحی

عبدالحی بن ہبۃ اللہ بن نوراللہ۔ وطن بڈھانہ ضلع مظفر نگر۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے آپ کے دوگونہ رشتے کا بھی سہو ہے۔ قول یہ کہ مولانا عبدالحی کی پھوپھی شاہ صاحب کی اہلیہ تھیں دوسرے شاہ صاحب کی ایک صاحبزادی کی شادی مولانا عبدالحی سے ہوئی۔ غلب ہے کہ پھلت والوں کی طرح مولانا کے خاندان کی رشتہ داریاں بھی پہلے ہی سے شاہ صاحب کے خاندان سے ہوں۔ شاہ صاحب کی صاحبزادی مولانا کے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ تعلیم دلی ہی میں خود شاہ صاحب اور ان کے بھائیوں سے پائی۔ چونکہ بہت قریبی رشتہ دار تھے اس لیے شاہ عبدالعزیز بہت شفقت فرماتے تھے اور مولانا عبدالحی اپنے علم و فضل اور زہد و تقوی کے باعث زیادہ سے زیادہ شفقت کے مستحق تھے۔ مولانا نسباً صدیقی تھے۔ "ابجد العلوم" میں مولانا عبدالحی مرحوم ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں سے فقہ حنفی مولانا سے بہتر کوئی نہ جانتا تھا اور درسیات میں بھی ان سے زیادہ ماہر کوئی نہ تھا۔[1]

ملازمت انگریزوں کو ابتدائے حکومت میں اس بات کی بڑی خواہش و جستجو تھی کہ خاندانی اور ذی وجاہت علماء افتاء و صدارت کے مناصب قبول کریں تاکہ شمالی ہند میں انگریزی حکومت عوام کے نزدیک مقبول ہو سکے۔ چنانچہ میرٹھ میں مفتی عدالت کا عہدہ خالی ہوا تو کوشش کی گئی کہ شاہ عبدالعزیز مولانا عبدالحی کو یہ عہدہ قبول کر لینے کی اجازت دے دیں۔ انھوں نے اجازت دے دی۔ یوں کچھ مدت تک مولانا عبدالحی میرٹھ میں مفتی عدالت بھی رہے۔

بیعت سید صاحب نواب امیر خاں کا ساتھ چھوڑ کر دہلی آئے اور جہاد فی سبیل اللہ کے لیے ایک

---

[1] "ابجد العلوم" صفحہ ۹۱۲۔

مستقل جماعت کی تیاری کا انتظام کرنے لگے تو مولانا عبدالحی و سید صاحب سے نسبت فیض کا موقع ملا جس کی کیفیت سیرت سید احمد شہید میں تفصیل کی جا چکی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا عبدالحی نے شاہ عبدالعزیز کے مشورے کے مطابق سید صاحب سے نماز حضور قلب کے متعلق سوال کیا۔ سید صاحب نے فرمایا مولانا! اس نیت سے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ چلئے ہمارے پیچھے دو رکعت نماز پڑھیے۔ اس کے بعد مولانا نے بیعت کی اور شاہ اسمٰعیل کی بیعت کی ترغیب سے سید صاحب کے مرید ہوگئے۔[1]

نواب وزیر الدولہ نے وصایا میں اس واقعہ کو یوں بیان کیا ہے کہ مولانا نے صحابہ کرامؓ کی نماز کا تتبع ظاہر کیا تھا۔ سید صاحب نے ترکیب بیان فرمائی۔ مولانا نے نماز عشاء کے بعد اسی ترکیب کے مطابق دو رکعت نفل کی نیت باندھی۔ سید صاحب حجرے کے دروازے پر بیٹھ گئے۔ مولانا نے پوری رات انہیں دو رکعتوں میں گزار دی۔ اس وقت سے سید صاحب کے ساتھ ایسی عقیدت اور وہ یقین پیدا ہوا، جو ہمیشہ استقامت نصیب ہوئی کہ جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔[2]

مولانا فرمایا کرتے تھے کہ خدا نے مجھے ایسے شیخ کی خدمت میں پہنچایا گویا حضرت خضر کی زیارت نصیب ہوئی لیکن مجھے ان سے اس کے سوا کوئی غرض نہیں کہ اپنے لیے دعا کراؤں۔[3]

رفاقت مولانا جب سے مرید ہوئے سید صاحب کی رفاقت نہ چھوڑی۔ سفر و حضر میں اکثر ساتھ رہے سفر حج میں بھی ساتھ تھے اور سید صاحب کے ساتھ جہاز میں حجاز پہنچے تھے۔ اسی سفر میں یمن کے مشہور محدث قاضی محمد بن علی شوکانی سے سماع حدیث کی سند لی اور ان کی کتاب "موضوعات" مولانا ہی ہندوستان لائے۔ درس و تدریس، احیائے سنن اور ترغیب جہاد میں مسلسل وعظ فرماتے رہے۔ وعظ کا آغاز مدرسے میں ہوا تھا۔ جب لوگ بکثرت شامل ہونے لگے تو شاہی مسجد میں اجتماع ہونے لگا۔ مولانا رشید الدین مرحوم سے بدعات و محدثات کے متعلق آپ کا اور شاہ اسمٰعیل کا ایک مناظرہ بھی ہوا تھا، جس کی روداد آپ نے مرتب فرما دی تھی۔[4]

---

[1] سید احمد شہید جلد اول صفحہ [illegible]۔ [2] "وصایا" حصہ دوم صفحہ [illegible]۔ [3] ایضاً صفحہ [illegible]۔

[4] ترجمہ علمائے اہل حدیث صفحہ [illegible]۔

بیان کیا جاتا ہے کہ معترضوں کی طرف سے مولانا رشید الدین ستر سوال مرتب کر کے لائے تھے۔ وہ پیش ہوئے تو مولانا عبدالحی نے فرمایا:

طرزے مخص نیستم سپاہی گری ہم دانم۔	میں نرا ملا نہیں سپاہ گری بھی جانتا
اگر باساز و تفنگ گراں بار قطع یک منزل راہ	ہوں۔ اگر ہتھیار، بندوق اور گولی بارود لے کر
پیادہ پا نمودہ باشم و تعب اش در من گیرد حال	ایک منزل پیادہ طے کر کے آؤں اور تکان کے
من باشد و در آں وقت نیز گر سوالات پیش	باعث چور چور ہو جاؤں۔ اس وقت بھی جو سوالات
خواہید شد۔ بتائید تعالیٰ جواب باصواب	پیش کرو گے، خدا کی مدد سے ان کا شافی جواب
خواہید یافت۔	پاؤ گے۔

ہجرت مولانا سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے نکلے تھے۔ نواب وزیر الدولہ فرماتے ہیں کہ ٹونک پہنچنے کے بعد مولانا سے موصوف نے حاجی احمد اور مولانا عبدالقدوس کو مریدوں کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر فرما دیا۔ میرا خیال ہے کہ انھیں بعض انتظامات کی تکمیل کے لیے روک دیا تھا۔ مولانا کو سید صاحب سے مفارقت گوارا نہ تھی، لیکن حکم کی بنا پر ٹھہر گئے۔ تاہم ہر وقت انتظار رہتا کہ سید صاحب کب بلاتے ہیں۔ پانچ مہینے گزر جانے کے بعد سید صاحب کی طرف سے نامۂ طلب صادر ہوا۔ مولانا نے فوراً سفر کا سامان تیار کیا اور روانہ ہو گئے۔ اگرچہ پرانی بیماریوں کے باعث بہت کمزور ہو گئے تھے، لیکن سید صاحب سے ملاقات کے شوق نے سب کچھ بھلا دیا۔ راستہ چلتے چلتے رفیقوں سے الگ ہو جاتے۔ سید صاحب کا خط نکال کر پڑھتے تو بے اختیار رقت طاری ہو جاتی۔ پھر شوق کی گرمجوشی سے تیز چلنے لگتے۔ جو شخص سامنے آتا، کہتے: مجھے سید صاحب نے طلب فرمایا ہے۔ غرض اسی حال میں لمبا سفر طے کیا، جیسے عاشق محبوب کی خدمت میں جاتا ہے۔ سید صاحب سے ملاقات کے بعد دوستوں کو جو خط لکھا، اس میں مرقوم تھا:

مجھ پر وہی حالت طاری ہوئی جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے وقت مومن کو جنت میں غوطہ دیا جائے گا اور اس نے زندگی بھر جو مصیبتیں اور مشقتیں برداشت کی ہیں، ان کا رنج و ملال جان و تن سے دھل جائے گا۔

سفر کا راستہ | مولانا تھا نیسر، مالیر کوٹلہ، ممدوٹ اور بہاول پور ہوتے ہوئے سرحد پہنچے تھے۔ مسافت کے طول اور مشقتوں کو مدنظر رکھیں تو مولانا کی شانِ عزیمت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ **اس کی سرسری** کیفیت یہ ہے کہ نواح بہاول پور سے شکار پور تک کا پورا علاقہ زیرِ آب تھا۔ دس روز کی مسافت چھتیس روز میں طے کر کے بہاول پور سے شکار پور پہنچے۔ پھر بھاگ، حاجی، شکھڑی ہوتے ہوئے براہِ بولان قندھار گئے۔ بیماری کے باعث وہاں تقریباً ڈیڑھ مہینہ ٹھہرے رہے۔ قندھار سے ۸۔شوال کو کابل، ۱۰۔ کو جلال آباد پہنچے۔ پھر پشاور کا راستہ چھوڑ کر ممند اور باجوڑ کے مواضع میں سے ہوتے ہوئے چار باغ واقع سوات میں سید صاحب سے ملاقی ہوئے۔ شدید سردی اور برف باری کا موسم کچھی (بلوچستان) میں گزارا۔ انھیں کے سفرِ ہجرت کو مولوی محمد جعفر مرحوم تھانیسری نے غلطی سے سید صاحب کا سفرِ ہجرت قرار دے لیا حالانکہ سید صاحب دوسرے راستے سے گئے تھے۔

یہ اوائل ذی الحجہ ۱۲۴۲ھ (اواخر مئی ۱۸۲۷ء) کا واقعہ ہے۔ سید صاحب کے ساتھ پنجتار گئے۔ جب انھوں نے درانی سرداروں کی مخالفانہ تدبیروں کو ختم کرنے کی غرض سے خہر (سوات) میں قیام ضروری سمجھا تو مولانا بھی ساتھ گئے۔

وفات | بہت بوڑھے ہو چکے تھے، پھر بواسیر کا شدید دورہ ہوا۔ "وقائع" کا بیان ہے کہ کوئی دوا مفید نہ پڑتی تھی، اور بیماری بڑھتی جاتی تھی، یہاں تک کہ مولانا پر نزع کی حالت طاری ہوگئی:

> کسی وقت آپ بے ہوش ہو جاتے تھے اور کسی وقت ہوش میں آتے تھے۔
>
> آپ کا یہ حال سن کر حضرت علیہ الرحمۃ (سید صاحب) تشریف لائے۔ جب مولانا صاحب کو ہوش آیا، حضرت کو دیکھا اور پہچانا۔ حضرت نے پوچھا کہ اس وقت کیا حال ہے؟ کہا، نہایت تکلیف ہے۔ آپ میرے واسطے دعا کریں اور میرے سینے پر اپنے قدم دھریں کہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس مصیبت سے مجھ کو نجات دے۔ آپ (سید صاحب) نے فرمایا: مولانا صاحب! آپ کے سینے میں علم قرآن و حدیث کا گنجینہ ہے۔ یہ اس قابل نہیں کہ میں اس پر قدم رکھوں۔ پھر آپ نے بسم اللہ کر کے اپنا دست مبارک رکھا۔ مولانا صاحب

کو قدرے تسکین ہوئی اور کئی بار اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ، اللّٰھم الرفیق الاعلیٰ اپنی زبان سے کہا اور یہی کہتے کہتے انتقال فرمایا۔

شعبان ۱۲۴۳ھ کی آٹھویں تاریخ تھی (۲۳-۲۴ فروری ۱۸۲۸ء) اور انتقال رات کے وقت ہوا تھا۔ اگلے دن صبح کے وقت شاہ اسمٰعیل، مولوی محمد حسن رام پوری، قاضی علاؤ الدین پھلتی، میاں جی نظام الدین چشتی اور میاں جی محی الدین غسل میت میں مصروف ہو گئے۔ سید صاحب مولانا کے فضائل و محاسن بیان کرتے رہے۔ آپ نے فرمایا: مولانا دین کے ایک رکن تھے اور بڑی برکت والے شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اٹھا لیا، جو مرضی مالک کی۔ آنکھوں سے برابر آنسو بہ رہے تھے۔ جنازہ اٹھانے والوں میں خود سید صاحب بھی تھے۔ آپ ہی نے نماز جنازہ پڑھائی جس میں اہل شہر کے علاوہ تقریباً سات سو مجاہدین شریک تھے۔ شہر کے جنوب مشرق میں ایک تیر کے فاصلے پر قبرستان تھا جہاں لشکرِ اسلام کے اس نائب شیخ الاسلام کو دفن کیا گیا۔ آج کل یہ مزار "ملّجی بابا" کا مزار کہلاتا ہے۔

تربیت کا عمدہ نمونہ | مولانا عبدالحی سید صاحب کی دینی تربیت کے کمال کا ایک نہایت عمدہ نمونہ تھے۔ علم و فضل، بڑھاپے، ضعف و ناتوانی، وطن، اہل و عیال اور عزیزوں سے بالکل بے پروا ہو کر رضائے باری تعالیٰ کے ابتغا میں سرحد پہنچ گئے اور اسی حالت میں مالک حقیقی سے جا ملے۔ رضائے حق کا یہ جذبہ سید صاحب ہی کی تربیت و صحبت کی بدولت بیدار ہوا۔

مولانا نے وفات سے پیشتر ایک وصیت نامہ لکھوا دیا تھا جس میں تمام چیزیں اپنی دوسری اہلیہ (والدۂ مولانا عبدالقیوم) کے حوالے کر دی تھیں۔ مولانا عبدالقیوم کا سن اس زمانے میں تیرہ چودہ سال ہو گا۔ وہ سید صاحب کے ساتھ سرحد پہنچ گئے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد سید صاحب عبدالقیوم کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھانا کھلاتے۔ پھر اس خیال سے انھیں ہندوستان بھیج دیا کہ ان کی والدہ کو مولانا کے انتقال کی خبر ملے گی تو ان کے پاس غم غلط کرنے کا بھی کوئی ذریعہ ہونا چاہیے۔ عبدالقیوم کے دو حقیقی ماموں شیخ جلال الدین اور شیخ صلاح الدین ساتھ ہندوستان آئے۔

"وقائع" صفحہ ۹۲۵۔

اہل وعیال اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ شاہ عبدالعزیز کی صاحبزادی سے مولانا کے کوئی اولاد نہ تھی
غالباً اس اہلیہ کی وفات پر مولانا نے اپنی چچیری بہن سے شادی کی جن سے عبدالقیوم[1] پیدا ہوئے۔ جب
سید صاحب نے نکاحِ بیوگاں کی سنت تازہ کی تو شاہ اسمٰعیل نے محض بہ غرض احیاءِ سنت اپنی بیوہ
ہمشیر کی شادی مولانا عبدالحی ہی سے کر دی تھی گویا انتقال کے وقت مولانا نے دو بیوائیں چھوڑیں۔
سید احمد علی رائے بریلوی نے نواب وزیر الدولہ کو مولانا کے انتقال کی اطلاع دیتے ہوئے لکھا تھا کہ دونوں
بیواؤں کے لیے امداد کا بندوبست کر دیا جائے۔

بعض مبالغہ آمیز باتیں آخر میں دو باتوں کا ذکر ضروری ہے۔ بعض اصحاب نے لکھا ہے
کہ سید صاحب نے دوسرا نکاح کیا تو ایک مرتبہ خلافِ معمول صبح کی جماعت میں کچھ تاخیر ہو گئی۔
دوسرے دن پھر سید صاحب سے تکبیرِ اولیٰ فوت ہو گئی۔ مولانا عبدالحی نے سلام پھیرنے کے بعد سید
صاحب سے مخاطب ہو کر کہا کہ عبادتِ الٰہی ہو گی یا شادی کی عشرت؟ سید صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف
کر لیا۔ ایک اور واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ سید صاحب نے فرمایا: مجھ سے کوئی بات خلافِ سنت
دیکھیے تو متنبہ کر دیجیے۔ مولانا عبدالحی نے کہا جب آپ سے کوئی مخالفِ سنت فعل دیکھوں گا تو
آپ کے ساتھ ہوں گا ہی کہاں۔

میرے نزدیک یہ دونوں باتیں مبالغہ آمیزی پر مبنی ہیں۔ سید صاحب سے غلطی کا صدور بعید از امکان
نہ تھا لیکن ایسی کوئی مستند روایت نہیں ملتی کہ آپ عشرت میں مبتلا ہو کر واجبات میں تساہل کے
مرتکب ہوئے ہوں اور مولانا عبدالحی کا تعلق سید صاحب سے ایسا نہ تھا کہ ”عبادتِ الٰہی ہو گی یا شادی
کی عشرت“ جیسا جملہ فرماتے۔ اس میں تبلیغ کی بھی کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔ عبادتِ الٰہی میں سید صاحب
غیر معمولی مشقتیں برداشت کرتے رہے۔ نواب وزیر الدولہ کے بیان کے مطابق انھوں نے مدت تک عشا
کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ وہ اپنی جماعت میں عزیمت کا ایک عجیب و غریب پیکر تھے اور جو کچھ
مذکورہ بالا واقعے میں ان سے منسوب کیا گیا ہے، اسے کسی درجے میں بھی قابلِ قبول نہیں سمجھا جا سکتا
رہی دوسری بات تو وہ مولانا عبدالحی کے لیے سراسر نازیبا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ مجھ سے

[1] [illegible]

کوئی خلافِ سنت فعل سرزد ہو تو آگاہ کر دیجیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اتباعِ سنت کا خواہاں ہے۔ ہو سکتا ہے، شاذ و نادر اس سے کوئی خطا سرزد ہو جائے۔ اس حالت میں ہر عالمِ سنت کا فرض یہی ہے کہ اسے آگاہ کر دے۔ اس کا ساتھ چھوڑ جانے کی دھمکی کون سی دین پروری ہے؟ حقیقت یہ کہ لوگ شخاص کے محاسن بیان کرتے وقت جوشِ عقیدت میں بعض بنیادی باتیں نظر انداز کر جاتے ہیں۔ مولانا عبدالحی یقیناً بہت بڑے بزرگ تھے اور ان کی بزرگی کے روشن شواہد ہمارے سامنے موجود ہیں، لیکن مبالغہ آمیز واقعات ان کی عظمت میں قطعاً کوئی اضافہ نہیں کرتے۔

صراطِ مستقیم کا عربی ترجمہ مولانا عبدالحی "صراطِ مستقیم" کی ترتیب میں بھی شریک رہے۔ وہ اور شاہ اسمٰعیل سید صاحب کی زبان سے جو حقائق سنتے تھے، انھیں قلمبند کر کے آپ کو سنا دیتے تھے۔ کتاب کا ایک حصہ شاہ اسمٰعیل کا مرتبہ ہے اور باقی مولانا عبدالحی کا لکھا ہوا ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ان بزرگوں کو اپنی تحریرات میں پانچ پانچ مرتبہ ترمیم کرنی پڑی، اس کے بعد سید صاحب نے اس پر اظہارِ اطمینان فرمایا۔ قیامِ حرمین کے زمانے میں مولانا عبدالحی نے "صراطِ مستقیم" کا ترجمہ عربی میں کر دیا تھا تاکہ عربی دان اصحاب بھی اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ بعض اصحاب نے لکھا ہے کہ مولانا ممدوح نے نکاحِ بیوگان پر بھی ایک رسالہ مرتب فرمایا تھا۔ ممکن ہے "صراطِ مستقیم" کی طرح اس رسالے کی بھی عبارت مولانا عبدالحی کی ہو، لیکن یہ خود سید صاحب کا ہے، اس لیے کہ اس کے تمام مطالب سید صاحب نے ارشاد فرمائے تھے۔ میں نے اس کے جتنے قلمی نسخے دیکھے، ان میں اس کا انتساب سید صاحب ہی سے کیا گیا تھا۔

علم و فضل مولانا عبدالحی کے علم و فضل کی تعریف خود شاہ عبدالعزیز نے فرمائی۔ ایک مرتبہ کہا کہ علمِ تفسیر میں مولانا عبدالحی میرا نمونہ ہیں۔ ایک خط میں شاہ صاحب نے مولانا اور شاہ اسمٰعیل کو تاج المفسرین فخر المحدثین اور سرآمد علمائے محققین لکھا نیز فرمایا کہ دونوں تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، منطق وغیرہ میں مجھ سے کم نہیں۔ دونوں کو علمائے ربانی میں شمار کیا۔ خود مولانا کی یہ حالت تھی کہ بار بار فرماتے: مجھے جو کچھ ملا، سید صاحب کی برکت سے ملا۔

شاہ اسمٰعیل بعض اوقات غصّے میں بے قابو ہو جاتے تھے۔ چنانچہ گڑھی امان زئی میں جو واقعہ پیش آیا، "سیّد احمد شہید" میں نقل ہو چکا ہے۔[۱] درانیوں کی طرف سے ایک قاصد آیا۔ وہ انعام لینے کی غرض سے بالاخانے کی سیڑھی پر کھڑا ہو گیا جہاں سیّد صاحب مقیم تھے۔ شاہ صاحب نے اسے نرمی سے ہٹانے کی کوشش کی تو وہ چیخ چیخ کر رونے لگا۔ شاہ صاحب نے دو تین طمانچے مارے۔ ایک مرتبہ ان کا ہاتھ سیڑھی میں لگا جو لکڑی کی تھی۔ ایک باریک دیشہ ہتھیلی میں چبھا اور خون جاری ہو گیا۔ عین اس وقت سیّد صاحب برآمد ہوئے۔ خون دیکھ کر واقعہ پوچھا اور سنا تو فرمایا: آپ کا غصّہ بڑھ رہا ہے اسے دور کرنا چاہیے۔ بعد ازاں شاہ صاحب نے منشی محمدی انصاری کے سامنے ندامت کا اظہار کیا۔ منشی صاحب نے کہا کہ مولانا عبدالحی کو بھی غصّہ آتا تھا لیکن وہ راہِ شریعت سے ادھر ادھر کبھی نہ ہوئے۔ غصّے کے باوجود شرعی دلائل ان کی تمام باتوں پر غالب رہتے تھے۔ شاہ صاحب نے فرمایا: مولانا کا غصّہ "آورد" ہوتا تھا۔ وہ امور شرعیہ پر بہ قصد و ارادہ غصّہ لاتے تھے۔ میرا غصّہ "آمد" ہے جب آتا ہے تو عقل و ہوش پر قبضہ پا لیتا ہے۔

غرض صاحب "البلاغ المبین" کے قول کے مطابق مولانا عبدالحی تقویٰ، عمل، تاثیرِ وعظ، خواہشات کی تعطیل اور لباس و غذا میں قناعت کے لحاظ سے خدا کا نشان تھے۔ بہت کم سخن، متوکّل اور باوقار آدمی تھے۔ سنّت کے شیدائی، رسوم و بدعات سے متنفّر۔ نورِ ایمان ان پر برس رہا تھا۔ صالحیت ان کی پیشانی سے نمایاں تھی۔ اپنی تعریف سن کر ناراض ہوتے، نصیحت سے انھیں خوشی حاصل ہوتی۔ وہ ایسے جامع الصفات بزرگ تھے کہ قلم بیان سے عاجز ہے۔

۱۔ سیّد احمد شہید جلد دوم ص ۲۸۹۔

دوسرا باب

شاہ اسمٰعیل

بلند نسبتیں : شاہ اسمٰعیل شاہ عبدالغنی کے اکلوتے بیٹے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے پوتے، شاہ عبدالعزیز محدث، شاہ رفیع الدین محدث اور شاہ عبدالقادر محدث کے بھتیجے تھے۔ پاک و ہند کی وسیع سرزمین میں علم و فضل، وعظ و ارشاد، درس و تدریس اور خدمت اسلامیت کی ایسی بلند نسبتیں شاید ہی کسی کے حصے میں آئی ہوں، جن سے شاہ اسمٰعیل مشرف ہوئے۔ لیکن شاہ شہید کی عظمت کا اصل راز یہ ہے کہ انھوں نے اپنے عمل سے ان نسبتوں کی شانِ برتری کو چار چاند لگا دیے۔

عرفی خوب کہہ گیا ہے:

بائے ارزندگی از گہر خویش گیر
تا بچے ایں خرد نازاز اب و عم داشتن

یہ بالکل درست ہے، لیکن اگر کسی کو اپنے حسن عمل کے ساتھ بلند نسبتیں بھی میسر آ جائیں تو اس کی خوش نصیبی پر کون رشک نہ کرے گا؟

ولادت : شاہ صاحب مستند روایت کے مطابق ۱۲ - ربیع الآخر ۱۱۹۳ھ (۲۹ - اپریل ۱۷۷۹ء) کو اپنی ننھیال پھلت ضلع مظفر نگر میں پیدا ہوئے[1]۔

تاریخ ولادت کے متعلق دو روایتیں بھی ہیں، لیکن ان کا استناد محل نظر ہے۔ میر شہامت علی نے شاہ صاحب کی مشہور تصنیف "تقویت الایمان" کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا تھا جو ۱۸۵۲ء میں چھپا۔ اس کے ساتھ ایک دیباچہ بھی لکھا تھا، جس میں شاہ صاحب کی تاریخ ولادت ۱۸ - شوال ۱۱۹۶ھ بتائی

---

[1] "حیات طیبہ" صفحہ ۱۵ "و حیات ولی" طبع اوّل صفحہ ۳۵۳۔

مگر اس کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا، لہٰذا یہ مستند روایتوں کے مقابلے میں شایانِ توجہ نہیں۔

شاہ صاحب کی والدۂ ماجدہ کا اسمِ گرامی فاطمہ بتایا گیا ہے۔ وہ مولوی علاء الدین پھلتی کی صاحبزادی تھیں جن کے پوتے شیخ کمال الدین سے شاہ صاحب کی ہمشیرہ رقیہ کی شادی ہوئی تھی۔

ابتدائی تعلیم شاہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے پائی۔ وہ ۱۴۔ رجب ۱۲۱۲ھ (۱۲۔ اپریل ۱۷۹۸ء) کو فوت ہو گئے جب شاہ صاحب کی عمر صرف دس سال کی تھی۔ اسی وقت سے شاہ عبدالقادر نے انھیں اپنے دامنِ تربیت میں لے لیا یا سرسید مرحوم کے الفاظ میں "بجائے فرزندوں کے پرورش کیا۔" شاہ عبدالقادر کی اولاد میں صرف ایک صاحبزادی تھی، مسمات زینب جس کا عقد شاہ رفیع الدین کے فرزند عبدالرحمٰن عرف مصطفیٰ سے ہوا تھا۔ ان کے بھی صرف ایک بیٹی ہوئی، جس کا نام کلثوم تھا۔ شاہ عبدالقادر نے کلثوم کا نکاح شاہ اسمٰعیل سے کر دیا تھا۔ اس طرح شاہ عبدالقادر کو شاہ اسمٰعیل سے کئی نسبتیں پیدا ہو گئیں۔ اوّل یہ کہ شاہ اسمٰعیل ان کے حقیقی بھتیجے تھے، دوم یہ کہ انھوں نے شاہ صاحب کو اپنا بیٹا بنا لیا تھا، سوم یہ کہ اپنی نواسی کا نکاح ان سے کر دیا تھا۔ شاہ عبدالقادر نے اپنی زندگی میں کل جائداد حسبِ شرعیہ کے مطابق اپنی صاحبزادی اور بھائیوں کے نام کر دی تھی اور ان کی اجازت سے ایک حصہ شاہ اسمٰعیل کو دے دیا تھا۔[1]

غیر معمولی دل و دماغ ابتدائی تعلیم کے بعد زیادہ تر کتابیں شاہ عبدالقادر سے پڑھیں۔ شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز سے بھی فیض حاصل کیا۔ دماغ ابتدا ہی سے غیر معمولی تھا۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے:

جوہرِ ذکاوت او بہ غایت عالی افتادہ	ان کی ذکاوت کا جوہر بہت بلند پایہ
بود و حکایاتِ ذہانت و فطانت وے ہنوز	تھا اور ان کے ذہن و فہم کی تیزی کے قصے
نقلِ ہر مجلس و زیبِ ہر محفلِ اہلِ علم است۔[2]	اب تک اہلِ علم کی ہر مجلس کے لیے باعث
	زینت سمجھے جاتے ہیں۔

[1] ارواحِ ثلاثہ صفحہ ۳۴۔ [2] اتحاف النبلاء صفحہ ۴۱۲۔

سرسید نے بھی یہی لکھا ہے کہ ایسے فردِ کامل کا پیدا ہونا خدائے ذوالجلال کی قدرت کا ایک خاص کرشمہ تھا۔ غیر معمولی ذہانت کے ساتھ طبیعت میں استغنا بھی بہت تھا۔ مطالعے پر چنداں توجہ نہ تھی۔ سرسید فرماتے ہیں کہ مقام سبق اکثر محفوظ نہ رہتا۔ کبھی اصل مقام چھوڑ کر آگے سے شروع کر دیتے۔ شاہ عبدالقادر ٹوکتے تو کہہ دیتے کہ بیچ کا حصہ آسان سمجھ کر چھوڑ دیا۔ کبھی پڑھا ہوا حصہ دوبارہ پڑھنے لگتے۔ تنبیہ پر عرض کر دیتے کہ فلاں فلاں بات سمجھ میں نہیں آئی اور اس پر ایسے اعتراضات وارد کر دیتے کہ اُستاد کو انھیں دُور کرنے کے لیے خاص توجہ کی ضرورت پیش آتی ۔

پندرہ سولہ سال کی عمر میں رسمی تعلیم سے فارغ ہو گئے۔ بڑے بڑے عالم واسطے میں ان سے ایسے مسائل پوچھ لیتے، جن کا جواب کتابوں اور شرحوں کی مدد کے بغیر نہ دیا جا سکتا، لیکن شاہ اسمٰعیل بے اعانت کتب ایسے جواب دیتے کہ عالم محوِ حیرت رہ جاتے۔ فقہ کا ہر مسئلہ آیات و احادیث سے مستند فرماتے۔ معقول کی بیشتر کتابوں پر حاشیے تحریر کیے۔ ایک رسالہ منطق میں لکھا، اس میں شکل اوّل کے بعید الطبائع اور شکل رابع کے ابدہ البدیہیات ہونے کا دعویٰ کیا۔ سرسید کہتے ہیں کہ اس کے دلائل کی قوت ارسطو کو بھی معرضِ حیرت میں ڈال دیتی اور وہ اپنے دلائل کو تارِ عنکبوت سے بھی سست تر سمجھتا۔ سعادت یار خاں رنگین کا ایک قول بعض اصحاب نے نقل کیا ہے کہ شاہ اسماعیل کی غیر معمولی ذکاوت دیکھ کر اس نے کہا تھا اس خاندان سے جو اٹھتا ہے بادِ گزا اٹھتا ہے ۔

دعوت و تبلیغ جیسا کہ "سید احمد شہید" میں بتایا جا چکا ہے، سید صاحب سے بیعت کے بعد زندگی احیاءِ دین اور ردِّ بدعات کے لیے وقف کر دی۔ سہ شنبہ اور جمعہ کو شاہی مسجد میں وعظ فرماتے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ نمازِ جمعہ کے لیے ایسی کثرت ہونے لگی، جیسے عیدگاہ میں نمازِ عیدین کے لیے ہُوا کرتی ہے۔ تقریریں ایسی جامع ہوتی تھیں کہ ہر شخص کو اس کے شبہے کا جواب مل جاتا تھا اور سادگی کا یہ عالم تھا کہ عالم و عامی یکساں ان سے مستفید ہوتے تھے ۔

کچھ مدت بعد سید صاحب کے ایما سے وعظ و تقریر میں جہاد فی سبیل اللہ کے مسائل بیان فرمانے لگے۔ سرسید کے الفاظ میں مسلمانوں کا آئینۂ باطن مصفّا اور مجلّٰی ہو گیا اور وہ راہِ حق میں اس طرح سرگرم

ہوئے کہ ہر شخص بے اختیار چاہنے لگا، اس کا سر فی سبیل اللہ فدا ہو اور اس کی جان دینِ محمدی کا علم بلند کرنے کے سلسلے میں کام آئے[1]۔ ان کی وضع سادہ اور بے تکلف تھی، یعنی عام علما کی طرح وعظ میں جبہ وغیرہ کا اہتمام نہ کرتے تھے، اس لیے ابتدا میں بعض سامعین ناخوش ہوئے۔ قرآن مجید کی چند آیتیں پڑھ کر تفسیر شروع کی تو سامعین کے دل خوفِ خدا سے لرز اٹھے اور ان کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔

بعض ثقات سے سنا کہ بارہ سال کے اشتغال و مراقبہ سے جو نسبت پیدا ہوتی ہے، وہ شاہ صاحب کے ایک وعظ سے پیدا ہو جاتی تھی۔ پنجابی تاجر دکان داری میں بہت مشاق تھے۔ وہ اعتراف کرتے تھے کہ خرید و فروخت کی کثرت اور نفع کی زیادتی کے باوجود وعظ سے رغبت اور دکان کھولنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہزاروں لوگ تائب ہوئے۔ ان میں زنانِ بازاری بھی تھیں۔ ایک مرتبہ ایامِ محرم میں قلعے کے اندر بلائے گئے، اکبر شاہ ثانی بادشاہ بھی مجلس میں شریک تھا۔ شاہ صاحب نے ایک آیت پڑھ کر حضرت امام حسینؓ کے مراتب ایسے انداز میں بیان فرمائے کہ اسوۂ حسینیؓ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ فرمایا کرتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان شرک و بدعات کی بلائے سخت میں مبتلا ہیں۔

بعض غیر مستند روایتیں مختلف اصحاب نے شاہ صاحب کی ورزشوں مثلاً تیراکی، سواری، شمشیر زنی، نیزہ بازی، بنوٹ بازی، بنوٹ وغیرہ کے متعلق لمبی چوڑی داستانیں بیان کی ہیں۔ یہ بھی لکھا ہے کہ وہ تیز دھوپ میں مسجد فتح پوری کے تپتے ہوئے فرش پر گھنٹوں چلتے رہتے تھے۔ مجھے ان روایات کی کوئی سند اب تک نہ مل سکی۔ اسی طرح میرے نزدیک شاہ صاحب کے مواعظ اور دورۂ پنجاب کی جو مفصل روئداد "حیاتِ طیبہ" میں چھپی ہیں، وہ بالکل بے اصل ہیں۔ دورۂ پنجاب یقیناً بعید از قیاس نہیں، لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا اور جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں، ان میں سے بعض یقینی طور پر محلِ نظر ہیں۔ شاہ صاحب بلا ریب ایک غیر معمولی انسان تھے اور ورزشوں یا دوروں کے بغیر بھی ان کی عظمت میں کوئی کمی نہیں آ سکتی۔

سید صاحب سے بیعت کے بعد زیادہ وقت انھیں کی معیت میں گزرا۔ جہاد کے لیے تبلیغِ دعوت

---

[1] "آثار الصنادید" بحوالہ "تاریخ و سیاست" (حیاتِ ولی صفحہ ۵۴۳)۔

بڑا کام سب سے بڑھ کر انھیں نے انجام دیا۔ سید صاحب کے ساتھ حج کیا۔ اس وقت تک ان کی والدۂ ماجدہ زندہ تھیں۔ حج کے لیے ساتھ گئیں۔ مکۂ معظمہ میں انھوں نے سید صاحب کی بیعت کی۔ وہیں وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئیں۔" ارمغان احباب" میں میاں نذیر حسین صاحب مرحوم کا ایک بیان درج ہے کہ شاہ صاحب حج کے بعد پانچ چھ مہینے دہلی میں رہے، جب مشکاف کلکتہ سے آیا تو وہ استعجالاً دہلی سے چلے گئے کیونکہ کلکتہ میں اس سے مولانا کی بحث ہو گئی تھی۔[1]

کارنامہ ہائے جہاد — ۶۔ جمادی الاخریٰ ۱۲۴۱ھ (۱۷۔ جنوری ۱۸۲۶ء) دوشنبہ کو رائے بریلی سے سید صاحب کے ساتھ راہ ہجرت میں قدم رکھا اور وطن عزیز سے سیکڑوں میل کے فاصلے پر ایک غیر معروف گوشے میں شہادت پائی، جسے ان کی اور سید صاحب کی شہادت کے باعث ہمیشہ کی ناموری حاصل ہوئی۔

دورانِ جہاد میں ان کے کارنامے "سید احمد شہید" کے صفحات پر تفصیلاً بیان ہو چکے ہیں اور ان کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اجمالاً ان کی کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ وہ تمام انتظامات میں سید صاحب کے مشیر خاص تھے۔

۲۔ سید صاحب کے لیے امامت جہاد کا پورا بندوبست انھیں نے کیا تھا۔

۳۔ جنگ شیدو میں جان پر کھیل کر سید صاحب کو محفوظ مقام پر پہنچایا۔

۴۔ ہزارہ میں جہاد کی ابتدائی تنظیمات انھیں نے کیں۔

۵۔ جنگ شنکیاری میں تھوڑی سی جمعیت سے سکھوں کے بہت بڑے لشکر کو شکست دی۔ سکھوں کی گولیوں سے شاہ صاحب کی قبا چھلنی ہو گئی، لیکن نہ آپ میدان سے ہٹے، نہ مورچے میں پناہ لی اور نہ جنگ روکی۔ اسی لڑائی میں شاہ صاحب کی ایک انگلی زخمی ہوئی جسے دکھا کر آپ مزاحاً فرمایا کرتے تھے

[1] ارمغان احباب بحوالہ معارف فروری ۱۹۲۹ء۔ راوی کا درجہ اتنا بلند ہے کہ اس بیان میں شبہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ حج سے واپسی پر شاہ صاحب کو فوراً دہلی آنا پڑا، اس لیے کہ شاہ عبدالعزیز کا انتقال ہو چکا تھا۔ پھر وہ بہ طور خود دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں دورے کرتے رہے۔ مشکاف سے جھگڑے کے متعلق کوئی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

کہ یہ ہماری بانگشت شہادت ہے ۔

۶ ۔ بیعت شریعت کے سلسلے میں علمائے سرحد سے تمام گفتگوئیں شاہ صاحب ہی نے کی تھیں ۔

۷ ۔ ہنڈ کا مضبوط و مستحکم قلعہ چھوٹی سی فوج کے ساتھ فتح کر لیا اور دشمن کے صرف دو آدمی مارے گئے ، اپنے کسی آدمی کے خراش تک نہ آئی ۔

۸ ۔ جنگ زیدہ میں صرف سات سو مجاہدین سے درانیوں کی آٹھ دس ہزار فوج کو شکست فاش دی ۔

۹ ۔ مایار کی جنگ میں درانی فوج بارہ ہزار سے کم نہ تھی اور مجاہدین صرف ساڑھے تین ہزار تھے ، جن میں بڑی تعداد ملکیوں کی تھی ، تاہم درانی مقابلے پر ٹھہر نہ سکے ۔

۱۰ ۔ امب و عشرہ کی لڑائیاں شاہ صاحب کے کمالِ سپہ گری کا ایک روشن ثبوت ہیں ۔

۱۱ ۔ انتظامِ عشر کے سلسلے میں وہ سید محمد حبان قاضی القضاۃ کے مشیرِ خاص تھے اور جنگِ مردان میں انھیں کے حسنِ تدبیر سے فتح حاصل ہوئی ۔

۱۲ ۔ پشاور میں صلح کی تمام گفتگوئیں سید صاحب کی طرف سے شاہ صاحب ہی نے کی تھیں ۔

غرض وہ سید صاحب کی پوری تحریکِ جہاد میں اول سے آخر تک روحِ رواں بنے رہے ۔

اطاعتِ امام نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ وہ اور مولانا عبدالحی سید صاحب کے سامنے بالکل بے حس و حرکت رہتے تھے اور آپ کی بات کا جواب بھی بڑی مشکل سے دیتے تھے[1] ، تاہم شرعی معاملات میں شاہ صاحب کسی کی پروا نہ کرتے تھے اور جو کچھ دل میں ہوتا تھا سید صاحب کے سامنے بے بیباکانہ بیان کر دیتے تھے ۔ ایک موقع پر حسن زائی قبیلے نے سید صاحب سے عشر معاف کرا لیا ۔ شاہ صاحب کو معلوم ہوا تو کہا کہ عشر زکوٰۃ و خمس کی طرح حقوقِ شریعت میں سے ہے ، اسے معاف کرنے کا اختیار امام کو بھی حاصل نہیں ۔ چنانچہ سید صاحب نے ان کی رائے کے مطابق عمل کیا ۔

جنگِ مایار کے بعد شاہ صاحب سید صاحب سے پیشتر مردان پہنچ گئے تھے اور وہاں اس شرط پر رسول خاں رئیسِ مردان سے صلح کر لی تھی کہ لشکر قصبے میں نہ آئے گا ۔ اس کے متعلق سید صاحب کے پاس

---

[1] وصایا ، حصۂ دوم صفحہ ۔

مفصل اطلاع بھی بھیج دی تھی اتفاق سے وہ اطلاع سید صاحب تک نہ پہنچ سکی اور آپ لشکر کے ساتھ قصبے میں داخل ہو گئے۔ شاہ صاحب کو اس پر سخت رنج ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ سید صاحب نے شرط کا خیال نہ رکھا۔ چنانچہ سامنے پہنچتے ہی کہا:

جناب خود خلاف شرع امر کے مرتکب ہوئے۔ لشکر اسلام میں سے ایک آدمی کے عہد کا ایفا بھی امام اور پورے لشکر پر واجب ہو جاتا ہے۔ مجھے آپ نے اپنا نائب بنا کر بھیجا تھا لیکن میرے عہد کا بھی خیال نہ رکھا اور قصبے میں داخل ہو گئے۔ یہ لشکر ہے، جسے میدان میں ٹھہرنا چاہیے، پیرزادوں کا قافلہ نہیں کہ قصبے میں گھس آئے۔

حقانی ربانی بزرگ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ انسوار کی عادت تھی۔ کتابت کا شوق نہ تھی البتہ ضروری احکام و مکاتیب کی عبارتیں بے تکلف بولتے جاتے تھے اور منشی لکھتے تھے۔ منظورہ کے الفاظ ہیں "قدرت بہ کتابت چنانکہ باید نہ داشتند۔" "ارواح ثلاثہ" سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ پیر بخش نے انھیں کتابت سکھانے پر آمادگی ظاہر کی فرمایا: معمولی لکھنا کافی ہے۔[1] سید صاحب نے شاہ صاحب کی سواری کے لیے ایک گھوڑا دے دیا تھا، لیکن وہ کبھی اس پر سوار نہ ہوئے۔ اپنے رفیقوں میں سے کسی ایک کو سوار کرا دیتے اور خود پیدل چلتے۔ عقیدہ یہ تھا کہ یہ خدائی کام ہے، جتنی زیادہ مشقت اٹھائیں گے اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔

فرماتے تھے کہ میں خواب کی تعبیر نہیں جانتا۔ جس طرح دوسرے لوگ عقل سے قرائن تجویز کر لیتے ہیں میں بھی کر لیتا ہوں۔ معانی قرآن و حدیث مجھے اللہ نے عطا فرمائے۔ بظاہر استاد سے پڑھا لیکن جو کچھ اللہ نے دل پر ڈال دیا وہی میرا اصلی علم ہے۔ یہ بھی کہا کرتے تھے کہ نماز میں غفلت نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو جلد آگاہ ہو جاتا ہوں۔

حقانی ربانی آدمی تھے۔ اپنی کسی غلطی یا کمزوری کے اعتراف میں تامل نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ عمر زیادہ نہ تھی لیکن جسم خاصا کمزور تھا۔ پہاڑ کی چڑھائی میں چند قدم چلنے سے سانس پھول جاتا تھا۔ زیادہ بوجھ بھی نہ اٹھا

---

[1] ارواح ثلاثہ صفحہ ۔

سکتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ سید صاحب دریا سے پانی لانے کے لیے اٹھے تو انھوں نے مشکیزہ لے لیا۔ شاہ صاحب مشکیزہ نہ اٹھا سکتے تھے، لہٰذا سپرد لے لیا، تاہم تعلیم عزیمت کی غرض سے ایک موقع پر زنبورک اٹھوا کر اپنے کندھے پر رکھ لی۔ پاؤں لڑکھڑانے لگے تو زنبورک ساتھیوں نے سنبھال لی ؎۱

نواب وزیرالدولہ نے لکھا ہے کہ بعض اوقات بیماری کی تکلیف میں دو دو دن سو نہ سکتے، یہاں تک کہ اٹھنے بیٹھنے کی طاقت بھی نہ رہتی، تاہم سید صاحب کی طرف سے کسی جنگی کام کے انتظام کا حکم پہنچ جاتا تو بے توقف ہتھیار سنبھال کر شیر کی طرح مسلمانوں کے معاملات کی درستی میں مصروف ہو جاتے ؎۲۔ دینی کاموں میں نہ خود کبھی تساہل کو راہ دی، نہ کسی رفیق سے کام کے وقت نرمی کا برتاؤ روا رکھا۔ شاہ صاحب کے رعب و ہیبت کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ کوئی درانی سپاہی کسی خاتون کا مال چھیننا چاہتا تھا۔ خاتون نے شاہ صاحب کا نام لیا تو سپاہی سب کچھ چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جنگ مایار ناگزیر ہو گئی تو سید صاحب نے شاہ صاحب کو بھی امب سے بلا لیا۔ منشی محمدی انصاری نے بلاوے کے خط میں اپنی طرف سے لکھ بھیجا کہ اپنی تشریف آوری کی خبر کو شہرت دیجیے، اس لیے کہ آپ کی شجاعت اس علاقے کے خاص و عام پر روشن ہے۔ کیا عجب ہے دشمن آپ کا نام سن کر مرعوب ہو جائیں اور اس طرح مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔

نواب صدیق حسن خاں کا بیان

مولانا سید محمد علی رام پوری نے لکھا ہے کہ وہ حافظ قرآن تھے اور متبحر عالم۔ تیس ہزار حدیثیں انھیں نوک زبان تھیں ؎۳۔ نواب صدیق حسن خاں فرماتے ہیں:

در علوم معقول و منقول یاد پیشینیان از	معقول و منقول میں پہلوں کی یاد بھلا
خاطر می برد - در علم فروع و اصول ائمہ آن را	دیتے تھے۔ فروع و اصول میں ائمہ کو پرے
دور تر می نشاند - در ہر علم کہ با او سخن رانی	بٹھا دیتے تھے۔ جس علم میں ان سے بات کرو گے
دانی کہ وے امام این فن است و در ہر فن	جان لو گے کہ وہ اس فن کے امام ہیں۔ اور جس فن
کہ با وے مناظرہ کنی شناسی کہ وے حافظ	میں ان سے مناظرہ کی نوبت آئے گی پہچان لو گے
این علم است . . . : تمام عمر خود را در اعلائے	کہ وہ اس کے حافظ ہیں۔ ساری عمر خدا کے کلمے

؎۱ یہ تمام معلومات "منظورہ" کے مختلف صفحات سے ماخوذ ہیں۔ ؎۲ "وصایا" حصہ دوم صفحہ ۲۱۔ ؎۳ تقصیر الفقاعین قلمی نسخہ صفحہ ۱۹۔

کلمۃ اللہ و احیاء سنن رسول اللہ و جہاد فی سبیل اللہ و ہدایت خلق اللہ گزرانید و دے با آرام در جاے از بلاد اسلام نیا سودہ[1] ۔

کی بلندی، رسول اللہ صلعم کی سنتوں کے احیاء، خدا کی راہ میں جہاد اور خلق خدا کی ہدایت میں گزار دی۔ کسی اسلامی مقام پر ایک لمحے کے لیے بھی آرام نہ فرمایا۔

فراست مومن سید صاحب فرمایا کرتے تھے کہ خدا نے مجھے تلوار، گھوڑے، اور آدمی کی خاص پہچان عطا کی ہے، یہاں تک کہ میں جوتا دیکھ کر آدمی کی سیرت کا حال بیان کر سکتا ہوں، البتہ اس میں غلطی کا بھی امکان ہے۔ شاہ صاحب کو بھی بصیرت کا خاص نور عطا ہوا تھا اور وہ سرسری ملاقات میں آدمی کی نیت اور ارادے کے متعلق اندازہ فرما لیتے تھے جو عموماً درست ہوتا۔ وہ سید صاحب کے حکم سے پہلی مرتبہ بالاکوٹ آئے تھے تو سکھوں کے لشکر پر شبخون کا فیصلہ کر لیا تھا۔ عین آخری وقت میں تاکیدی حکم آیا کہ شاہ صاحب خود پنجتار آ جائیں اور بالاکوٹ کی حفاظت کا کام حبیب اللہ خاں گڑھی والے کے حوالے کر دیا جائے۔ شاہ صاحب نے یہ فرمان پاتے ہی شبخون کا ارادہ ملتوی کر دیا اور پنجتار جانے کی تیاری کر لی۔ ساتھ ہی فرمایا: حبیب اللہ خاں نے جب دیکھا کہ بھوگڑ منگ کی طرف حملے کا خطرہ بڑھ گیا ہے تو سید صاحب سے کہا کہ ادھر کی حفاظت فرمائیں، بالاکوٹ کی دیکھ بھال میں کروں گا، لیکن یقین ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں حبیب اللہ خاں پھر ہمیں بالاکوٹ بلائے گا۔

شاہ صاحب کی یہ رائے حرفاً حرفاً درست ثابت ہوئی۔ چنانچہ کچھ دیر بعد وہ اور سید صاحب حبیب اللہ خاں کے بلانے پر بالاکوٹ آئے، جسے ان کی شہادت سے دائمی شرف حاصل ہونے والا تھا۔

بے مثال شخصیت کسی قسم کے تکلف کی پرچھائیں بھی ان کے قلب صافی پر نہ پڑی تھی۔ کھانے پینے، رہنے سہنے اور پہننے اوڑھنے میں حد درجہ سادہ تھے۔ سفر حج میں کلکتہ پہنچے تو لباس ایسا پہن رکھا تھا کہ منشی امین الدین کو پہلی نظر میں ان کے شاہ اسمٰعیل ہونے کا یقین نہ آیا۔ جب معلوم ہوا کہ یہی وہ شخصیت ہے جس کی ناموری سے ملک کے در و دیوار گونج رہے ہیں تو منشی صاحب یہ سنتے ہی آبدیدہ ہو گئے۔

---

[1] "التقاط" صفحہ ۱۳۱۔

مشہور ہے کہ دورانِ جہاد میں کبھی کبھی گھوڑے کو کھریرا کرتے۔ اس حالت میں بھی کوئی شخص دینی یا علمی مسئلہ پوچھنے کے لیے آ جاتا تو ساتھ ساتھ جواب دیتے جاتے۔ ایک نیاز مند نے لکھا ہے:

ایسا عالم باعمل، فاضل بے بدل، صاحب اخلاق، شہرۂ آفاق، المعی زماں، لوذعی دوراں، واقف علوم معقول و منقول، کاشف دقائق فروع و اصول، رافع اعلام توحید سنت، قامع بنیان شرک و بدعت، فتوت کردار، شجاعت شعار اس وقت میں ہم نے کہیں نہ سنا، دیکھنا تو کیا۔

تصانیف سید صاحب سے وابستگی کے بعد شاہ صاحب نے اپنی حیات عزیز جن اہم کاموں کے لیے وقف کر دی تھی ان کے پیش نظر تصانیف کا موقع بہت کم تھا، تاہم انھوں نے مقاصد اصلاح کے لیے کتابیں بھی لکھیں، جن میں سے بعض اپنے موضوع پر آج بھی نادر و یگانہ ہیں۔ مثلاً:

۱۔ ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح۔ اہل علم کا بیان ہے کہ حقیقت بدعت میں ایسی کوئی کتاب کسی زبان میں آج تک نہیں لکھی گئی۔

۲۔ منصب امامت

۳۔ عبقات

۴۔ تقویت الایمان

۵۔ تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین

۶۔ اصول فقہ

۷۔ منطق میں ایک رسالہ

۸۔ صراط مستقیم کا پہلا حصہ

۹۔ ایضاح الحق الصریح

۱۰۔ یک روزی۔ یہ مختصر سا رسالہ ہے۔ مولوی فضل حق خیرآبادی نے "تقویت الایمان" پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ شاہ صاحب نماز کے لیے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ راستے میں مولوی فضل حق کا رسالہ ملا۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد ایک ہی نشست میں اس کا جواب مکمل کر دیا۔ لہٰذا "یک روزی"

نام پایا۔

علاوہ بریں انھوں نے بہت سی کتابوں پر نہایت قیمتی حاشیے لکھے تھے جو سب کی سب ضائع ہو گئیں۔ مولانا رشید الدین کا نادر کتب خانہ ایام غدر میں لٹ گیا تھا۔ ان کے فرزند مولوی سدید الدین حد درجہ افسوس سے فرمایا کرتے تھے کہ اپنے کتب خانے کا اس قدر رنج نہیں جتنا کہ ان حواشی کے ضائع ہو جانے کا ہے، جو شاہ صاحب نے ان کتابوں پر لکھے تھے[1]۔

سید صاحب کے مکاتیب کا بڑا حصہ بھی انھیں کا لکھوایا ہوا ہے۔ کچھ منظومات بھی ان سے منسوب ہیں۔ مثلاً ایک نعتیہ قصیدہ فارسی میں، ایک قصیدہ سید صاحب کی مدح میں، توحید پر ایک مثنوی فارسی میں موسوم بہ "سلک نور" اور اسی نام کی ایک مثنوی اردو میں۔

امت محمدیہ کا حکیم | حکیم جمیل الدین کہتے ہیں کہ شاہ صاحب کا ذہن حد درجہ سریع الانتقال تھا۔ پانچ آدمیوں کو سامنے بٹھا کر پانچ مختلف مضامین لکھواتے تھے، ور کسی کا قلم رکتا نہ تھا[2]۔ ایک مرتبہ محمد کالے نام ایک شخص نے عرض کیا کہ میرے نام کا سجع کر دیجیے، بے تکلف فرمایا: ہر دم نام محمد کا لے[3]۔

سید صاحب کے ساتھ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ مولوی فضل حق خیرآبادی سے خاصی کشمکش رہی تھی۔ مولوی صاحب نے شہادت کی خبر اس وقت سنی جب طلبہ کو سبق پڑھا رہے تھے۔ یہ سنتے ہی کتاب بند کر دی۔ گھنٹوں بیٹھے روتے رہے۔ اس کے بعد کہا کہ اسمٰعیل کو ہم مولوی نہ جانتے تھے، وہ امت محمدیہ کا حکیم تھا۔ کوئی شے نہ تھی جس کی اِنیت اور لمیت اس کے ذہن میں نہ ہو[4]۔

مزاح | شاہ رفیع الدین محدث دہلوی کے نواسے اور شاہ اسحٰق کے داماد مولوی نصیر الدین صاحب سید صاحب کے ساتھ حج کے لیے نہ گئے تھے، لیکن کلکتہ تک معیت میں رہے۔ وہ اس وقت بعض ضروری کاموں کے سلسلے میں رک گئے تھے، بعد ازاں شاہ اسحٰق کے ساتھ فریضۂ حج ادا کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ قیام کلکتہ کے دوران میں مجھے روزانہ شاہ اسمٰعیل کے پاس حاضر ہونا پڑتا تھا اور ایک گھڑی رات گئے تک ان کی

---

[1] "حیات بعد الممات" صفحہ ۱۱۲۔ [2] "ارواح ثلاثہ" صفحہ ۔ [3] "ارواح ثلاثہ" صفحہ ۔

[4] "حیات بعد الممات" صفحہ ۱۱۳۔

قیام گاہ میں رہتا۔ پھر شاہ صاحب مجھے میری قیام گاہ پر پہنچانے کے لیے ساتھ آتے۔ ان کی طبیعت میں مزاح بہت تھا۔ دروازہ کھٹکھٹاتے تو چوکیدار پوچھتا کون؟ شاہ صاحب بآواز بلند فرماتے: "غلوس"۔ غلوس اس بہادر و دلیر آدمی کو کہتے ہیں جس کا قدم جنگ یا ہجوم خطرات میں ہمیشہ آگے رہے۔

زہد و تقویٰ شاہ صاحب کے زہد و ریاضت کے سلسلے میں مولانا عبدالقیوم کی ایک روایت خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اس کا مفاد یہ ہے کہ ضلع بلند شہر کی تحصیل سکندرآباد میں شاہ صاحب کے خاندان کو کچھ اراضی ملی ہوئی تھی۔ شاہ اسمٰعیل تحصیل کے لیے وہاں جایا کرتے تھے اور جاتے آتے غازی آباد میں ایک بھٹیاری کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ تحصیل کے وقت وہ بیمار ہو گئے اور ان کی جگہ شاہ رفیع الدین کے فرزند شاہ موسیٰ کو بھیجا گیا۔ شاہ اسمٰعیل نے انہیں تحصیل کے متعلق تمام تفصیلات بتا دیں اور غازی آباد کی بھٹیاری کا پتا دیتے ہوئے یہ بھی کہہ دیا کہ اسے بتا دینا، میں اسمٰعیل کا بڑا بھائی ہوں۔ شاہ موسیٰ غازی آباد پہنچے اور بھٹیاری کو اپنا نام و نشان بتا دیا۔ اس نے رات کے وقت شاہ موسیٰ کی چارپائی کے نیچے پانی کے دو لوٹے، ایک چٹائی اور ایک جانماز رکھ دی۔ موسیٰ نے کہا: "اس سامان کی کیا ضرورت ہے؟ عشا کی نماز مسجد میں پڑھ آئے ہیں، صبح کی نماز پھر وہیں پڑھ لیں گے۔" بھٹیاری نے ان کی طرف تعجب سے دیکھتے ہوئے کہا: "میں تو پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ تم اسمٰعیل کے بھائی نہیں ہو اور اب تو یقین ہو گیا۔ مولوی اسمٰعیل بھی نماز مسجد ہی میں پڑھا کرتے تھے مگر وہ رات کو تھوڑی دیر سو کر اٹھ بیٹھتے اور وضو کر کے صبح تک نفلوں میں قرآن پڑھتے رہتے تھے۔ تم کہتے ہو مجھے پانی کی ضرورت نہیں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ تم بڑے بھائی ہو اور عابد بھی ان سے زیادہ ہو گے مگر تم کچھ بھی نہ نکلے۔"

شاہ موسیٰ کہتے تھے کہ میں بھٹیاری کی یہ بات سن کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گیا اور کوئی جواب بن نہ آیا۔[1]

دو خطرناک موقعے شاہ صاحب کی شجاعت، دلیری اور بہادری بستائش سے بالا ہے۔ وہ اپنی جوانی عزیز جس بلند مقصد کے لیے نذر کر چکے تھے اس میں ہر قدم پر شہادت کا خطرہ موجود تھا۔ تاہم شاہ صاحب

[1] ارواح ثلاثہ، صفحہ ۵۵ و ۵۶۔

کی حالت یہ تھی کہ وہ گولیوں کی بارش میں انتہائی بے تکلفی سے جاتے تھے۔ دوسرے لوگ پھولوں کی بارش میں بھی اس طرح جانا گوارا نہ کریں۔

اس سلسلے میں سوانح نگاری کے نقطۂ نگاہ سے یہ بتانا ضروری ہے کہ دو مرتبہ شاہ صاحب عین موت کے منہ سے بچے۔ ایک مرتبہ جنگ مایار میں جہاں انھوں نے کئی درانی سواروں کو مار گرایا۔ اسی اثنا میں ایک سوار ان کے بالکل قریب آ گیا۔ وہ بندوق نہ بھر سکے۔ تلوار اٹھاتے تھے اس لیے شہادت کا یقین ہو گیا۔ عین اس موقع پر حافظ وجیہ الدین پھلتی کی نظر پڑی۔ انھوں نے دور سے درانی سوار پر بندوق سر کی۔ وہ گولی لگتے ہی گرا اور شاہ صاحب بال بال بچے۔ دو چار لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو ان کا زندہ بچنا مشکل تھا۔

دوسرا واقعہ سفر ہجرت ثانیہ میں پیش آیا۔ دریائے سندھ کے کنارے تاکوٹ میں منزل ہوئی۔ شاہ صاحب کو غسل کی حاجت تھی۔ منہ اندھیرے دریا پر چلے گئے۔ سخت سردی کا موسم اور دریا کا پانی برفانی۔ غسل کرتے ہی باہر نکل کر کپڑے پہنے۔ لیکن اس وقت بے بس ہو کر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ صبح صادق کے وقت دوسرے مجاہدین وضو کے لیے دریا پہ گئے تو انھیں اٹھا لائے۔ چارپائی پر لٹا کر کمل اوڑھا دیے۔ پاس آگ جلائی۔ سورج نکلنے پر شاہ صاحب کو ہوش آیا۔

افراط و تفریط اور توسط ایک مرتبہ وعظ و نصیحت کے نتائج کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

ہر چند مردم بسیار بر راہ راست آمدند
لاکن آنچہ من مے خواہم آنچناں کس از ایشاں نخاست
آں وضع عمر نبودہ و آں راہ توسط است در
افراط و تفریط کہ در ماہ زمین صحبت حضرت
امیر المومنین یافتہ و من ہر چند بسیار سعی می نمائم
کہ آں طریقہ توسط بہ تعلیم یافتگان من حاصل
شود لاکن حسب مراد من ہیچ یکے از ایشاں
تعلیم قبول نمے کنند یا ماده افراط مے روند

اگرچہ وعظ و نصیحت سے بہت سے
آدمی راہ راست پر آ گئے لیکن جو وضع میں
چاہتا تھا، وہ کسی نے اختیار نہ کی، اور وہ افراط
اور تفریط کے درمیان توسط کی راہ تھی۔ یہ توسط
سید صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہونے
والوں میں پایا جاتا ہے۔ میں بہت کوشش کرتا
ہوں کہ توسط کا یہ طریقہ مجھ سے تعلیم پانے والے
بھی سیکھ لیں لیکن یا تو وہ تفریط کی راہ اختیار

یا تقریظ سے کنند۔ پس معلوم می شود کہ بیعت کاملہ کہ منصوص است از افراط و تفریط پاشند جز صحبت آں جناب میسر نہ شدہ الا ماشاء اللہ ۔	کرتے یا تقریظ کرنے لگتے ہیں۔ پس معلوم ہو گیا کہ کامل بیعت جو افراط و تفریط سے محفوظ ہو، سید صاحب کی صحبت کے بغیر کسی کو میسر نہ ہو گی الا ماشاء اللہ ۔

یہ شاہ صاحب کی حق اندیشی، حق شناسی اور حق گوئی تھی ۔

شہادت

شہادت کی تفصیل سید احمد شہید میں درج ہو چکی ہے۔ مختلف راویوں کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ پہلے ان کی پیشانی یا سر پر گولی لگی جس سے خفیف سا زخم آیا لیکن وہ جلدی خون سے تر ہو گئی۔

۲۔ پھر آپ کو ننگے سر دیکھا گیا۔ بندوق بھری ہوئی تھی اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف گئے جہاں بکثرت گولیاں آ رہی تھیں۔

۳۔ ایک صاحب نے انہیں مٹی کوٹ کے نالے کے قریب دھانوں کے کھیتوں میں بندوق چلاتے دیکھا۔

۴۔ ایک اور صاحب نے انہیں اس حالت میں دیکھا کہ بندوق کندھے پر تھی۔ ننگی تلوار ہاتھ میں تھی اور پیشانی سے خون بہہ رہا تھا۔

۵۔ ایک روایت ہے کہ سید صاحب کے متعلق پوچھا کہاں ہیں؟ لوگوں نے اس ہجوم کی طرف اشارہ کیا جہاں گھمسان کا رن تھا۔ مولانا ادھر چلے گئے۔

یہ تمام روایتیں اصل میدان جنگ کے متعلق ہیں جو بالاکوٹ اور مٹی کوٹ کے ٹیلے کے درمیان تھا۔ لیکن شاہ صاحب کی قبر وہاں سے دور مشرق میں ست بنے کے نالے کے پاس ہے۔ یقین ہے کہ وہ وہیں شہید ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ لڑتے لڑتے سکھوں کے دباؤ کے باعث پیچھے ہٹتے گئے۔ آخر ست بنے کے نالے تک آ کر شہادت پائی۔ ارباب بہرام خان کی قبر بھی ساتھ ہی تھی۔ اس لیے خیال ہے کہ دونوں ساتھ ہی شہید ہوئے۔

تیسرا باب

سیّد صاحب کے بھانجے

سیّد محمد علی | سیّد محمد علی بن سیّد عبدالسبحان بن سیّد محمد عثمان (عمِ محترم سیّد احمد شہید) بن سیّد محمد نور بن سیّد محمد ہدیٰ بن شاہ علم اللہ۔ سیّد عبدالسبحان کی شادی سیّد احمد شہید کی علاتی ہمشیرہ سیّدہ نجیبہ سے ہوئی تھی۔ ان سے چار فرزند ہوئے، جن میں سب سے بڑے سیّد محمد علی تھے۔ تاریخ ولادت معلوم نہیں، قیاس یہ ہے کہ سیّد احمد شہید سے کم و بیش چار برس بڑے ہوں گے۔ سیّد عبدالسبحان غالباً لکھنؤ میں ملازم تھے۔ وہیں شوال ۱۲۱۲ھ (فروری یا مارچ ۱۷۹۸ء) میں عبدالقادر خاں جائسی کے مکان واقع اسمٰعیل گنج میں فوت ہوئے۔ خاندانی حالات کے متعلق ایک قلمی رسالے میں بیتِ تاریخِ وفات یوں مرقوم ہے:

زرضواں چو جستیم تاریخ فوت
بگفتا کہ خوش آمدی مرحبا

۱۲ ۱۲

سفرِ حج | سیّد محمد علی کی توجہ ابتدا ہی سے تحصیل علم پر مبذول رہی۔ سوانح نگاروں نے انھیں "فاضلِ گراں مایہ" لکھا ہے۔ سیّد صاحب عموماً انھیں "مُلّا" کہہ کر پکارتے تھے۔ لکھنؤ کے پہلے سفر میں سیّد صاحب کے ساتھ تھے، لیکن دہلی تک ساتھ نہ جا سکے۔ سیّد صاحب حج کے لیے تیار ہوئے تو دوسرے اقربا کی طرح سیّد صاحب نے سیّد محمد علی کو بھی دعوت دی۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتدا میں تنہا تیار ہوئے۔ سیّد صاحب نے پوچھا کہ بال بچوں کو کیوں ساتھ نہیں لیتے تو انھوں نے عذر کیا۔ سیّد صاحب نے فرمایا:

بھائی! شاید موت کا ڈر ہے۔ بالفرض والتقدیر موت پیش بھی آجائے تو نہیں سنا کہ مرگ با انبوہ جشنے دارد؟ مع ہذا حج وغیرہ کا ثواب ملے گا۔ نیز شرفِ شہادت، جس کا جویا ہر مسلمان ہے۔

اس کے بعد سید محمد علی نے اہل وعیال کو بھی ساتھ لے لیا۔ سفر حج کے بیشتر حالات انھیں کی زبانی ہمیں معلوم ہوئے۔

ٹونک کی زندگی ہجرت میں شریک سفر نہ ہوئے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد ٹونک میں مقیم ہو گئے تھے۔ نواب وزیر الدولہ اونچا عہدہ دینا چاہتے تھے۔ سید محمد علی نے عذر پیش کر دیا اور اپنے خرچ کا اندازہ کر کے صرف پچاس روپے ماہانہ وظیفہ قبول کیا۔ غالباً اسی زمانے میں مخزن احمدی لکھی جو سید صاحب کے ابتدائی حالات کے متعلق واحد مستند ذریعہ معلومات ہے۔ ابتدا میں قندھاریوں کی چھاؤنی (لکھنؤ) میں بہت رہتے تھے اور سیکڑوں لوگ ان کے معتقد ہو گئے تھے۔ آپ نے ہمیشہ سادہ فقیرانہ زندگی بسر کی۔ ۴- ذی الحجہ سنہ ۱۲۷۴ھ (۱۱- اکتوبر ۱۸۵۸ء) کو ٹونک میں وفات پائی۔ فارسی بے تکلف لکھتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ "مخزن احمدی" میں ان کی کئی نظمیں ہیں۔ سید ابوالحسن علی نے لکھا ہے کہ آزاد منش اور بے تکلف بزرگ تھے۔

ازواج و اولاد ان کی پہلی شادی بی بی علیمہ بنت سید محمد مرتضیٰ سے ہوئی۔ اس بی بی کے بطن سے ایک فرزند سید نورالہدیٰ تھے اور دو بیٹیاں۔ دوسری شادی سے تین بیٹے ہوئے اور ایک بیٹی۔

سید نورالہدیٰ سنہ ۱۲۴۲ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۹۹ھ میں ہیضے سے وفات پائی۔ وہ ٹونک میں بخشی الملک بن گئے تھے اور سید نورالہدیٰ خاں بہادر ہیبت جنگ کا خطاب پایا۔ ان کے بڑے فرزند سید عثمان والد کے عہدے پر مامور ہوئے اور چھوٹے فرزند سید محمد کو نظامت کا عہدہ ملا۔ سید عثمان نے ضلع فتح پور میں تین گاؤں خرید لیے تھے۔

سید احمد علی سید احمد علی بن سید عبدالسبحان، سید احمد شہید کے دوسرے بھانجے۔ آپ سے عمر میں دو برس بڑے تھے۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ "بہت صالح، ذی علم، ذی وقار اور صاحب دین و دیانت تھے"۔ ان کی شادی قاضی سید رحیم کی صاحبزادی بی بی زینب سے ہوئی تھی۔ ابتدا میں بمقام لکھنؤ ملازم تھے۔ سید صاحب کے ساتھ مع اہل وعیال حج کیا۔ سید صاحب کے جو پانچ ہزار روپے رسالدار نصیر محمد خاں کے پاس بطور امانت جمع تھے، وہ سید احمد علی ہی لے کر کلکتہ گئے تھے اور جاتے ہوئے ستر روپے میں شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے اردو ترجمۂ قرآن کا مخطوطہ خرید لیے گئے تھے جس کی نقل عبداللہ نے

بہ غرضِ طباعت حاصل کی تھی۔

جہاد حج سے مراجعت پر غالباً اپنے پہلے مشاغل میں مصروف رہے۔ سفرِ ہجرت میں سید صاحب کے ساتھ نہ گئے۔ جس زمانے میں سید صاحب بنیر و سوات کا دورہ کر رہے تھے تو مجاہدین کا قافلہ لے کر سرحد پہنچے اور مختلف جنگوں میں شریک رہے۔ جنگِ امب میں اس فوج کے سالار تھے جس نے ستھانہ کی جانب سے پیش قدمی کی تھی۔ سید صاحب مشوروں میں بھی انھیں شریک رکھتے تھے۔

عزمِ پھولڑہ فتحِ امب کے بعد ہزارہ میں پیش قدمی کا فیصلہ ہوا تو سید صاحب نے مشیروں سے پوچھا کہ کسے امیرِ لشکر بنایا جائے؟ سید احمد علی بھی اس مجلس میں شریک تھے۔ انھوں نے خلافِ معمول کہا کہ میں یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ مجھے ساتھیوں کے انتخاب کی اجازت دی جائے۔ سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ سید احمد علی نے پہلے کسی موقع پر ایسی پیش کش نہ کی تھی اور انھیں بھیجنے کا سید صاحب کو خیال بھی نہ تھا۔ وہ خود تیار ہو گئے تو سید صاحب نے انھیں اجازت دے دی۔ اپنی سواری کا گھوڑا ان کے حوالے کر دیا اور سید احمد علی کی خواہش کے مطابق وہ سیاہ قبا بھی انھیں دے دی جو سید صاحب نے ۲۷۔ رمضان ۱۲۴۵ھ (۲۲۔ مارچ ۱۸۳۰ء) کی رات کو عبادت کرتے وقت پہنی تھی۔ چنانچہ سید احمد علی شوال ۱۲۴۵ھ کے اواخر یا ذی قعدہ کے اوائل میں ضلع ہزارہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

لشکر کی تقسیم مجاہدین کے پاس کشتیاں زیادہ نہ تھیں اور پورے لشکر کو دریا کے پار اتارنے میں بہت وقت لگتا، نیز اندیشہ تھا کہ بہ حالتِ عبور سکھوں سے تصادم نہ ہو جائے، اس لیے لشکر کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تین مختلف گھاٹوں سے پار اترنے کا حکم دے دیا گیا۔ مولوی محمد حسن رامپوری تھانہ دار (سید احمد علی کے مشیرِ خاص تھے) عبورِ دریا کے بعد سید احمد علی نے وہ راستہ اختیار کیا جسے آج کل لستاں کا راستہ کہتے ہیں۔ وہ لستاں سے شاہ کوٹ پہنچے اور اس پر قبضہ جماتے ہوئے پھولڑہ میں داخل ہو گئے۔ بستی سے باہر مانسہرہ کے راستے پر خیمہ زن ہو گئے۔ باقی دونوں لشکر بھی مختلف راستوں سے پھولڑہ پہنچ گئے اور انھوں نے سید احمد علی کے قریب ڈیرے ڈال دیے۔ جو مقامی خوانین ساتھ تھے، انھوں نے بستی میں قیام کیا۔

آغازِ جنگ مورخین کا بیان ہے کہ سید صاحب نے لشکر کی روانگی کے وقت سید احمد علی کو جو

ہدایتیں دی تھیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ دامن کوہ کو کسی حالت میں بھی نہ چھوڑنا۔ پھولڑہ پہنچے تو ساتھیوں کے مشورے سے انھوں نے میدان میں اقامت اختیار کر لی۔ مانسہرہ کی جانب سے سکھوں کا لشکر آنے کی افواہ تھی، اس لیے اونچی جگہ پہرے بٹھا دیے اور انھیں تاکید کر دی کہ سکھ لشکر کو دیکھتے ہی بندوقیں سر کر دیں۔ دو دن اطمینان سے گزر گئے۔ تیسرے دن صبح کی اذان ہوئی مجاہدین نماز کی تیاری میں لگ گئے۔ بعض وضو کر کے سنتیں پڑھ رہے تھے، بعض وضو ہی کر رہے تھے کہ پہریداروں کی بندوقیں سر ہوئیں۔ یہ سکھ لشکر کی آمد کا اعلان تھا۔ وہ سب سوار تھے اور اس تیزی سے میدان میں پہنچ گئے کہ مجاہدین کو صف بندی کا موقع بھی نہ مل سکا۔

شہادت سید احمد علی فوراً قبلہ رو کھڑے ہو کر دعا مانگنے لگے۔ ساتھیوں کو بھی پکار کر کہا۔ دعا ختم نہ ہوئی تھی کہ سکھ سوار سر پر آ پہنچے۔ انھوں نے پہلے سے ایک منصوبہ تیار کر لیا تھا۔ میدان میں پہنچتے ہی وہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں منقسم ہو کر ادھر ادھر بکھر گئے۔ مجاہدین بھی ان کے تعاقب میں منتشر ہو گئے۔ یہ حالت دیکھتے ہی سکھ سوار گھوڑے دوڑا کر اکٹھے ہو گئے اور انھوں نے زبردست اجتماعی حملے شروع کر دیے۔ مجاہدین چونکہ پیدل تھے اس لیے جلد مجتمع ہو کر مقابلے پر نہ جم سکے اور یہ حالت انتشار جا بجا شہید ہو گئے۔

سید احمد علی اور میر فیض علی گورکھپوری یکجا تھے۔ دونوں اپنی جگہ قائم رہ کر مردانگی سے لڑتے رہے۔ سید احمد علی کا سنگ چقماق خراب ہو گیا اور بندوق سے کام لینے کی کوئی صورت نہ رہی۔ چنانچہ وہ نالی پکڑ کر بندوق کو لٹھ کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ آخر نیزوں، تلواروں اور گولیوں کے زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ اسی حالت میں وفات پائی۔ راویوں نے بیان کیا ہے کہ ان کے بے شمار زخم لگے، لیکن سب زخم جسم کے اگلے حصے میں تھے۔ پچھلے حصے میں خراش تک نہ آئی۔

خبرِ شہادت پھولڑہ سے جو قاصد لڑائی کی خبر لے کر راج گیا، وہ دریا سے پار اترا تو سید صاحب نے دُور سے اسے دیکھ لیا۔ وہ پہلے میاں عبدالقیوم سے ملا۔ وہ چند لمحے بعد زمین پر بیٹھ گئے۔ سید صاحب نے فرمایا: قاصد کو بلاؤ، وہ کیسی خبر لایا جسے سنتے ہی میاں عبدالقیوم زمین پر بیٹھ گئے۔ محبوب بھانجے کی شہادت کی خبر سنی تو بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اِنّا للہ و اِنّا الیہ راجعون پڑھتے ہوئے فرمایا: الحمدللہ وہ جو

مراد لے کر آئے تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اس مراد کو پہنچایا ۔ ایک روایت ہے کہ قاصد نے جب بیان کیا کہ شمشیر و نیزہ کے تمام زخم سید احمد علی کے چہرے پر لگے تو پھر آنسو جاری ہو گئے ۔ آپ الحمد للہ الحمد للہ کہتے تھے دونوں ہاتھوں سے آنسو پونچھتے جاتے تھے ۔

سید احمد علی اگرچہ بھانجے تھے لیکن سید صاحب ہمیشہ انھیں "بھائی" کہہ کر پکارتے تھے ۔ ماموں بھانجے میں رضاعت کا رشتہ بھی تھا ۔ تمام بھانجوں میں انھیں کے ساتھ سب سے زیادہ محبت تھی ۔ خود سید صاحب کا بیان ہے کہ سید احمد علی بچی بات کہنے میں مراعات ادب کی بھی پروا نہ کرتے تھے ۔

اولاد آپ کا نکاح سیدہ زینب دختر قاضی سید رحیم سے ہوا ۔ تین فرزند ہوئے : سید زین العابدین عرف عابد میاں ، سید موسیٰ عرف حسن مثنیٰ (شہید جنگ مایار) اور سید ابو القاسم ۔ تین صاحبزادیاں تھیں : سیدہ بتول ، سیدہ حمیرا ، سیدہ صدیقہ ۔

سید موسیٰ سید موسیٰ جن کا دوسرا نام حسن مثنیٰ تھا ، سید احمد علی شہید پھوڑہ کے منجھلے صاحبزادے تھے ۔ اپنے بھائی سید ابو القاسم کی طرح یہ بھی سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے آئے ۔ سید ابو القاسم کو سید صاحب نے بعض کاموں کے لیے واپس بھیج دیا ۔ سید موسیٰ ساتھ رہے ۔ جب سے ان کے والد شہید ہوئے تھے ، بہت غمگین اور بے چین رہتے تھے ۔ کبھی کبھی اپنے رفیقوں سے کہتے کہ اب کسی لڑائی میں جانے کا اتفاق ہوا تو ان شاء اللہ میں بھی لڑ کر شہید ہو جاؤں گا ۔

مجروحیت سید صاحب کو اپنے شہید بھانجے کے جگر بند کی یہ کیفیت معلوم تھی ۔ جنگ مایار کے دن سید موسیٰ سواروں میں شامل تھے ۔ غازیوں کا لشکر تورو سے مایار کی جانب چلا تو سید صاحب نے سید موسیٰ سے فرمایا کہ اپنا گھوڑا کسی بھائی کو دے دو اور خود ہمارے ساتھ پیادوں میں شامل ہو جاؤ ۔ عرض کیا : مجھے سواروں ہی میں رہنے دیجیے ۔ سید صاحب نے زیادہ اصرار نہ کیا ۔ سواروں نے درانیوں پر حملہ کیا تو سید موسیٰ دشمن کی صفوں میں گھس کر خوب لڑے ۔ آخر زخموں سے دونوں ہاتھ بیکار ہو گئے ۔ کئی زخم سر میں لگے اور بے بس ہو کر گر گئے ۔

جنگ کے بعد زخمیوں اور شہیدوں کی دیکھ بھال شروع ہوئی تو خادے خاں قندھاری ان کے

پاس پہنچے۔ خان موصوف کا بیان ہے کہ ایک جگہ دور سے اللہ اللہ کی آواز آئی۔ نزدیک جا کر دیکھا تو سید موسیٰ تھے۔ سر کے زخموں سے اتنا خون بہا تھا کہ ان کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ اس حالت میں بھی سب سے پہلے یہ پوچھا کہ کون ہو اور فتح کس کی ہوئی؟ خادے خاں نے نام بتایا اور ساتھ ہی کہا کہ سید بادشاہ کو خدا نے فتح دی۔ یہ سن کر بولے: "الحمد للہ"۔

سید صاحب کے ارشادات خادے خاں انھیں اٹھا کر بیلے بابا کی مسجد کے حجرے میں لے گیا۔ پھر دوسرے زخمیوں کے ہمراہ انھیں تورو بھیج دیا گیا۔ سید صاحب انھیں دیکھنے گئے تو فرمایا یہ فرزند توفیق الٰہی سے بڑا بہادر نکلا۔ مالک حقیقی کا حق خوب ادا کیا۔ پھر سید موسیٰ سے کہا:

بیٹا! لکھنؤ میں دیکھا ہوگا کہ لوگ شیطان کے اکسانے سے فاحشہ عورتوں کے لیے یا کسی کے سامنے متکبرانہ کھانس کر لڑائی چھیڑ لیتے ہیں اور اس میں اپنے ہاتھ پاؤں کھو بیٹھتے ہیں۔ اس طرح ان کا ثمرہ دنیا میں حمیت جاہلیت اور عقبیٰ میں عذاب الیم ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمھارے ہاتھ پاؤں راہ مولا میں کام آئے۔

اب اگر دیکھو کہ کوئی شخص خوش رفتار گھوڑے پر سوار اسے دوڑاتا کداتا ہوا جا رہا ہے تو کبھی یہ حسرت دل میں نہ لانا کہ میرے ہاتھ پاؤں سلامت ہوتے تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔ تمھارے ہاتھ پاؤں بارگاہ ربانی میں قبول ہوئے۔ خوش نصیب ہیں وہ ہاتھ پاؤں جو رضائے مولا میں قربان ہوں اور اس پاک ذات کی خاطر کٹیں جو جہانوں کی پناہ گاہ ہے۔ اگر کسی کو شمشیر برہنہ کے ساتھ پٹا بازی کرتے ہوئے دیکھو تو یہ غم دل میں نہ لانا کہ میرے ہاتھ پاؤں ہوتے تو ایسے ہی جوہر دکھاتا۔ تمھارے دست و پا کو بڑا رتبہ ملا۔ ان زخموں کے عوض میں ثواب عظیم حاصل ہوا۔ سالم ہاتھ پاؤں والے کو ہر روز فتنۂ گناہ در پیش ہے۔ تمھارے جوارح کو پروردگار رحیم کی بارگاہ میں بہت شاندار اجر ملے گا۔

شانِ صبر و شکیب سید موسیٰ نے صابرانہ عرض کیا۔ میں ہزار زبان سے اللہ کی رضا پر راضی اور شاکر ہوں۔ الحمد للہ کہ میری ہستی نیک ترین عبادت میں صرف ہوئی۔ خدا اسے قبول کرے لیکن

آپ سے ایک آرزو ہے:

ہر روز خود تکلیف اٹھا کر اپنے جمالِ مبارک سے آنکھیں منور فرماتے رہیے۔ میں معذور ہو چکا ہوں۔ خود آپ کی مجلس میں حاضر نہیں ہو سکتا۔ اس کے سوا مجھے کوئی آرزو نہیں اور نہ حسرت۔

وفات سید موسیٰ کو تو رستہ سے پنجتار پہنچا دیا گیا۔ علاج باقاعدہ ہوتا رہا لیکن ان کے زخم اچھے نہ ہوئے۔ پنجتار سے انھیں بھکا اڑہ پہنچا دیا گیا جو بلحاظ آب و ہوا بہتر تھا۔ سید صاحب کی اہلیہ بھی تیمارداری کے لیے ساتھ گئیں۔ شیخ حسن علی اور ان کے عزیز بھی ہمراہ تھے۔ جب سید صاحب نے وسط رجب ۱۲۴۶ھ میں ہجرت ثانیہ کا قصد کیا اور پنجتار سے وادیٔ پکھلی کی جانب روانہ ہوئے تو بھکا اڑہ پیغام بھیج دیا کہ سب لوگ لنگلی پہنچ کر انتظار کریں۔ چنانچہ سید صاحب کی اہلیہ، سید موسیٰ اور دوسرے حضرات پہلے پہنچ گئے۔ مولوی سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ میں سید موسیٰ کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ سخت بیمار تھے اور بار بار امیر المومنین کا پوچھتے تھے۔ سید صاحب نے صرف سید موسیٰ کی خاطر لنگلی میں دو دن گزارے۔ شدت علالت کے باعث انھیں وہیں چھوڑ دیا اور تیسرے دن روانہ ہو گئے۔ دو روز بعد سید موسیٰ نے وفات پائی اور لنگلی کی خاک میں ابدی نیند سوئے۔

ان کا نکاح سید محمد علی کی صاحبزادی صدیقہ سے ہوا تھا۔ لیکن اولاد کوئی نہ ہوئی۔ غالباً رخصتی بھی نہ ہوئی تھی۔ اس سیدہ کا نکاح بعد ازاں سید محمد یعقوب سے ہوا۔ سید موسیٰ کے دو بھائی سید ابوالقاسم اور سید زین العابدین ٹونک میں مقیم رہے۔

سید حمید الدین یہ سید صاحب کے تیسرے بھانجے تھے۔ سید محمد علی شہید سے چھوٹے اور سید عبدالرحمٰن سے بڑے۔ تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ شعر بھی کہتے تھے اور حمیدی ان کا تخلص تھا۔ ابتدا ہی سے سید صاحب کے ساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ سفر حج میں ساتھ رہے۔ سفر ہجرت میں بھی ساتھ تھے۔ وہی تھے جو مختلف منازل سے سفر کے حالات خطوط کی شکل میں لکھ کر عزیزوں کو بھیجتے رہے۔ یہ خطوط تین ہیں، ایک کے سوا سب محفوظ ہیں۔ نہ صرف حالات سفر کا بہترین

مختلف ملکوں میں مشاہدات سفر کی تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور جغرافیائی تفصیلات بھی نہایت عمدگی سے بیان کی گئی ہیں۔ جب سید صاحب پنجتار سے تشریف لے گئے تو سید حمید الدین اور بعض دوسرے اصحاب کو کارِ خاص کی غرض سے ہندوستان بھیج دیا گیا۔ سید حمید الدین نے خود، جسے ایک خط میں لکھا تھا کہ میں نے اپنی برادری کے آدمیوں کا ایک الگ جیش بنا لیا ہے۔

سید صاحب کی زندگی میں یا ان کی شہادت کے بعد سید حمید الدین نے ٹونک میں اقامت اختیار کر لی تھی۔ نواب وزیر الدولہ نے انھیں میر منشی کے عہدے پر مامور کر دیا۔ نواب کی نظروں میں وہ اس درجہ معزز و معتمد تھے کہ حکمران خاندان کے بعض افراد نے سرکشی کے بعد فرمانبرداری اختیار کی تو سید حمید الدین ہی کی وساطت سے وہ دربار میں حاضر ہوئے۔ ۱۰۔ جمادی الثانی ۱۲۹۲ھ (اکتوبر ۱۸۹۵ء) کو شام کے وقت ٹونک میں وفات پائی۔ بڑے ہی متشرع، پرہیزگار، زاہد و دیندار تھے۔ ان کے دو فرزند تھے، سید محمد سعید اور سید عبد المجید۔ یہ ٹونک میں مقیم رہے اور ان کی اولاد اب تک وہاں موجود ہے۔

سید عبدالرحمٰن: یہ سید صاحب کے سب سے چھوٹے بھانجے تھے اور خاندان کے لوگ انھیں چھوٹے میاں کہتے تھے۔ قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ "سید احمد شہید" میں بتایا جا چکا ہے کہ ایک موقع پر تہجد کے وقت اٹھ کر سورۂ روم کا ایک رکوع حفظ کر رہے تھے۔ سید صاحب نے رکوع سن لیا اور صبح کی نماز کے بعد بتایا کہ مراقبہ توجہ الی اللہ کا مضمون یہی ہے۔

سید صاحب معتمد الدولہ آغا میر کی دعوت پر لکھنؤ گئے تھے تو راستے میں سے سید عبدالرحمٰن کو پہلے بھیج دیا تھا کہ قندھاریوں کی چھاؤنی میں اپنا مکان صاف کرا کے فرش بچھا رکھیں، نیز کچھ چنے بھنوا لیں، نمک مرچ اور گڑ بھی لے لیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سید عبدالرحمٰن نے لکھنؤ کے کسی جیش میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

سندھ میں اقامت: سید صاحب کے ساتھ ہجرت کی۔ ٹونک پہنچنے کے بعد انھیں رائے بریلی واپس بھیج دیا گیا تا کہ سید صاحب کے اہل و عیال کو لے آئیں۔ پھر اس دنیا میں سید صاحب سے ملاقات کی سعادت نصیب نہ ہوئی۔ سید عبدالرحمٰن پہلے خاندان کی مستورات کے ساتھ ٹونک پہنچے۔

پھر سندھ گئے اور سید صاحب کے انتظام کے مطابق پیرکوٹ میں سید صبغۃ اللہ شاہ کے پاس ٹھہر گئے، جن کے خاندان نے بعد میں پیر پگاڑو کے نام سے ہمہ گیر شہرت حاصل کی۔ سید صاحب چاہتے تھے کہ اہل و عیال اور دوسرے متعلقین کو اپنے ساتھ سرحد بلوالیں لیکن درانی سرداروں کی عداوت کے باعث راستے مندوش ہو گئے تھے اور اہل و عیال کے محفوظ پہنچنے کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔ اسی حالت میں سید صاحب نے بالاکوٹ میں شہادت پائی اور اہل و عیال کے لیے آگے جانے کا سوال ہی باقی نہ رہا۔

سید عبدالرحمن نے تمام متعلقین کے ساتھ تقریباً دس سال سندھ ہی میں گزارے۔ جس زمانے میں مولوی سید نصیرالدین دہلوی احیائے تحریکِ جہاد کے ارادے سے ہجرت کر کے سندھ پہنچے تھے، سید عبدالرحمن وہیں موجود تھے لیکن پیرکوٹ سے میرانِ سندھ کی ملاقات کے لیے حیدرآباد گئے ہوئے تھے۔ مولوی سید نصیرالدین کو بھی وہیں بلا لیا اور میروں سے ان کی ملاقات کرائی۔ بعدازاں مولوی صاحب کی اعانت کے لیے غلام و گھوڑے برابر مستعد کر کے بھیجتے رہے۔ ایک اعلام نامے کے آخر میں اپنے قلم سے مندرجہ ذیل عبارت لکھی:

از نیازمندِ درگاہِ ایزدی عبدالرحمٰن	خدا کی درگاہ کے نیازمند عبدالرحمٰن کی
بخدمات سادات محبان و دوستان مکتوب الیہم	طرف سے ان محبوں اور دوستوں کو سلام
سلام برسد بمضمون واحد بود۔ لہٰذا علیحدہ ترقیم	پہنچے جن کے نام یہ اعلام نامہ بھیجا جا رہا ہے
ننمود۔ ضعیف را بہرصورت در اہتمام این	مضمون واحد تھا اس لیے علیحدہ نہ لکھا۔ میں
مہم وانند و وسع و امکان خود را صرف این	بہرحال اس مہم کے اہتمام میں مشغول ہوں۔
عبادتِ عظمٰی گردانند۔[1]	آپ حضرات بھی اپنی ہر قوت و طاقت اس
	بڑی عبادت یعنی جہاد میں صرف کریں۔

بقیہ زندگی تاریخ ٹونک سے معلوم ہوتا ہے کہ میر علی بہادر خاں والی خیرپور نے سید عبدالرحمن کو اپنے مصاحبوں میں شامل کر لیا تھا۔ ۱۲۶۳ھ (۱۸۴۶ء) میں نواب وزیرالدولہ نے انھیں دعوت دے کر اپنے پاس بلا لیا۔ چنانچہ وہ سید صاحب کے اہل و عیال اور دوسرے متعلقین کے ساتھ سندھ سے تشریف لائے

---

[1] اخبار مولوی نصیرالدین مخطوطہ ص۳۵۔

نواب نے انھیں قطب الامراء بہادر مظفر جنگ کا خطاب دے کر اپنے مشیروں اور مصاحبوں میں شامل کر لیا نیز اپنی سپاہ خاص کا جرنیل مقرر کیا۔ باقی عمر انھوں نے اسی عہدے پر گزاری۔

ان کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی سید صاحب کے بڑے بھائی سید ابراہیم کی صاحبزادی سیدہ ناصرہ سے ہوئی۔ ان کے بطن سے ایک صاحبزادہ تھا سید عبدالرزاق۔ یہ لاولد فوت ہو گیا۔ دوسری شادی مولوی سید حیدر علی دیوان ٹونک کی صاحبزادی نجم النسا بیگم سے ہوئی۔ ان کے بطن سے صرف دو لڑکیاں تھیں۔

سید محمد یعقوب پر سید صاحب کے بڑے بھائی سید ابراہیم کے صاحبزادے تھے۔ ان سے سید صاحب کا دوہرا رشتہ تھا۔ اس لیے ان کی والدہ سیدہ فاطمہ سید صاحب کی دوسری اہلیہ سیدہ ولیہ کی حقیقی بہن تھیں۔ اس لیے سید صاحب کو بہت عزیز تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ سب کے سامنے فرمایا کہ میں خدا اور اس کے رسول برحق کی اطاعت میں عزیزوں یا رشتہ داروں میں سے کسی کی خوشی ناخوشی کو خاطر میں نہ لاؤں گا:

اس وقت مجھے سب سے زیادہ محمد یعقوب عزیز ہے۔ دنیا کی چیزوں میں سے وہ جو چاہے لے لے لیکن خدا اور اس کے رسول کے احکام بجا لانے میں اس کی بھی رعایت نہ کروں گا۔

بقیہ زندگی سید صاحب کے ساتھ حج کے لیے گئے۔ آپ کے ساتھ ہجرت کی لیکن انھیں بھی سید عبدالرحمن کے ساتھ ٹونک سے واپس بھیج دیا تھا۔ پھر یہ مستورات کے ساتھ سندھ میں رہے۔ وہاں سے ٹونک واپس آئے۔ نواب وزیرالدولہ انھیں بڑا عہدہ دینا چاہتے تھے لیکن قبول نہ کیا۔ پچاس روپے وظیفہ لے لیا۔ اسی میں عمر گزاری۔ نہایت متقی اور پرہیزگار تھے۔ احکام شرعیہ کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔

۱۲۸۶ھ (۱۸۶۹ء) میں فوت ہوئے۔ ان کے تین صاحبزادے تھے: سید یوسف، سید ایوب اور سید ابراہیم۔ سید صاحب کی چھوٹی صاحبزادی سیدہ ہاجرہ کی شادی سید یوسف سے ہوئی تھی۔ سیدہ ہاجرہ کا انتقال ۶۔ ربیع الآخر ۱۲۷۶ھ (۲۔ نومبر ۱۸۵۹ء) کو ہوا۔ سید یوسف نے ۷۔ صفر ۱۲۷۶ھ (۹۔ جون ۱۸۵۹ء) کو بعارضۂ فالج تکیہ رائے بریلی میں وفات پائی۔ ان کی اور ان کے بھائیوں کی اولاد ٹونک میں موجود ہے۔

چوتھا باب

مولانا محمد یوسف پھلتی

یہ غالباً شاہ ولی اللہ کے بھائی شاہ اہل اللہ کے پوتے تھے۔ نواب وزیرالدولہ نے لکھا ہے کہ علم میں "بے مثل" اور عمل میں "بے بدل" تھے[1]۔ سید صاحب راجبوتانہ سے دہلی پہنچے تو انھوں نے مولانا عبدالحی اور مولانا شاہ اسمٰعیل سے پہلے سید صاحب سے بیعت کی اور ترقی مدارج میں وہ مقام حاصل کیا کہ ان دونوں بزرگوں کے لیے باعث رشک بنے رہے۔ ارادت اور خدمت گزاری میں کوئی ان کے برابر نہ پہنچ سکا۔ سید صاحب نے ذکر و فکر اور مراقبے کے بجائے بندوق، تلوار اور دوسرے ہتھیار چلانے کی مشق کا حکم دیا تاکہ جہاد کا سرو سامان ہو سکے تو مولانا محمد یوسف نے ایسی مشق بہم پہنچائی کہ پے بہ پے بندوقیں چلاتے تھے اور ایک مرتبہ سر کرکے دوسری مرتبہ بھرنے اور سر کرنے میں تین بار پلک جھپکنے سے زیادہ دیر نہ لگتی تھی[2]۔

ابتدا ہی سے سید صاحب نے اپنے اور جماعت کے تمام انتظامی امور مولانا محمد یوسف کے حوالے کر دیے تھے۔ انھیں کے پاس روپیہ جمع ہوتا۔ وہی چیزیں خریدتے۔ انھیں کے پاس حساب کتاب رہتا۔ جب کام بڑھ گیا تو سید صاحب نے ان کی امداد کے لیے مزید آدمی مقرر کر دیے۔ حافظ قرآن تھے۔ قضائے حوائج بشری کے سوا قرآن ہر وقت ان کی زبان پر جاری رہتا تھا۔ رمضان شریف میں روزانہ ایک مرتبہ قرآن شریف ضرور ختم کر لیتے۔ کچھ حصہ تراویح میں سناتے، باقی تہجد میں پڑھتے[3]۔

شانِ اتقا سید صاحب نے ایک مرتبہ انھیں راستے ہی میں سے مظفر نگر یا سہارن پور گھوڑا لانے کے لیے بھیجا جو کسی شخص نے بطور نذر پیش کیا تھا۔ یہ آئے، وطن راستے میں پڑتا تھا۔ عام مقامات کی طرح

---

[1] وصایا حصہ دوم صفحہ ۔ [2] ایضاً [3] ایضاً

وہاں بھی صرف ایک رات ٹھہرے۔ اس سے زیادہ قیام نہ کیا اس لیے کہ سید صاحب نے ایک خاص کام کے لیے بھیجا تھا اور اس سلسلے میں دوسرا کام گوارا نہ ہوا۔ عزیزوں نے ہر چند کہا کہ ایک آدھ دن کے زیادہ قیام میں مضائقہ نہیں۔ مولانا نے قبول نہ کیا۔ اس سے بھی حیرت انگیز تر امر یہ ہے کہ واپسی میں گھوڑا ساتھ تھا تاہم ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سوار نہ ہوئے۔ اس لیے کہ وہ سید صاحب کا تھا اور ان کی کوئی چیز اذن و اجازت کے بغیر اپنے مصرف میں لانا ان کی شان اتقاء کے منافی تھا۔

علالت: جنگ شیدو کے بعد سید صاحب نے بنیر و سوات کا دورہ شروع کیا تو دوسرے رفقاء کی طرح مولانا محمد یوسف بھی ساتھ تھے۔ اسی سفر میں وہ بیمار ہوئے اور بیماری مسلسل بڑھتی رہی۔ غالباً ضیق النفس کا عارضہ تھا۔ شدید علالت کے باوجود نہ یہ سید صاحب سے مفارقت پر راضی تھے اور نہ سید صاحب کو یہ پسند تھا کہ انھیں کسی مقام پر چھوڑ جائیں۔ دورے کے سلسلے میں سید گل بادشاہ پشاوری نے ایک جھپان سید صاحب کی سواری کے لیے بھیج دیا تھا۔ آپ نے مولانا محمد یوسف کو اس میں سوار کرا کے ساتھ لے لیا۔ ادریچ سے نکلے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ایک گاؤں کے لوگوں نے آپ کو روک لیا اور عرض کیا کہ پاس کے گاؤں والوں سے ہماری کشمکش چلی آ رہی ہے آپ صلح کرا دیں۔ سید صاحب وہاں مسجد میں ٹھہر گئے اور گاؤں والوں کو بلا کر صلح کے لیے بات چیت شروع کر دی۔ زیادہ تر ساتھی قریب کے ایک بڑے گاؤں میں چلے گئے۔ سید صاحب مسجد ہی میں تھے کہ میاں دین محمد نے حاضر ہو کر عرض کیا: مولوی محمد یوسف کو بڑی تکلیف ہے۔ سید صاحب نے فرمایا: بھائی! بارگاہ الٰہی میں دعا کیجیے اور ان کی خدمت میں حاضر رہیے۔

علاج: مجمع میں پاس کے گاؤں کا بھی ایک آدمی تھا۔ وہ بولا کہ ہمارے ہاں دو تین آدمی طبابت کرتے ہیں۔ مولوی صاحب کو ان کے پاس بھیج دیجیے۔ سید صاحب نے فرمایا: تندرستی اور بیماری اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لوگوں نے علاج کی ضرورت پر زیادہ زور دیا تو سید صاحب نے اجازت دے دی۔ چار آدمی مولانا محمد یوسف کی چارپائی اٹھا کر پاس کے گاؤں میں لے گئے۔ میاں عبدالقیوم بھی ساتھ تھے۔

وفات: راویوں کا بیان ہے کہ گاؤں پہنچ کر بیماری شدید صورت اختیار کر گئی۔ مولانا نے اسی حالت میں کہا کہ میرا دل ساتن پیاز کھانے کو چاہتا ہے اور تھوڑا سا دہی بھی لاؤ۔ تیمارداروں نے عرض کیا کہ

کھچڑی تیار ہے، وہی کھانی چاہیے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تو صرف نان پیاز کھاؤں گا۔

غرض اسی گاؤں میں طبیعت اس درجہ بگڑ گئی کہ بظاہر جانبری کی کوئی امید نہ رہی۔ اس حالت میں مولانا نے کہا: جس طرح بھی ممکن ہو مجھے جلد سے جلد حضرت کی خدمت میں پہنچاؤ تاکہ جان دینے سے پہلے ان کی زیارت کا شرف حاصل کر سکوں۔ چارپائی اٹھانے والوں کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ جلد مل نہ سکے، اس لیے کہ فصل کے درد کا موسم تھا۔ لوگ باہر کھیتوں میں مصروف تھے۔ دیر ہو گئی تو مولانا نے فرمایا: مجھے اٹھا کر تھاؤ۔ سہارا دے کر بٹھا دیا گیا۔ اسی حالت میں اس پاک نفس مجاہد کی روح عالم علوی میں پہنچ گئی۔

ولی اللہ | سید رستم علی چلگانوی گھوڑے پر سوار ہو کر یہ دردناک خبر سید صاحب کے پاس لائے۔ آپ اس وقت تک مسجد ہی میں تشریف فرما تھے۔ سنتے ہی کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا:

یہ دنیا بڑی سخت جگہ ہے، جو یہاں سے ثابت قدم گیا وہی خوش نصیب ہے۔

یہ اشارہ تھا کہ مولانا محمد یوسف اس دنیا سے ثابت قدم گئے۔ سید صاحب دیر تک مولانا کے اوصاف بیان فرماتے رہے۔ اہل پھلت میں سے شیخ ضیاء الدین، شیخ صلاح الدین، شیخ عبدالحکیم، شیخ ناصر الدین اور حافظ عبدالرحمن کو میت لانے کے لیے بھیج دیا۔ اہل سرحد مُردوں کو عموماً ان قبرستانوں میں دفن کرنا افضل سمجھتے تھے، جہاں کسی مشہور بزرگ کی قبر ہوتی۔ جس گاؤں میں مولانا فوت ہوئے، وہاں بھی ایک بزرگ دفن تھے، اس لیے اہل دہ نے عرض کیا کہ مولانا کو یہیں دفن کرنے کی اجازت دیجیے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہمارے مولوی صاحب خود ولی اللہ تھے، ان کی میت یہاں لے آیئے۔

لشکر اسلام کے قطب | قاضی احمد اللہ میرٹھی نے غسل و کفن کا انتظام کیا۔ سید صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر مولانا شاہ اسمٰعیل سے مخاطب ہو کر فرمایا:

یوسف جی اس لشکر اسلام کے قطب تھے۔ آج لشکر قطب سے خالی ہو گیا۔ وہ بڑے قانع، زاہد، متوکل، مستقیم الحال اور مستقل مزاج تھے۔

یہ الفاظ زبان پر جاری تھے اور آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل نے

اس ماہ تک موجودگی ثابت ہے، ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی۔ مولانا کا انتقال ایک گاؤں میں ہوا جو [illegible] اور [illegible] کے درمیان تھا، نام معلوم نہیں۔

کمال دیانت | نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ غلّے اور دوسری ضروری چیزوں کی تقسیم مولانا محمد یوسف کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا تھا، سب کو اسی کے مطابق غلّہ دیتے۔ سیّد صاحب بھی مستحق رہتے۔ کبھی کبھی آپ مولانا یوسف سے مزاحاً فرماتے کہ مجھے زیادہ کیوں نہ دیا۔ مولانا ادب سے عرض کرتے: حکم ہو تو پوری جنس خدمتِ والا میں حاضر کر دیتا ہوں، مگر جب حضرت نے تقسیم کا حکم دے رکھا ہے، اس میں مساوات کو ترک نہیں کر سکتا۔

نواب موصوف ہی کا بیان ہے: ایک مرتبہ سیّد صاحب عشا کی نماز ادا کر کے مائل بہ استراحت تھے کہ پینے کے لیے پانی مانگا۔ مولانا یوسف کوزہ بھر کر لائے۔ اسی اثنا میں سیّد صاحب کی آنکھ لگ گئی۔ مولانا کوزہ ہاتھ میں لیے چپ چاپ کھڑے رہے کہ جب بیدار ہوں گے، پانی پیش کروں گا۔ آخر شب سیّد صاحب بیدار ہوئے تو پانی حاضر کیا۔ رات بھر کھڑے رہ کر ارادت کا جو شاندار نمونہ پیش کیا تھا، سیّد صاحب نے اس کی تحسین فرمائی اور مولانا کے لیے دعا کی۔

وصایا میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ مولانا یوسف اشرف رفقا اور اکرم خدام سے تھے۔ امانت میں بے مثل اور دیانت میں بے بدل۔[1]

---

[1] زیادہ تر حالات نواب وزیر الدولہ کے وصایا سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو حصہ دوم صفحہ ۱۱۰ تا ۱۹۲۔

پانچواں باب

سیّد ابو محمد اور سیّد ابو الحسن

سید ابو محمد نصیر آبادی سید صاحب کی زوجۂ اولیٰ بی بی زہرہ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ بڑے خوب صورت اور خوش رو جوان تھے۔ لباس بھی بہت عمدہ پہنتے تھے۔ برسوں لکھنؤ میں ملازم رہے۔ اہل اللہ کمیدان کی پلٹن میں جمعدار تھے۔ سپہ گری کے علاوہ مختلف فنون میں طاق تھے۔ گھوڑے کی سواری میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ کھانا بہت اچھا پکاتے تھے۔ آئینہ سامنے رکھ کر اپنا خط خود بنا لیتے۔ کپڑے قطع کرنے اور سینے میں بھی کمال حاصل تھا۔ ہمیشہ پر تکلف لباس پہنتے تھے۔ اس لیے ہر مجمع میں ممتاز ہوتے۔ سید صاحب سے ملنے کے لیے تکیہ شریف میں آتے تو لوگ ان کا پر تکلف لباس دیکھ کر پوچھتے، حضرت! یہ کون ہیں؟ سید صاحب جواب دیتے، یہ ہمارے بھائی ہیں۔ عادت شریف کے مطابق انھیں ٹوکنے میں عجلت کبھی نہ کی۔ گویا اصلاح اخلاق و عادات کے ایک حاذق طبیب کی طرح معلوم تھا کہ سید ابو محمد کی طبیعت کس نہج پر چل رہی ہے اور وہ کہاں پہنچ کر علاج کی تمام منزلیں طے کر لے گی۔

ہجرت سید صاحب نے ہجرت میں قدم رکھا تو دوسرے عزیزوں کی طرح یہ بھی رخصتی ملاقات کے لیے تکیہ شریف پہنچے اور رائے بریلی سے ڈلمؤ تک ساتھ گئے۔ لوگوں نے پوچھا، سید ابو محمد! کیا آپ بھی جہاد کے لیے جا رہے ہیں؟ جواب دیا، نہیں ہم تو صرف میاں[1] صاحب کو چھوڑنے آئے ہیں۔ ڈلمؤ سے ایک دو منزل آگے چل کر پوچھا تو پھر یہی جواب دیا۔ ٹونک میں یہ سوال دہرایا گیا تو فرمایا: اجمیر قریب ہے۔ خیال ہے کہ اسے بھی دیکھتے چلیں۔ اجمیر سے بھی واپس نہ ہوئے تو سب پر آشکارا ہوا کہ گھر سے معیت کا پختہ ارادہ کر کے آئے تھے۔

بیعت رضا مختلف جنگوں میں شریک رہے۔ سرحد پہنچنے کے بعد تمام تکلفات چھوڑ دیے تھے۔ بالکل

[1] خاندان کے تمام لوگ سید صاحب کو میاں صاحب ہی کہتے تھے۔

معمولی لباس پہنتے اور مجاہدین میں جو رسد تقسیم ہوتی اسی پر قناعت کرتے۔ جنگ مایار کے لیے تو روز سے روانہ ہونے لگے تو گھوڑا تھان پر چھوڑ کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوے اور عرض کیا:

میاں صاحب! جس روز سے میں آپ کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں، یہی سمجھتا رہا کہ آپ میرے عزیز اور رشتہ دار ہیں۔ آپ کو عروج ہوگا تو میرے لیے بھی ترقی اور بہبود کی صورت نکلے گی نہ میری معیت خدا کے واسطے تھی، نہ ثواب جان کر کسی لڑائی میں شامل ہوا۔ اب اس فاسد خیال سے توبہ کرتا ہوں۔ اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ رضائے باری تعالیٰ کے لیے جہاد کی بیعت لیں اور دعا کریں کہ خدا اس نیت اور ارادے پر ثابت قدم رکھے۔

عزمِ جنگ سید صاحب نے بیعت لی اور دعا کی۔ موقع کی نزاکت اور سید ابو محمد کی شان خلوص دیکھ کر حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دعا کے بعد ابو محمد نے سید صاحب سے معانقہ کیا۔ پلٹ کر گھوڑے کی طرف چلے تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہ رہے تھے۔ بسم اللہ کہ کر دایاں پاؤں رکاب میں رکھا سوار ہوتے ہی پکار کر کہا:

بھائیو! گواہ رہنا، اب تک ہم شان و شوکت اور خواہش نفس کے لیے گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ خدا کا اس میں کچھ واسطہ نہ تھا۔ اب ہم محض خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے بہ نیت جہاد سوار ہوتے ہیں۔

شہادت یہ بھی سواروں میں شامل تھے۔ چھیدا ان کے گھر کا آدمی تھا۔ اس کا بیان ہے کہ جب درانیوں نے ہمارے سواروں پر یورش کی اور غازی پیچھے ہٹے تو سید ابو محمد بھی ان میں شامل تھے۔ وہ کچھ دور جا چکے تھے کہ میں درانی سواروں میں گھر گیا۔ گھبرا کر انھیں مدد کے لیے آواز دی۔ میری آواز سنتے ہی باگ موڑی اور اکر درانی سواروں سے لڑنے لگے۔ میں موقع پا کر نکل گیا۔ وہ لڑتے رہے۔ میں نے دور سے دیکھا کہ انھوں نے دو درانی سواروں کو مار گرایا۔ پھر خود بھی زخم کھا کر گھوڑے سے گر گئے۔

قاضی حمید الدین بوجھ ولی شیوہ سے تو روحاں رہے تھے۔ مایار میں توپوں کی آواز سنی تو چاہا کہ جنگ میں شریک ہوں۔ میدان میں پہنچے تو درانی شکست کھا کر جا چکے تھے اور مولوی مظہر علی کو شہدا کی لاشیں

اور [illegible] اٹھوانے کا حکم ہو چکا تھا۔ سید صاحب نے قاضی گل کو بھی اسی کام پر مامور کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں:

میں نے ایک جگہ سید ابو محمد کو زخمی پڑے ہوئے دیکھا۔ زخم ایسے کاری تھے کہ ان کے ہوش و حواس بجا نہ تھے۔ میں نے کئی بار ان کے کان میں پکار کر کہا: سید ابو محمد! حضرت امیرالمومنین کو فتح حاصل ہوئی۔ وہ ہونٹ چاٹ رہے تھے اور آہستہ آہستہ الحمد للہ الحمد للہ کر رہے تھے۔ مجھے کچھ جواب نہ دیا۔ میں نے ساتھیوں کو آواز دی کہ انھیں اٹھاؤ۔ کمبل میں رکھ کر اٹھایا۔ کچھ دیر بعد جاں بحق ہو گئے۔

اخلاق و عادات اور کمالات سید ابو محمد کے متعلق ایک خاص ذریعے سے مزید معلومات حاصل ہوئیں جو ذیل میں درج ہیں:

آنکھ، ناک، رنگ، روپ میں بہت خوب صورت تھے۔ گھوڑا پھیرنے میں انھیں خاص کمال حاصل تھا۔ اکثر میخ زمین میں گاڑ لیتے۔ اس پر کوڑی رکھ دیتے۔ گھوڑا تیز دوڑاتے ہوئے انگی سے کوڑی اڑا دیتے اور میخ بدستور گڑی رہتی۔ کیا امکان کہ انگی میخ میں لگے۔ اپنے گھوڑے کی مالش خود کرتے۔

اہل اللہ کمیدان ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ خاص کام انھیں سے لیتے۔ انھوں نے ایک نہایت نفیس درباری لباس تیار کرا رکھا تھا، جسے وقتاً فوقتاً پہنتے۔ لوگ سمجھتے کہ سو ڈیڑھ سو سے کم کے ملازم نہ ہوں گے۔ عام لباس یہ تھا: سر پر پگڑی، چست انگرکھا، غرارہ دار پاجامہ۔ پندرہ بیس وضع کی پگڑی باندھ سکتے تھے۔ اپنا خط خود بناتے۔ ٹھوڑی پر سے داڑھی کتر کر صاف کرتے۔ نہ کبھی حقہ پیا، نہ کوئی نشہ استعمال کیا۔ نہ کبھی کسی نامحرم عورت کی طرف نگاہ اٹھائی۔ نہ منہیات شرعیہ کے نزدیک گئے۔ کسی کے ہاتھ کا کھانا پسند نہ تھا۔ خود کھانا پکانے کے ماہر استاد تھے۔ اپنا کپڑا خود قطع کرتے۔ لحاف، رضائی، مرزئی میں روئی ایسی عمدگی سے بھرتے کہ ندافوں کی عقل دنگ رہ جاتی۔ مزاج میں لطافت و نفاست بہت زیادہ تھی۔

جذبۂ خدمت سید صاحب کی معیت اختیار کر لینے کے بعد یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ غریب، امیر، اپنے بیگانے، کسی کی تیمارداری یا خدمت گزاری میں نہ ننگ و عار تھی اور نہ کراہت و کاہلی کے روادار ہوتے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے، اپنے ہاتھ سے بول و براز اٹھاتے۔ بڑے خوش اخلاق اور بے شر انسان تھے۔ کبھی کسی سے جھگڑا نہ کیا۔ بے ضرورت کبھی کہیں نہ گئے۔

سیّد ابوالحسن

سید ابوالحسن بھی نصیرآبادی کے تھے۔ جماعت میں انھیں عموماً دادا ابوالحسن کہا جاتا تھا۔ یہ بھی پہلے بنی اللہ کی بٹالین میں جمعدار تھے۔ سید صاحب کے ساتھ ہجرت کی لیکن اجمیر تک کسی کو خبر نہ ہونے دی کہ ہجرت کا پختہ ارادہ کر کے نکلے ہیں۔ یہ جماعت نظامیہ کے علمدار تھے۔ نشان صیغۃ اللہ انھیں کے پاس رہتا تھا۔ جنگ بالاکوٹ میں سید صاحب مسجد بالا سے نکلے تھے تو دادا ابوالحسن اپنے نشان کے ساتھ آگے آگے تھے۔ مسجد زیریں سے نکل کر سید صاحب نے سکھوں پر حملہ کیا تھا، تو تھوڑی دور چل کر ایک جگہ توقف فرمایا تھا۔ دادا ابوالحسن اس وقت بھی ساتھ تھے۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ میدان جنگ کے کس حصے میں اور کس حال میں شہادت پائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بالاکوٹ ہی میں شہید ہوئے۔

چھٹا باب

قاضی محمد حبّان

قاضی سید محمد حبّان کانڑہ (غوریند) سرحد آزاد، کے باشندے تھے۔ بہت بڑے عالم، ذکی الطبع، تیز اور خوش تقریر تھے۔ منظورہ میں ہے :

مرد شجیع و اورع، صاحب علم نافع و — صدر درجہ شجاع و متقی، ان کا علم نفع بخش تھا
فہم کامل و طبع تیز — فہم کامل اور طبیعت تیز

غالباً ہندوستان میں رہ کر علم حاصل کیا اور کچھ مدت کلکتہ کے کسی مدرسے میں مدرس بھی رہے۔ سید صاحب خہر میں تھے، جب یہ ملاقات کے لیے آئے۔ سید صاحب سے عرض کیا کہ میں آسودہ حال ہوں۔ روپیہ پیسہ خدا نے دے رکھا ہے۔ کسی دنیوی چیز کی احتیاج نہیں۔ صرف خدا کے لیے آیا ہوں۔ دل پر اثر ہوگا تو بیعت کروں گا ورنہ واپس چلا جاؤں گا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بیعت کیجیے، اللہ تعالیٰ برکت دے گا۔ بیعت و مراقبہ کے بعد قاضی صاحب نے کہا کہ میں اندھا تھا : آنکھیں کھل گئیں۔ کافر تھا، مسلمان ہو گیا۔ سید صاحب نے فرمایا : یوں نہ کہیے۔ یہ کہیے کہ پہلے ہی سے مسلمان تھا، اب ایمان ترقی کر گیا۔

قاضی القضاۃ اس وقت سے قاضی صاحب نے وابستگی اختیار کی۔ پھر آخری دم تک سید صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا۔ سادات ستھانہ اور ارباب بہرام خاں تہکالی کے سوا سرحد کے کسی شخص کو سید صاحب کی معیت میں عظمت و رفعت کا وہ مقام نصیب نہ ہوا، جس پر قاضی حبّان فائز رہے۔ بیعت اقامت شریعت کے بعد سید صاحب نے انھیں قاضی القضاۃ مقرر فرما دیا تھا۔ چنانچہ خود ایک مکتوب میں جو بیعت مذکورہ ہو جانے کے بعد لکھا گیا تھا، فرماتے ہیں :

در مجلس مجمع یک فاضل جلیل متدین را — بسی مجمع را مجمع برائے اقامت شریعت)

منصب قضا سپردہ شد و دستار قضا بر سرِ او بستہ شد و منشورِ قضا بہ او دادہ شد[1]	میں ایک بلند مرتبہ عالم اور دیندار کو منصب قضا سونپ دیا گیا۔ دستارِ قضا اس کے سر پر باندھ دی گئی اور قضا کا فرمان اس کے حوالے کر دیا گیا۔

صلح و جنگ اور اصلاح و ارشاد کے سلسلے میں مختلف تدبیروں پر غور و خوض کے لیے حقیقی مجلسیں منعقد ہوتیں ان سب میں سید حبان شریک ہوتے تھے۔ چونکہ وہ مقامی آدمی تھے اور اپنے ہاں کے حالات کو بہتر سمجھتے تھے اس لیے ان کے مشورے بہت مفید و کار آمد سمجھے جاتے تھے۔ سردار پائندہ خاں تنولی کی ضد کے باعث جنگ کی نوبت آئی اور وہ شکست کھا کر دریا کے پار چلا گیا تو قاضی حبان ہی کی کوشش سے صلح ہوئی تھی۔ قاضی صاحب نے پائندہ خاں سے ملاقات کے بعد ایسی بے باکانہ گفتگو کی کہ خان کے لیے فوراً صلح کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

ایک لطیفہ قاضی صاحب فصلِ خصومات کے لیے علاقے کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ سرحدی لوگ دریا میں ننگے نہانے کے عادی ہو چکے تھے۔ انھیں بہت منع کیا لیکن حسب دلخواہ اثر نہ ہوا۔ مجبوراً حکم دے دیا گیا کہ جو شخص ننگا نہاتا ہوا پکڑا جائے، اسے جرمانے کی سزا دی جائے۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب دورہ کرتے ہوئے کھبل پہنچے۔ وہاں ایک شخص نے تواضعاً قاضی صاحب کو تازہ مچھلی پکا کر کھلائی۔ اتفاق سے دوسرے یا تیسرے روز وہ ننگا نہاتا ہوا پکڑا گیا۔ مقدمہ قاضی صاحب کے روبرو پیش ہوا۔ جرم ثابت ہو گیا اور قاضی صاحب نے حسب ضابطہ آٹھ آنے جرمانہ کر دیا۔ اس نے جوش اور خفگی کے عالم میں کہا کہ قاضی صاحب جرمانہ تو کر دیا، لیکن مچھلی معاف نہ کروں گا۔ قاضی صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ مچھلی ہضم ہو چکی۔ اب تمھاری معافی کی احتیاج نہیں، جو ضابطہ جاری ہے، وہ ٹل نہیں سکتا۔

اہلِ رسوم کا معاملہ ایک مرتبہ قاضی صاحب نے وعظ فرمایا کہ اہلِ رسوم خدا و رسول کے احکام کے خلاف باپ دادا کی ریت پر چلتے ہیں۔ شریعت کا حکم سنایا جائے تو نہیں مانتے۔ وہ لوگ عملاً کافر ہیں۔ اس لیے کہ

---

[1] رسالہ پریلی والے خطوط کا مجموعہ صفحہ ۱۲۔

پنچایت کو خدا اور رسولؐ کے احکام پر ترجیح دیتے ہیں۔ قاضی صاحب کا ایک شاگرد اس پر سختی سے پابند ہو گیا۔ ایک روز اس نے کسی ملا سے گفتگو کرتے ہوئے یہی بات دہرائی تو اس نے کہا کہ قاضی حبان جھوٹ کہتا ہے۔ یہ بات قاضی صاحب تک پہنچی تو انھوں نے اس شخص کو بلا کر واقعہ دریافت کیا۔ وہ بولا: میں نے کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ اہل رسوم کافر نہیں۔ پوچھا: کس کتاب میں؟ جواب دیا: "منیۃ المصلی" میں۔ قاضی صاحب یہ سنتے ہی جوش میں آگئے۔ اسے زمین پر گرا کر گھونسوں سے مارنے لگے کہ منقول پڑھتا ہے منیۃ المصلی اور مسئلہ بیان کرتا ہے اہل رسوم کا! جن کتابوں میں اہل رسوم کے مسائل ہیں، وہ تو تیرے استادوں نے بھی نہ پڑھی ہوں گی۔ توبہ کر اور کلمہ پڑھ، ورنہ تجھے چھوڑنے کا نہیں۔ چنانچہ کلمہ پڑھوا کر چھوڑا۔

انتظام عشر

پائندہ خان سے سید صاحب کی صلح ہو گئی تو قاضی حبان نے خود یہ تجویز پیش کی کہ ہزارے کے میدانی علاقے کے لوگ خود سر سے ہو رہے ہیں۔ جنھوں نے بطیب خاطر ادائے عشر کا اقرار کیا تھا وہ اب بے پروا نظر آتے ہیں۔ اگر مجھے پچاس بیس سے ہمراہ کر دیں تو وعظ و نصیحت سے سارے علاقے کو پابند شریعت بنا دوں۔ جو نہ مانیں ان سے بزور منواؤں۔ شرط یہ ہے کہ مجھے اس لشکر کا امیر بنا کر پورے اختیارات دے دیجیے، اس لیے کہ میں مقامی آدمی ہوں۔ اپنے ہم وطنوں کی طبیعت و مزاج کو خوب جانتا ہوں۔ ایسا امیر یہاں اور کوئی نہیں۔ شاہ اسمٰعیل کو میرے ساتھ کر دیجیے تاکہ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا و رسولؐ کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو شاہ صاحب مجھے روک دیں۔ سید صاحب نے یہ رائے قبول فرمالی۔ قریباً چھ سو سوار اور پیادے قاضی صاحب کے ہمراہ کر دیے۔ ان کے ساتھ نقارہ، شتری اور چھ جھنڈیاں بھی تھیں۔ رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ یہ خدا و رسولؐ کا کام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس میں نفس کی خواہش دخیل ہو جائے۔

قاضی صاحب نے پورے علاقے کا دورہ کیا اور ہر جگہ شرعی احکام نافذ کر دیے۔ کھلابٹ کے لوگوں نے مخالفت کا ارادہ کیا، لیکن قاضی صاحب ایسے انداز میں بستی پہنچ گئے کہ کسی کو مخالفت کی جرأت نہ ہوئی۔ اس سلسلے میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے، ان کے نام یہ ہیں: ٹوپی، شیخ جانا، تواکلی، کھلابٹ، مرز، ٹھنڈکوئی، کدا، شیخ پیر، ہنڈ، زیدہ، شیوہ، چارگلی، ستم، گھڑیالی، اسمٰعیلہ، امان زئی۔

وہاں بھی صرف ایک رات ٹھہرے۔ اس سے زیادہ قیام نہ کیا۔ اس لیے کہ سید صاحب نے ایک تاجر
کام کے لیے بھیجا تھا اور اس سلسلے میں دوسرا کام گوارا نہ ہوا۔ عزیزوں نے ہر چند کہا کہ ایک آدھ دن کے
زیادہ قیام میں مضائقہ نہیں۔ مولانا نے قبول نہ کیا۔ اس سے بھی حیرت انگیز امر یہ ہے کہ واپسی میں گھوڑا
ساتھ تھا، تاہم ایک میل کے لیے بھی اس پر سوار نہ ہوئے؛ اس لیے کہ وہ سید صاحب کا تھا اور ان کی
کوئی چیز اذن و اجازت کے بغیر اپنے مصرف میں لانا ان کی شان اتقا کے منافی تھا۔

علالت | جنگ شیدو کے بعد سید صاحب نے بنیر و سوات کا دورہ شروع کیا تو دوسرے رفقا
کی طرح مولانا محمد یوسف بھی ساتھ تھے۔ اسی سفر میں وہ بیمار ہوئے اور بیماری مسلسل بڑھتی رہی۔ غالباً
ضیق النفس کا عارضہ تھا۔ شدید علالت کے باوجود وہ سید صاحب سے مفارقت پر راضی نہ تھے، ورنہ
سید صاحب کو یہ پسند تھا کہ انھیں کسی مقام پر چھوڑ جائیں۔ دورے کے سلسلے میں سید گل بادشاہ پشاوری
نے ایک تختہ پان سید صاحب کی سواری کے لیے بھیج دیا تھا۔ آپ نے مولانا محمد یوسف کو اس میں سوار کرا کے
ساتھ لے لیا۔ اوچ سے نکلے ہوئے تیسرا دن تھا کہ ایک گاؤں کے لوگوں نے آپ کو روک لیا اور عرض کیا کہ
پاس کے گاؤں والوں سے ہماری کشمکش چلی آ رہی ہے، آپ صلح کرا دیں۔ سید صاحب وہاں مسجد میں ٹھہر
گئے اور گاؤں والوں کو بلا کر صلح کے لیے بات چیت شروع کر دی۔ زیادہ تر ساتھی قریب کے ایک دوسرے
گاؤں میں چلے گئے۔ سید صاحب مسجد ہی میں تھے کہ میاں دین محمد نے حاضر ہو کر عرض کیا: مولوی محمد یوسف
کو بڑی تکلیف ہے۔ سید صاحب نے فرمایا: بھائی! بارگاہ الٰہی میں دعا کیجیے اور ان کی خدمت میں حاضر رہیے۔

علاج | مجھے میرے پاس کے گاؤں کا بھی ایک آدمی تھا۔ وہ بولا کہ ہمارے ہاں دو تین آدمی طبابت
کرتے ہیں، مولوی صاحب کو ان کے پاس بھیج دیجیے۔ سید صاحب نے فرمایا: تندرستی اور بیماری اللہ
تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ لوگوں نے علاج کی ضرورت پر زیادہ زور دیا تو سید صاحب نے اجازت دے دی۔
چار آدمی مولانا محمد یوسف کی چارپائی اٹھا کر پاس کے گاؤں میں لے گئے۔ میاں عبدالقیوم بھی ساتھ تھے۔

وفات | راوی کا بیان ہے کہ گاؤں پہنچ کر بیماری نے شدید صورت اختیار کر لی۔ مولانا نے اس حالت
میں کہا کہ میرے دل میں چاول کھانے کی خواہش ہے اور تھوڑا سا دہی بھی لاؤ۔ تیمارداروں نے عرض کیا کہ

کھچڑی تیار ہے، وہی کھانی چاہیے۔ مولانا نے فرمایا کہ میں تو صرف نان پیاز کھاؤں گا۔

غرض اسی گاؤں میں طبیعت اس درجہ بگڑ گئی کہ بظاہر جانبری کی کوئی امید نہ رہی۔ اس حالت میں مولانا نے کہا: جس طور بھی ممکن ہو، مجھے جلد سے جلد حضرت کی خدمت میں پہنچاؤ تاکہ جان دینے سے پہلے ان کی زیارت کا شرف حاصل کرسکوں۔ چارپائی اٹھانے والوں کی تلاش شروع ہوئی۔ وہ جلد مل نہ سکے اس لیے کہ فصل کے درو کا موسم تھا۔ لوگ باہر کھیتوں میں مصروف تھے۔ دیر ہوگئی تو مولانا نے فرمایا: مجھے اٹھا کر بٹھاؤ۔ سہارا دے کر بٹھا دیا گیا۔ اسی حالت میں اس پاک نفس مجاہد کی روح عالم علوی میں پہنچ گئی۔

ولی اللہ سید رستم علی چانگا نوی گھوڑے پر سوار ہوکر یہ دردناک خبر سید صاحب کے پاس لائے۔ آپ اس وقت تک مسجد ہی میں تشریف فرما تھے۔ سنتے ہی کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا:

یہ دنیا بڑی سخت جگہ ہے، جو یہاں سے ثابت قدم گیا وہی خوش نصیب ہے۔

یہ اشارہ تھا کہ مولانا محمد یوسف اس دنیا سے ثابت قدم گئے۔ سید صاحب دیر تک مولانا کے اوصاف بیان فرماتے رہے۔ اہل جماعت میں سے شیخ ضیاء الدین، شیخ صلاح الدین، شیخ عبدالحکیم، شیخ ناصرالدین اور حافظ عبدالرحمن کو میت لانے کے لیے بھیج دیا۔ اہل سرحد مردوں کو عموماً ان قبرستانوں میں دفن کرنا افضل سمجھتے تھے، جہاں کسی مشہور بزرگ کی قبر ہوتی۔ جس گاؤں میں مولانا فوت ہوئے، وہاں بھی ایک بزرگ دفن تھے، اس لیے اہل دہ نے عرض کیا کہ مولانا کو یہیں دفن کرنے کی اجازت دیجیے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہمارے مولوی صاحب خود ولی اللہ تھے، ان کی میت یہاں لے آئیے۔

لشکر اسلام کے قطب قاضی احمد اللہ میرٹھی نے غسل و کفن کا انتظام کیا۔ سید صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔ پھر مولانا شاہ اسمٰعیل سے مخاطب ہوکر فرمایا:

یوسف جی اس لشکر اسلام کے قطب تھے۔ آج لشکر قطب سے خالی ہوگیا۔ وہ بڑے قانع، زاہد، متوکل، مستقیم الحال اور مستقل مزاج تھے۔

یہ الفاظ زبان پر جاری تھے اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ سید صاحب اور شاہ اسمٰعیل نے

اس واقعہ ناز و بود کی نیت لحد میں اتاری۔ مولانا کا انتقال ایک گاؤں میں ہوا جو اوجھ اور بھانجڑا کے درمیان تھا نام معلوم نہیں ۔

کمال دیانت

نواب وزیرالدولہ نے لکھا ہے کہ غلے اور دوسری ضروری چیزوں کی تقسیم مولانا محمد یوسف کے ہاتھ میں تھی۔ انھوں نے ایک پیمانہ مقرر کر لیا تھا۔ سب کو اسی کے مطابق غلہ دیتے۔ سید صاحب بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ کبھی کبھی آپ مولانا یوسف سے مزاحاً فرماتے کہ مجھے زیادہ کیوں نہ دیا۔ مولانا ادب سے عرض کرتے: حکم ہو تو پوری جنس خدمت والا میں حاضر کر دیتا ہوں، مگر مجھے حضرت نے تقسیم کا حکم دے رکھا ہے۔ اس میں مساوات کو ترک نہیں کر سکتا ۔

نواب موصوف ہی کا بیان ہے: ایک مرتبہ سید صاحب عشاء کی نماز ادا کر کے مائل بہ استراحت تھے کہ پینے کے لیے پانی مانگا۔ مولانا یوسف کوزہ بھر کر لائے۔ اس اثنا میں سید صاحب کی آنکھ لگ گئی۔ مولانا کوزہ ہاتھ میں لیے چپ چاپ کھڑے رہے کہ جب بیدار ہوں گے، پانی پیش کروں گا۔ آخر شب سید صاحب بیدار ہوئے تو پانی حاضر کیا۔ رات بھر کھڑے رہ کر ارادت کا جو شاندار نمونہ پیش کیا تھا، سید صاحب نے اس کی تحسین فرمائی اور مولانا کے لیے دعا کی ۔

" وصایا " میں ایک جگہ مرقوم ہے کہ مولانا یوسف اشرف زادہ اور اکرم خدام سے تھے۔ امانت میں بے نظیر اور دیانت میں بے بدل[1] ۔

---

[1] زیادہ تر حالات نواب وزیرالدولہ کے وصایا سے ماخوذ ہیں۔ ملاحظہ ہو حصہ دوم صفحہ ۱۱۰ تا ۱۹۴ ۔

پانچواں باب

سیّد ابو محمد اور سیّد ابو الحسن

سیّد ابو محمد نصیر آبادی سیّد صاحب کی زوجۂ اولیٰ بی بی زہرہ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ بڑے خوب صورت اور خوش رو جوان تھے۔ لباس بھی بہت عمدہ پہنتے تھے۔ برسوں لکھنؤ میں ملازم رہے۔ اہل اللہ کمیدان کی پلٹن میں جمعدار تھے۔ سپہ گری کے علاوہ مختلف فنون میں طاق تھے۔ گھوڑے کی سواری میں مہارت تامہ حاصل تھی۔ کھانا بہت اچھا پکاتے تھے۔ آئینہ سامنے رکھ کر اپنا خط خود بنا لیتے۔ کپڑے قطع کرنے اور سینے میں بھی کمال حاصل تھا۔ ہمیشہ پُر تکلف لباس پہنتے تھے۔ اس لیے ہر مجمع میں ممتاز ہوتے۔ سیّد صاحب سے ملنے کے لیے تکیہ شریف میں آتے تو لوگ ان کا پُر تکلف لباس دیکھ کر پوچھتے: حضرت! یہ کون ہیں؟ سیّد صاحب جواب دیتے: یہ ہمارے بھائی ہیں۔ عادت شریف کے مطابق انھیں ٹوکنے میں عجلت کبھی نہ کی۔ گویا مصلح اخلاق و عادات کے ایک حاذق طبیب کی طرح معلوم تھا کہ سیّد ابو محمد کی طبیعت کس نہج پر چل رہی ہے اور وہ کہاں پہنچ کر اصلاح کی تمام منزلیں طے کر لے گی۔

ہجرت سیّد صاحب نے ہجرت میں قدم رکھا تو دوسرے عزیزوں کی طرح یہ بھی رخصتی ملاقات کے لیے تکیہ شریف پہنچے اور رائے بریلی سے ڈلمؤ تک ساتھ گئے۔ لوگوں نے پوچھا: سیّد ابو محمد! کیا آپ بھی جہاد کے لیے جا رہے ہیں؟ جواب دیا: نہیں، ہم تو صرف میاں[1] صاحب کو چھوڑنے آئے ہیں۔ ڈلمؤ سے ایک دو منزل آگے چل کر پوچھا تو پھر یہی جواب دیا۔ ٹونک میں یہ سوال دہرایا گیا تو فرمایا: اجمیر قریب ہے۔ خیال ہے کہ اسے بھی دیکھتے چلیں۔ اجمیر سے بھی واپس نہ ہوئے تو سب پر آشکارا ہو گیا کہ گھر سے معیّت کا پختہ ارادہ کر کے آئے تھے۔

بیعت رضا مختلف جنگوں میں شریک رہے۔ سرحد پہنچنے کے بعد تمام تکلفات چھوڑ دیے تھے۔ بالکل

[1] خاندان کے تمام لوگ سیّد صاحب کو میاں صاحب ہی کہتے تھے۔

معمولی لباس پہنتے اور مجاہدین میں جو رسد تقسیم ہوتی اسی پر قناعت کرتے۔ جنگ مایار کے لیے تورو سے روانہ ہونے لگے تو گھوڑا حقان پر چھوڑ کر سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا:

میاں صاحب! جس روز سے میں آپ کے ساتھ گھر سے نکلا ہوں، یہی سمجھتا رہا کہ آپ میرے عزیز اور رشتہ دار ہیں۔ آپ کو عروج ہوگا تو میرے لیے بھی ترقی اور بہبود کی صورت نکلے گی نہ میری بیعت خدا کے واسطے تھی، نہ ثواب جان کر کسی لڑائی میں شامل ہوا۔ اب اس فاسد خیال سے توبہ کرتا ہوں۔ اس غرض سے حاضر ہوا ہوں کہ آپ رضائے باری تعالیٰ کے لیے جہاد کی بیعت لیں اور دعا کریں کہ خدا اس نیت اور ارادے پر ثابت قدم رکھے۔

عزم جنگ سید صاحب نے بیعت لی اور دعا کی۔ موقع کی نزاکت اور سید ابو محمد کی شان خلاص دیکھ کر حاضرین کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ دعا کے بعد ابو محمد نے سید صاحب سے مصافحہ کیا۔ پلٹ کر گھوڑے کی طرف چلے تو ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہ رہے تھے۔ بسم اللہ کہ کر دایاں پاؤں رکاب میں رکھا۔ سوار ہوتے ہی پکار کر کہا:

بھائیو! گواہ رہنا، اب تک ہم شان و شوکت اور خواہش نفس کے لیے گھوڑے پر سوار ہوتے تھے۔ خدا کا اس میں کچھ واسطہ نہ تھا۔ اب ہم محض خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے لیے بہ نیت جہاد سوار ہوتے ہیں۔

شہادت یہ بھی سواروں میں شامل تھے۔ چھیدا ان کے گھر کا آدمی تھا۔ اس کا بیان ہے کہ جب درانیوں نے ہمارے سواروں پر یورش کی اور غازی پیچھے ہٹے تو سید ابو محمد بھی ان میں شامل تھے۔ وہ کچھ دور جا چکے تھے کہ میں درانی سواروں میں گھر گیا۔ گھبرا کر انھیں مدد کے لیے آواز دی۔ میری آواز سنتے ہی باگ موڑی اور آکر درانی سواروں سے لڑنے لگے۔ میں موقع پا کر نکل گیا۔ وہ لڑتے رہے۔ میں نے دور سے دیکھا کہ انھوں نے دو درانی سواروں کو مار گرایا۔ پھر خود بھی زخم کھا کر گھوڑے سے گر گئے۔

قاضی گل احمد الدین پو ٹھوواری شیوہ سے تورو جا رہے تھے۔ مایار میں توپوں کی آواز سنی تو چاہا کہ جنگ میں شریک ہوں۔ میدان میں پہنچے تو درانی شکست کھا کر جا چکے تھے اور مولوی مظہر علی کو شہدا کی لاشیں

سیّد ابوالحسن

سیّد ابوالحسن بھی نصیر آبادی کے تھے۔ جماعت میں انھیں عموماً دادا ابوالحسن کہا جاتا تھا۔ یہ بھی پہلے اہل اللہ کی بٹالین میں جمعدار تھے۔ سیّد صاحب کے ساتھ ہجرت کی لیکن اجمیر تک کسی کو خبر نہ ہونے دی کہ ہجرت کا پختہ ارادہ کر کے نکلے ہیں۔ یہ جماعت خاص کے علمدار تھے۔ نشان صبغۃ اللہ انھیں کے پاس رہتا تھا۔ جنگ بالا کوٹ میں سیّد صاحب مسجد بالا سے نکلے تھے تو دادا ابوالحسن اپنے نشان کے ساتھ آگے آگے تھے۔ مسجد زیریں سے نکل کر سیّد صاحب نے سکھوں پر حملہ کیا تھا، تو تھوڑی دور چل کر ایک جگہ توقف فرمایا تھا۔ دادا ابوالحسن اس وقت بھی ساتھ تھے۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ میدان جنگ کے کس حصے میں اور کس حال میں شہادت پائی۔ اس میں شبہ نہیں کہ بالا کوٹ ہی میں شہید ہوئے۔

چھٹا باب

قاضی محمد حبّان

قاضی سید محمد حبّان کانڑا؛ غور بند (سرحد آزاد) کے باشندے تھے۔ بہت بڑے عالم، ذکی الطبع، غیور اور خوش تقریر تھے۔ منظورہ میں ہے :

مرد شجیع و اورع، صاحب علم نافع ۔ حد درجہ شجاع و متقی، ان کا علم نفع بخش تھا۔

فہم کامل و طبع تیز ۔ فہم کامل اور طبیعت تیز۔

غالباً ہندوستان میں رہ کر علم حاصل کیا اور کچھ مدت کلکتہ کے کسی مدرسے میں مدرس بھی رہے۔ سید صاحب شہر میں تھے، جب یہ ملاقات کے لیے آئے۔ سید صاحب سے عرض کیا کہ میں آسودہ حال ہوں۔ روپیہ پیسہ خدا نے دے رکھا ہے۔ کسی دنیوی چیز کی احتیاج نہیں۔ صرف خدا کے لیے آیا ہوں۔ دل پر اثر ہوگا تو بیعت کروں گا، ورنہ واپس چلا جاؤں گا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بیعت کیجیے، اللہ تعالیٰ برکت دے گا۔ بیعت و مراقبہ کے بعد قاضی صاحب نے کہا کہ میں اندھا تھا؛ آنکھیں کھل گئیں۔ کافر تھا، مسلمان ہوگیا۔ سید صاحب نے فرمایا: یوں نہ کہیے۔ یہ کہیے کہ پہلے ہی سے مسلمان تھا، اب ایمان ترقی کر گیا۔

قاضی القضاۃ اس وقت سے قاضی صاحب نے وابستگی اختیار کی۔ پھر آخری دم تک سید صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا۔ سادات ستھانہ اور ارباب بہرام خاں تہکالی کے سوا سرحد کے کسی شخص کو سید صاحب کی معیت میں عظمت و رفعت کا وہ مقام نصیب نہ ہوا، جس پر قاضی حبّان فائز رہے۔ بیعت اقامت شریعت کے بعد سید صاحب نے انھیں قاضی القضاۃ مقرر فرما دیا تھا۔ چنانچہ خود ایک مکتوب میں جو بیعت مذکورہ ہو جانے کے بعد لکھا گیا تھا، فرماتے ہیں :

در ہمیں مجمع یک فاضل جلیل متدین را ۔ اسی مجمع در مجمع برائے اقامت شریعت)

منصب قضا سپردہ شد و دستار قضا بر سراو بستہ شد و منشور قضا بر او دادہ شد[1]۔	میں ایک بلند مرتبہ عالم اور دیندار کو منصب قضا سونپ دیا گیا۔ دستارِ قضا اس کے سر پر باندھ دی گئی اور قضا کا فرمان اس کے حوالے کر دیا گیا۔

صلح و جنگ اور اصلاح و ارشاد کے سلسلے میں مختلف تدبیروں پر غور و خوض کے لیے جتنی مجلسیں منعقد ہوئیں ان سب میں سید حبان شریک ہوتے تھے۔ چونکہ وہ مقامی آدمی تھے اور اپنے ہاں کے حالات کو بہتر سمجھتے تھے، اس لیے ان کے مشورے بہت مفید و کارآمد سمجھے جاتے تھے۔ سردار پائندہ خان تنولی کی ضد کے باعث جنگ کی نوبت آئی اور وہ شکست کھا کر دریا کے پار چلا گیا تو قاضی حبان ہی کی کوشش سے صلح ہوئی تھی۔ قاضی صاحب نے پائندہ خاں سے ملاقات کے بعد ایسی بے باکانہ گفتگو کی کہ خان کے لیے فوراً صلح کر لینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔

ایک لطیفہ: قاضی صاحب فصلِ خصومات کے لیے علاقے کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ سرحدی لوگ دریا میں ننگے نہانے کے عادی ہو چکے تھے۔ انھیں بہت منع کیا، لیکن حسبِ دلخواہ اثر نہ ہوا۔ مجبوراً حکم دے دیا گیا کہ جو شخص ننگا نہاتا ہوا پکڑا جائے، اسے جرمانے کی سزا دی جائے۔ ایک مرتبہ قاضی صاحب دورہ کرتے ہوئے کھبل پہنچے۔ وہاں ایک شخص نے تواضعاً قاضی صاحب کو تازہ مچھلی پکا کر کھلائی۔ اتفاق سے دوسرے یا تیسرے روز وہ ننگا نہاتا ہوا پکڑا گیا۔ مقدمہ قاضی صاحب کے روبرو پیش ہوا۔ جرم ثابت ہو گیا اور قاضی صاحب نے حسبِ ضابطہ تھوڑا سا جرمانہ کر دیا۔ اس نے جوش اور شفقت کے عالم میں کہا کہ قاضی صاحب جرمانہ تو کر دیا، لیکن مچھلی معاف نہ کروں گا۔ قاضی صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ مچھلی تو ہضم ہو چکی۔ اب تمہاری معافی کی احتیاج نہیں، جو ضابطہ جاری ہے، وہ ٹل نہیں سکتا!

اہلِ رسوم کا معاملہ: ایک مرتبہ قاضی صاحب نے وعظ فرمایا کہ اہلِ رسوم خدا و رسول کے احکام کے خلاف باپ دادا کی ریت پر چلتے ہیں۔ شریعت کا حکم سنایا جائے تو نہیں مانتے۔ وہ لوگ گویا کافر ہیں، اس لیے کہ

---

[1] راے بریلی والے خطوط کا مجموعہ صفحہ ۲۱۔

یہی رسمیت کو خدا اور رسول کے احکام پر ترجیح دیتے ہیں۔ قاضی صاحب کا ایک شاگرد تھا جو سنت کا پابند
ہوگیا۔ ایک روز اس نے کسی ملا سے گفتگو کرتے ہوئے یہی بات دہرائی تو اس ملا نے کہا کہ قاضی حبان جھوٹ کہتا
ہے۔ یہ بات قاضی صاحب تک پہنچی تو انھوں نے اس شخص کو بلا کر واقعہ دریافت کیا۔ وہ بولا: میں نے
کسی کتاب میں دیکھا ہے کہ اہلِ رسوم کافر نہیں۔ پوچھا: کس کتاب میں؟ جواب دیا: "منیۃ المصلی" میں۔
قاضی صاحب یہ سنتے ہی جوش میں آ گئے۔ اسے زمین پر گرا کر گھونسوں سے مارنے لگے کہ او ملعون! پڑھتا ہے
منیۃ المصلی اور مسئلہ بیان کرتا ہے اہلِ رسوم کا! جن کتابوں میں اہلِ رسوم کے مسائل ہیں وہ تو تیرے استادوں
نے بھی نہ پڑھی ہوں گی۔ توبہ کر اور کلمہ پڑھ ورنہ تجھے چھوڑنے کا نہیں۔ چنانچہ کلمہ پڑھوا کر چھوڑا۔

انتظامِ عشر پاندہ خاں سے سید صاحب کی صلح ہوگئی تو قاضی حبان نے خود یہ تجویز پیش کی
کہ پکھلی کے میدانی علاقے کے لوگ خودسر سے ہو رہے ہیں جنھوں نے بطیب خاطر ادائے عشر کا اقرار کیا تھا
وہ بھی بے پروا نظر آتے ہیں۔ اگر مجھے چند سپاہی میرے ہمراہ کر دیں تو وعظ و نصیحت سے سارے علاقے کو پابند
شریعت بنا دوں۔ جو نہ مانیں، ان سے بزور منوا لوں۔ شرط یہ ہے کہ مجھے اس لشکر کا امیر بنا کر پورے اختیارات
دے دیجیے۔ اس لیے کہ میں مقامی آدمی ہوں۔ اپنے ہم وطنوں کی طبیعت و مزاج کو خوب جانتا ہوں۔ ایسا
آدمی یہاں اور کوئی نہیں۔ شاہ اسمٰعیل کو میرے ساتھ کر دیجیے تاکہ اگر مجھ سے نادانستہ کوئی فعل خدا اور رسول
کی رضا کے خلاف سرزد ہونے لگے تو شاہ صاحب مجھے روک دیں۔ سید صاحب نے یہ رائے قبول فرما لی۔
تقریباً چھ سو سوار اور پیادے قاضی صاحب کے ہمراہ کر دیے۔ ان کے ساتھ نقارہ، شتری اور چھ زنبورکیں
بھی تھیں۔ رخصت کرتے وقت نصیحت فرمائی کہ یہ خدا و رسول کا کام ہے۔ ایسا نہ ہو کہ اس میں نفس کی خواہش
داخل ہو جائے۔

قاضی صاحب نے پورے علاقے کا دورہ کیا اور ہر جگہ شرعی احکام نافذ کر دیے۔ کھلابٹ کے لوگوں نے
مخالفت کا ارادہ کیا لیکن قاضی صاحب ایسے انداز سے بستی میں پہنچ گئے کہ کسی کو مخالفت کی جرأت نہ ہوئی۔
اس سلسلے میں جن مقامات کا ذکر آیا ہے ان کے نام یہ ہیں: ٹوپی، شیخ جانا، نواکلی، کھلابٹ،
مرغز، گنڈکوئی، دکنا، پنج پیر، ہنڈ، زیدہ، شیوہ، چارگلی، سدھم، گھڑیالی، اسمٰعیلہ، امان زئی۔

مردان پر یورش | جونہی مردان کے رئیس نے مخالفت کا فیصلہ کر لیا اور وہ اپنے بھائی کو نائب بنا کر خود پشاور چلا گیا تاکہ وہاں سے مدد لے کر قاضی حبّان کا مقابلہ کرے۔ قاضی صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو شاہ اسمٰعیل، رسالدار عبد الحمید خاں وغیرہ سے مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ سب نے رائے دی کہ پیچھے ہٹنا مناسب نہیں۔ مردان پر یورش کر لی چاہیے۔ جو کچھ پیش آئے گا، دیکھا جائے گا۔ قاضی صاحب اس پر بہت خوش ہوئے اور قصبے پر یورش کا فیصلہ کر لیا۔

شہادت | انھوں نے جنگی مصلحتوں کو پیش نظر رکھ کر اقدام کیا اور قصبہ قبضے میں آ گیا۔ صرف گڑھی میں تھوڑی سی فوج لڑتی رہی۔ قاضی صاحب نے گڑھی پر قبضہ جمانے کی تدبیر یہ سوچی کہ خانہ بہ خانہ ہوتے ہوئے اس کے پاس پہنچ جائیں۔ تھوڑے سے آدمی ان کے ساتھ تھے۔ پیش قدمی کرتے ہوئے ایک گلی سامنے آ گئی۔ گڑھی سے گولیاں بارش کی طرح آ رہی تھیں اور گلی سے گزر کر دوسرے مکان میں پہنچنا سخت مشکل تھا لیکن قاضی صاحب نے رکنا پسند نہ کیا۔ ان کے چار پانچ ساتھی سلامت نکل گئے۔ پھر ایک شخص کے گولی لگی اور وہ شہید ہو گیا۔ دوسرے ریلے میں بھی کچھ آدمی بچ نکلے، کچھ شہید ہو گئے۔ آخر قاضی صاحب خود چند آدمیوں کے ساتھ آگے بڑھے۔ تمام ساتھی بچ گئے لیکن قاضی صاحب کے سر میں گولی لگی اور شہادت پائی۔

مدفن | گڑھی کی تسخیر تک یہ خبر مصلحتاً اخفا میں رکھی گئی۔ قاضی حبّان علم و فضل، غیرت و حمیت دینی اور زہد و تقویٰ میں سرحد کے یگانہ فرد تھے۔ اعلائے کلمۃ اللہ میں ان کی جرأت و بیباکی بے مثل تھی۔ تمام غازیوں کو ان کی شہادت سے سخت صدمہ پہنچا۔ سید صاحب بھی اس واقعے پر بہت متألم ہوئے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل چاہتے تھے کہ انھیں مردان ہی میں دفن کر دیں۔ لیکن قاضی حبّان کے بھائی راضی نہ ہوئے اور وہ اپنے قومی دستور کے مطابق میّت کو چارپائی پر ڈال کر وطن لے گئے۔

ساتواں باب

مولوی خیر الدین شیرکوٹی

ان کے ابتدائی حالات معلوم نہ ہو سکے۔ نہ یہ پتا چل سکا کہ مولوی صاحب نے کب سید صاحب سے بیعت کی اور کس قافلے میں سرحد پہنچے۔ ان کا نام پہلے پہل اس فوج کے سلسلے میں مذکور ہے، جو مولانا شاہ اسمٰعیل کی سرکردگی میں پکھلی (ہزارہ) بھیجی گئی تھی۔ ڈمگلہ پر شبخون میں یہ میاں محمد مقیم کے نائب و مشیر تھے۔ انھیں کے ایما پر غازی سکھ لشکر گاہ سے باہر آنے تھے اور مولوی صاحب خود ایک چھوٹی سی جماعت کے ساتھ اس وقت تک سکھوں کا مقابلہ کرتے رہے، جب تک غازیوں کا بڑا حصہ باہر نکل کر محفوظ مقام پر نہ پہنچ گیا۔

مختلف خدمات سید صاحب خہر سے واپس ہو کر پنجتار میں مقیم ہوئے تو مولوی خیر الدین کا ڈیرہ فصیل سے باہر تھا۔ پھر سید صاحب کے حکم سے انھوں نے اور مولوی احمد اللہ ناگپوری نے قاسم خیل میں گولے ڈھالنے کا کارخانہ بنا لیا تھا، جہاں ڈیڑھ سیر، تین سیر اور پانچ سیر کے گولے تیار ہوتے تھے۔ ہزارے خاں جنرل ونتورا کو صوبۂ سرحد پر چڑھا لایا تھا اور اس کا ارادہ یہ تھا کہ خود پنجتار پر حملہ کرے۔ پھر واپس ہو گیا اور سید صاحب کو لکھا کہ گفتگو کے لیے اپنا وکیل بھیج دیجیے۔ سید صاحب نے مولوی خیر الدین ہی کو بھیجا تھا۔ موصوف نے ونتورا کے تمام اعتراضات کا شافی جواب دیا۔ ونتورا تلخ ہو کر بولا تو مولوی صاحب نے بھی اسی کا انداز اختیار کر لیا۔ آخر میں کہہ دیا: آپ کو اپنے لشکر پر ناز ہو گا، ہمارا بھروسا اللہ پر ہے۔ اس کا لشکر سب سے زیادہ قوی ہے۔

سفارت سید صاحب نے ایک مرتبہ پائندہ خاں تنولی کی طلب پر بھی کچھ آدمی گفتگو کے لیے بھیجے تھے، ان میں بھی مولوی صاحب شامل تھے۔ پھر سکھوں کی طرف سے پیغام مصالحت موصول ہونے پر مولوی صاحب موصوف اور حاجی بہادر شاہ خاں کو بھیجا تھا۔ انھوں نے دوبارہ ونتورا اور ایلارڈ سے مفصل بات چیت کی۔

اس سلسلے میں علمی اور مذہبی مسئلے بھی زیرِ بحث آئے۔ مولوی صاحب نے نہایت اچھے انداز میں مسائل کی توضیح فرمائی اور تاریخی حوالوں سے اپنے موقف کو درست ثابت کیا۔ مگر سرحدی رؤسا سے عمدہ گھوڑے اور باز تحائف میں وصول کیا کرتے تھے۔ ونتورا نے حسنِ تدبیر سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ہم خلیفہ[۱] صاحب کو تحفے بھیجتے ہیں، خلیفہ صاحب بھی ہمیں تحفے بھیجیں، مثلاً گھوڑے مرحمت فرمائیں۔ مولوی صاحب نے فی الفور جواب دیا کہ گھوڑا تو کیا، ہم گدھا بھی نہیں دے سکتے۔ فقیر عزیز الدین بھی اس موقع پر موجود تھے۔ انھوں نے بھی کہا کہ حضرت صاحب کی تجویز مان لینے میں مضایقہ نہیں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا:

> جو شخص ملک و جاگیر کا طلب گار ہو، اس کے لیے یہ چیز اچھی ہوگی جس کی نیت اعلائے کلمۃ اللہ ہے، اس کے لیے یہ بہت بری ہے۔ دوسری نیکیوں کی طرح جہاد بھی حسنِ نیت سے باعثِ ثواب بن جاتا ہے۔ اس نیت میں ہم اور حضرت یکساں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہم نے انھیں امام بنایا ہے اور امام کے بغیر جہاد ہو نہیں سکتا، لیکن جو شے جہاد میں فساد کا باعث ہے، اس کے انکار میں ہم اور حضرت برابر ہیں۔

مولوی صاحب کی واپسی پر سید صاحب نے یہ ماجرا سنا کہ جب گھوڑا کیا گدھا بھی نہ دیں گے تو خوش ہو کر فرمایا: اسی غرض سے میں نے آپ کو بھیجا تھا۔ دوسرے شخص سے ایسی صاف گوئی ممکن نہ تھی۔

چھتر بائی اور لونڈ خوڑ فتح امب کے بعد مولوی صاحب کو چھتر بائی کی حکومت دے دی گئی تھی اور وہ غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ وہیں رہتے تھے۔ سفارت کے سلسلے میں وہ پنجتار پہنچے۔ فتح ہنڈ کے بعد سید صاحب انھیں قاضی القضاۃ بنانا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب نے معذرت کر دی۔ سید صاحب نے اصرار فرمایا تو عرض کیا: مجھے گنہگار نہ بنائیں۔ میں یہ خدمت قبول نہ کروں گا۔ عدالتی اور مالی کاموں میں اکثر لوگوں کے پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ سید صاحب نے انھیں لونڈ خوڑ، کاٹلنگ اور مردان کے انتظامات سونپ دیے۔ وہ قندھاری اور ہندوستانی غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ لونڈ خوڑ میں مقیم ہو گئے۔

---

[۱] جماعت مجاہدین میں سید صاحب امیر المومنین کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے۔ سکھ انھیں خلیفہ کہہ کر پکارتے تھے اور سرحدی باشندے عموماً سید بادشاہ کہتے تھے۔

دانش وتدبر سلطان محمد خاں اور بعض دوسرے خوانین کی سازش سے بکھرے ہوئے مجاہدین پر بے خبری میں حملے ہوئے اور وہ جابجا شہید کر دیئے گئے تو مولوی خیرالدین کو بھی اپنے ہاں وقائی انتظامات کرنے پڑے۔ انھوں نے لونڈ خوڑ کے تمام خوانین کو اکٹھا کیا اور کہا کہ میں حضرت کے حکم سے جا رہا ہوں۔ اپنے میں سے ایک شخص کو میرے ساتھ بھیج دیجیے۔ بڑے اطمینان سے روانہ ہوئے۔ ابتدا میں رُخ پنجتار کی طرف تھا، پھر اس لیے پڑان غار پہنچ گئے کہ پورے سیدانی علاقے میں سے صحیح سلامت گزر کر پنجتار پہنچنا ممکن نہ تھا اور خان پڑان غار کے اخلاص پر اعتماد تھا۔ کچھ مدت وہاں گزری۔ پھر سید صاحب کے حکم سے راستے کے بعض خوانین نے مہمان داری اور حفاظت کا ذمہ اٹھایا۔ یوں مولوی صاحب اپنے غازیوں کے ساتھ پنجتار پہنچے۔ مخالفت کی آگ اس طرح یکایک جابجا بھڑک اٹھی تھی کہ کسی غازی کا زندہ رہنا ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا جاتا تھا۔ مولوی صاحب لمبی مدت تک مرکز مجاہدین سے منقطع رہنے کے باوجود سلامت رہے۔ اس لیے جب وہ پنجتار آگئے تو انھیں اور ان کی جماعت کے لوگوں کو "زندہ شہید" کا لقب ملا۔

ہجرت ثانیہ سے اختلاف سید صاحب نے سلطان محمد خاں اور خوانین کی خوفناک سازش کے دردانگیز نتائج دیکھ کر پنجتار کو چھوڑ جانے کا فیصلہ کر لیا تو مختلف اصحاب نے اختلاف کیا تھا۔ ان میں ایک مولوی خیرالدین شیرکوٹی بھی تھے۔ مولوی صاحب نے عرض کیا کہ موجودہ مرکز کو چھوڑنا قرین مصلحت نہیں۔ کسی دوسرے علاقے میں جائیں گے تو پہلے یہی امر مشتبہ ہے کہ وہاں کے لوگ ہمارے قیام پر راضی ہوں گے۔ پھر انھیں وعظ ونصیحت سے قیام جہاد پر آمادہ کرنے میں عمر بسر ہو جائے گی۔ سید صاحب نے ترک پنجتار کے اسباب میں گرد وپیش کی مخالفت کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ فتح خاں پنجتاری کے متعلق بھی تو اطمینان نہیں، جس کی زمین میں ہم بیٹھے ہیں۔ مولوی صاحب نے عرض کیا، فتح خاں یا اس کے پنجتار کے ہم محتاج نہیں۔ مجھے سدم کا علاقہ مرحمت فرمائیں تو اس سے لشکر کا سروسامان کروں گا اور سیدانی علاقے کے تمام مخالفوں کو راہ راست پر لے آؤں گا۔ سید صاحب نے بعض قوی تر دلائل کی بنا پر یہ رائے قبول نہ فرمائی۔

تنخواہ دار سپاہ کی تجویز بعض دوسرے اصحاب کی طرح مولوی خیرالدین کی بھی رائے تھی کہ رضا کارانہ جہاد پر انحصار کے بجائے سپاہی ملازم رکھے جائیں کیونکہ اس طرح بظاہر جہاد کے کامیاب ہونے کی امید نہیں۔

سید صاحب بہ وجوہ اس کے بھی خلاف تھے کیونکہ تنخواہ دار سپاہ کے لیے وسیع مصارف درکار تھے، جو بڑے علاقے پر قبضہ جمائے بغیر مہیا نہ ہو سکتے تھے۔ اوائل حال میں سید صاحب یہ طریقہ اختیار نہ کر سکتے تھے۔ نیز ان کی خواہش تھی کہ مسلمانوں میں دنیوی فوائد سے قطع نظر کرتے ہوئے جہاد کا جذبہ عام ہو جائے اور وہ رضا کارانہ تمام واجبات ادا کریں جو شریعت کی طرف سے ان پر عائد ہیں۔

بھوگڑمنگ اور بالاکوٹ سید صاحب پنجتار سے راج دواری پہنچے تو دوسرے امور کے علاوہ درۂ بھوگڑمنگ کی حفاظت ضروری تھی، جہاں سے سکھ اندر آ کر مختلف وادیوں پر ترکتازیں کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ آپ نے چار سو غازیوں کی ایک جماعت شاہ اسمٰعیل کی سرکردگی میں درے کی حفاظت کے لیے مامور کر دی۔ مولوی خیر الدین کو شاہ صاحب کا نائب بنایا۔ شاہ صاحب خود پچاس غازیوں کے ساتھ سچوں میں ٹھہر گئے جو درے سے چند میل شمال میں ہے۔ مولوی خیر الدین کو ساڑھے تین سو غازیوں کے ساتھ بھوگڑمنگ بھیج دیا۔ مولوی صاحب نے حفاظت کا انتظام اس اعلیٰ پیمانے پر پہنچا دیا کہ سکھوں کو شنکیاری کی گڑھی سے جو درے کے باہر قریب ہی واقع ہے، نکلنے کا حوصلہ نہ رہا۔ درے کے اندر کی تمام بستیاں مطمئن ہو گئیں۔

سکھوں پر ہیبت ایک روز قندھاریوں کی ایک مختصر سی جماعت درے سے باہر میدان میں نکل گئی۔ اتفاقیہ ان کی مڈبھیڑ سکھوں سے ہو گئی۔ سکھ اگرچہ غازیوں سے دو چند تھے، لیکن رو در رو مقابلے کا حوصلہ نہ ہوا اور وہ آس پاس کے ٹیلوں پر چڑھ گئے۔ قندھاریوں نے احتیاطاً مولوی صاحب کو خبر بھیج دی۔ عصر کا وقت تھا، مولوی صاحب فوراً تیس چالیس غازیوں کے ساتھ درے پر پہنچ گئے۔ اس اثنا میں سکھ چپکے چپکے گڑھی کے اندر چلے گئے۔ خوب اندھیرا ہو گیا تو مولوی صاحب واپس ہوئے۔

مظفر آباد جب کشمیر کی طرف بڑھنے کا فیصلہ ہوا تو سید صاحب نے مختلف خوانین کی درخواست پر مولانا شاہ اسمٰعیل کو حکم دیا کہ آپ بالاکوٹ چلے جائیں۔ مولوی خیر الدین نے ۷ شعبان ۱۲۴۶ھ (۲۰ فروری ۱۸۳۱ء) کو ظہر کے وقت بھوگڑمنگ سے کوچ کیا اور پہاڑی راستے سے بالاکوٹ پہنچ گئے۔ دو روز بعد مولانا وارد ہوئے تو خوانین نے اصرار کیا کہ مظفر آباد لشکر بھیجا جائے۔ مولانا نے مولوی خیر الدین کو بھیجنا چاہا۔ انھوں نے معذرت کر دی اور عرض کیا کہ ان خوانین کا کچھ اعتبار نہیں۔ خدا جانے کہاں مصیبت میں الجھا کر الگ ہو جائیں۔ البتہ مظفر آباد

کاغان زبردست خاں مجھے پانچ ہزار روپے نقد دے تو اپنے جیش کا ساز و سامان درست کر کے یہ خدمت بجا لاؤں گا۔ مولانا نے تین سو غازیوں کا لشکر تین آدمیوں کی مشترکہ سالاری میں بھیج دیا۔ سید صاحب کو یہ حالات معلوم ہوئے تو مولوی خیر الدین کو لکھا کہ آپ کا عذر معقول تھا لیکن اب ضرور جانا چاہیے اس لیے کہ جو لوگ گئے ہیں مبادا ان کی ناواقفی کے باعث نقصان پہنچے اور کاروبارِ جہاد میں خلل پڑے۔ چنانچہ مولوی خیر الدین بھی دس آدمی لے کر مظفر آباد پہنچ گئے۔

عزمِ بالاکوٹ مظفر آباد پہنچ کر مولوی صاحب نے زبردست خاں سے ضروری ساز و سامان کا مطالبہ کیا۔ اس اثنا میں غازیوں نے چھاؤنی پر قبضہ کر لیا اور صرف گڑھی سکھوں کے قبضے میں رہ گئی۔ زبردست خاں نے خفیہ سکھوں سے جوڑ توڑ شروع کر دیے اور کام کا بہترین وقت تذبذب میں ضائع کر دیا۔ اس اثنا میں مظفر آباد کی گڑھی کی سکھ فوج کے لیے بہت بڑی کمک کی آمد کا حال معلوم ہوا۔ زبردست خاں یہ سنتے ہی ضروری سامان لے کر بھاگنے کے لیے تیار ہو گیا۔ مولوی صاحب کو بھی لوٹنا پڑا۔ وہ پہاڑوں کے بیچ میں سے روانہ ہوئے۔ راستہ بہت دشوار گزار تھا۔ اسی حالت میں مولوی صاحب کو سخت بخار آ گیا۔ ساتھ ہی خبر ملی کہ بالاکوٹ میں سید صاحب اور سکھ فوج کے درمیان جنگ ہونے والی ہے۔ ہر غازی کا منشا تھا کہ جلد سے جلد بالاکوٹ پہنچ جائے۔ مولوی صاحب چل نہ سکتے تھے۔ انھیں چارپائی پر ڈال کر چار آدمیوں نے اٹھایا۔ لڑائی کی صبح کو وہ اس جگہ دریا کے مشرقی کنارے پر نمودار ہوئے، جہاں بالاکوٹ جانے آنے کے لیے پل بنا ہوا تھا۔ یہ پل ایک رات پہلے سید صاحب کے حکم سے توڑ دیا گیا تھا۔ غازی درہ کاغان کی طرف پلٹے کہ کسی گھاٹ سے دریا عبور کریں۔ جب وہ ان پہاڑوں پر پہنچے، جو قصبہ بالاکوٹ کے شمال میں ہیں تو معلوم ہوا کہ جنگ ختم ہو گئی۔ بہت سے غازی شہادت پا گئے۔ جو باقی بچے، وہ واپس جا رہے تھے۔

بھٹ کول میں قیام مولوی صاحب باقی غازیوں کے ہمراہ ستھانہ پہنچے، جہاں سید صاحب کی اہلیہ اور بعض دوسری خواتین تھیں۔ بھٹکول کے اخوند محمد اعظم قسم کھا کر کہہ رہے تھے کہ میں نے سید صاحب کو زندہ دیکھا ہے۔ جس زمانے میں شیخ ولی محمد ایک جماعت کے ساتھ خونڈ (سوات) چلے گئے تھے تاکہ سید صاحب کی اہلیہ کو ستھانہ بھیجنے کی کوئی تدبیر کریں، مولوی خیر الدین اور بعض دوسرے مجاہدین ستھانہ

ہی میں رہے۔ پھر شیخ ولی محمد کو فتح خاں پنجتاری بہ اصرار اپنے ہاں لے گیا۔ کچھ مدت بعد شیخ موصوف نے مولوی خیر الدین اور دوسرے اصحاب کو بھی بلا لیا۔ مولوی صاحب سندھیانہ سے روانہ ہو گئے، لیکن جھنگول پر پہنچ کر آخوند محمد اعظم کے پاس ٹھہر گئے اور پنجتار جانے سے انکار کر دیا۔ وہ کہتے تھے کہ جہاں سے امیر المومنین نے ہجرت کی، میں وہاں نہ جاؤں گا۔ دوسرے آخوند محمد اعظم کے بیانات سے انھیں یقین سا ہو گیا تھا کہ سید صاحب زندہ ہیں۔ تین نو مسلم ان کے ساتھ تھے: عبداللہ، عبدالکریم اور عبدالرحیم۔ بعد کے حالات معلوم نہ ہو سکے، نہ مولوی صاحب کا ذکر کسی سلسلے میں آیا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وطن واپس آ گئے تھے۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ مولوی صاحب علم و فضل، ہمت، تدبیر اور سیاست و ملک داری میں بہت بلند پایہ تھے۔ علم دین میں بھی ان کا رتبہ بہت اونچا تھا۔ راویوں نے لکھا ہے کہ بہت ہی متین، دور اندیش اور حلیم تھے۔

میں نے مولانا مظہر الدین شیرکوٹی مرحوم، ایڈیٹر "الامان" کی زندگی میں مولوی خیر الدین کے خاندان کے حالات دریافت کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا، لیکن افسوس کہ کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ مولانا مظہر الدین کی وفات کے بعد تفحص و دریافت کا کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہا۔

مظفر آباد سے واپسی کا راستہ مظفر آباد سے واپسی کا راستہ سید غلام حسن شاہ کاظمی کی تحقیق کے مطابق یہ تھا: مظفر آباد سے گجر سیداں اور گنڈا ہوتے ہوئے نوسیری، وہاں سے دریائے کشن گنگا کو عبور کر کے گھنٹی پیراں، پڑ چیا اور کھوڑی۔ کھوڑی سے سید پور، پھر نور گلی جہاں سے بالاکوٹ دس گیارہ میل تھا۔ گڑھی حبیب اللہ خاں کا راستہ سہل تھا جو اس لیے اختیار نہ کیا کہ ادھر سکھوں کا لشکر موجود تھا۔

آٹھواں باب

شیخ بلند بخت اور شیخ علی محمد

شیخ بلند بخت سرہند میں پہلے سید صاحب سے ملے تھے۔ جب آپ نے میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کا دورہ کیا تھا۔ یہ غالباً سرہند میں ملازم تھے۔ وہیں بیعت کی۔ بیعت کے بعد ہجرت تحریک جہاد کے لیے وقف ہو گئے اور مجاہدین کی پہلی جماعت میں شامل ہو کر سرحد پہنچے۔ اپنے اوصاف و محاسن اور فنون سپہ گری میں مہارت کے باعث ابتدا ہی سے ممتاز اصحاب میں محسوب تھے۔ سید صاحب نے قیام خبر کے زمانے میں غازیوں سے قواعد اور باقاعدہ قواعد کرانی شروع کی تھی تو مختلف جیشوں کو مختلف اصحاب کی تربیت میں دے دیا تھا۔ ان اصحاب میں سے ایک شیخ بلند بخت بھی تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اہم کام بھی انھیں سونپے جاتے تھے جن سے ان کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ جب اطلاع ملی کہ پائندہ خاں تنولی قریب کے مضطرب میں زنبورکیں چھوڑ گیا ہے اور انھیں اڑانے کے لیے ایک تجربہ کار آدمی کو بھیجنا ضروری ہو گیا تو یہ کام شیخ بلند بخت ہی کے حوالے ہوا۔ ڈھکولی سے شیخ محمد اسحق گورکھپوری کو اس مہم پر بھیجنا چاہا تو سید جعفر علی نقوی نے یہ کام اپنے ذمے لے لیا۔ گڑھی کپورہ کی جنگ میں بھی شریک تھے۔ امب کے محصورین نے جب صلح کا فیصلہ کیا تو ان سے گفتگو کے لیے بھی شیخ موصوف ہی کو بھیجا گیا تھا۔

صبر و استقامت

فتح امب کے بعد پھلڑہ کا محاصرہ طول پکڑ گیا اور اس غرض کے لیے توپوں کی ضرورت پیش آئی تو سید صاحب نے شیخ موصوف ہی کو پچیس تیس غازیوں کے ساتھ پنجتار بھیجا تھا کہ وہاں سے بحفاظت توپیں لے آئیں۔ غیر حاضری میں ان کے چھوٹے بھائی شیخ علی محمد شہید ہو گئے۔ شیخ بلند بخت کو سفر مراجعت میں بمقام ستھانہ یہ غم انگیز خبر ملی تو اس پیکر صبر نے فرمایا: "الحمد للہ! ہمارا بھائی جو مراد لے کر آیا تھا وہ پوری ہو گئی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ شہادت نصیب کرے۔"

قلعۂ امب | جزیرہ کی جانب پیش قدمی کا معاملہ معرض التوا میں پڑ گیا تو سید صاحب شاہ اسمٰعیل کو امب میں چھوڑ کر خود پنجتار چلے آئے تھے اور آس پاس کے میدانی علاقے کا دورہ شروع کر دیا تھا۔ گڑھی امان زئی میں معلوم ہوا کہ سرداران پشاور اور سلطان محمد خاں کمال زئی بہت بڑی فوج لے کر جنگ کے لیے آ رہے ہیں۔ سید صاحب گڑھی امان زئی سے تورو تشریف لے گئے اور مولانا کو بھی امب سے بلا لیا۔ شاہ صاحب نے قلعۂ امب کے تمام انتظامات شیخ بلند بخت کے حوالے کر دیے۔ ہجرت ثانیہ تک شیخ کا پورا وقت امب ہی میں گزرا اور وہ جنگ مایار یا فتح پشاور میں شریک نہ ہوسکے۔

شانِ عزیمت | سلطان محمد خاں اور بعض دوسرے خوانین کی سازش سے مجاہدین میدانی علاقے کے مختلف دیہات میں شہید کیے جا چکے تو سید صاحب نے پنجتار کو چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس وقت تک شیخ بلند بخت غازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ امب ہی میں مقیم تھے اور ان کے ماتحت [illegible] کاندھلوی کو چھتر بائی میں متعین کر دیا گیا تھا۔ مجاہدین کی دردناک شہادت نے خوانین کے حوصلے بہت بڑھا دیے تھے، اس لیے کہ انھیں یقین تھا، مجاہدین کو امداد نہ مل سکے گی۔ چنانچہ ایک مشہور سردار پائندہ خاں نے شیخ بلند بخت کو پیغام بھیجا کہ ہمارے تمام علاقے خالی کر دو، ورنہ جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔ شیخ کے پاس اگرچہ بہت کم غازی تھے، لیکن بے توقف جواب دیا: "ہم امیر المومنین کے حکم کے بغیر ایک بالشت زمین بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ جنگ کرنا چاہتے ہو تو شوق سے کر دیکھو۔" جب شیخ کو اطلاع ملی کہ پائندہ خاں کھبل ناؤ کے گھاٹ سے اپنا لشکر دریا کے غربی کنارے پر پہنچا رہا ہے اور وہ ضرور امب پر حملہ کرے گا تو انھوں نے غازیوں کو حکم دے دیا کہ بستی کے جو مکانات منہدم ہیں، ان میں سے لکڑیاں نکال کر گڑھی میں لے آؤ تاکہ گڑھی کے لیے ایندھن کی ضرورت نہ رہے۔ دو توپیں گڑھی کے اس طرف لگا دیں جدھر سے حملے کا خطرہ تھا۔ ایک توپ مشرق میں اور دوسری مغرب میں نصب کرا دی۔ پائندہ خاں نے حملہ کیا لیکن وہ شرقی سمت کی ناکہ بندی کے بیرونی حلقے میں ایک مرتبہ آگ لگانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ بیس پچیس روز کی کشمکش کے بعد ناکام لوٹ گیا۔

نصب العین | ایک روز کوہلیاں کی جانب سے جو سکھوں کے زیر اقتدار تھا، آواز آئی کہ کسی معتبر آدمی کو دریا پر بھیجو، ایک ضروری پیغام پہنچانا ہے۔ شیخ بلند بخت نے الٰہی بخش رام پوری، حسن خاں ساکن زمانیہ

اور ایک اور آدمی کو بھیجا۔ معلوم ہوا کہ سکھ سردار کی طرف سے ایک خط آیا ہے۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ غازی بہت بہادر، امانت دار اور نمک حلال ہیں۔ انھوں نے شجاعت کا حق ادا کر دیا۔ گڑھی میں پائندہ خاں کا جو سامان ہے، وہ اسے دے دیا جائے اور غازی ہمارے پاس چلے آئیں، ہم انھیں عزت کی جاگیریں دیں گے۔ شیخ نے جواب میں کہلا بھیجا:

اپنے سردار سے کہہ دو کہ ہم امیر المومنین کے تابع فرمان ہیں۔ حضرت کے حکم کے بغیر کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اپنے وطنوں سے اس لیے آئے ہیں کہ کافروں سے جنگ کریں۔ نہ ملک چاہتے ہیں نہ مال۔ ہمیں نوکری سے کیا غرض۔ ہماری موت اور زندگی امیر المومنین کے ساتھ ہے۔ ہم ذو الجلال کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔ پائندہ خاں اور اس کے لشکر کی کیا حقیقت ہے؟ اگر رنجیت سنگھ بھی اپنا لشکر لے کر آئے تو نہ ڈریں گے۔ ڈر خوف مرگ سے پیدا ہوتا ہے۔ ہم اپنی جانیں خدا کے راستے میں قربان کر چکے ہیں۔ پس ہمیں کیا ڈر ہے؟ ہماری طرف سے کہہ دینا کہ پھر ہمیں ایسا پیام نہ بھیجا جائے۔

سید صاحب نے ہجرت ثانیہ کا فیصلہ کر لیا تو سید اکبر شاہ ستھانوی کو لکھا کہ ہمارے غازیوں کو امب اور چھتر بائی سے نکال کر ہمارے پاس پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ سید اکبر شاہ نے دونوں گڑھیاں خالی کرائیں اور پورا مال اسباب نکال کر ستھانہ لے گئے۔ جب سے پائندہ خاں نے حملہ کیا تھا، غازیوں میں سے صرف ایک آدمی شہید ہوا اور تین آدمیوں کے خفیف زخم لگے۔ اس اثنا میں پائندہ خاں کے ساتھ کے آدمی مقتول اور بیسیوں مجروح ہوئے۔

شہادت

شیخ بلند بخت نے عشرہ میں ٹھہر کر اپنے تمام غازیوں کو اکٹھا کیا۔ یکم یا دو تیسری روادی پھلرا میں سید صاحب سے جا ملے۔ بعد کے حالات تفصیلاً معلوم نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ بالاکوٹ میں شہادت پائی۔ سید جعفر علی نقوی نے شہادت کی کیفیت یہ بتائی ہے کہ میدان جنگ میں پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھ سے تقریباً آٹھ قدم کے فاصلے پر ابراہیم خاں تھے۔ میں ان کی طرف جانے لگا تو داہنی جانب سے شیخ بلند بخت آتے ہوئے ملے۔ مجھ سے پوچھا کہاں جاتے ہو؟ عرض کیا: ابراہیم خاں کے پاس۔ وہ بھی چلا

بائیں طرف چلے گئے اور وہیں گولی کھا کر جام شہادت نوش کیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جب میدان جنگ میں سید صاحب کی گم شدگی کا آوازہ بلند ہوا اور فدائی ان کی تلاش میں سراسیمہ وار پھرنے لگے تو شیخ بلند بخت بھی اپنی حفاظت سے بالکل بے پروا ہو کر تلاش میں نکل پڑے۔ اسی حالت میں گولی لگی۔

شیخ علی محمد

یہ شیخ بلند بخت کے حقیقی بھائی تھے۔ غالباً مجاہدین کے پہلے قافلے میں شریک نہ تھے، اس لیے کہ ابتدائی فہرست میں ان کا نام نظر نہیں آتا، لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اپنے بھائی کی طرح بہت محتاط، دوراندیش اور ہمت ور تھے۔ چنانچہ سید صاحب نے جب سرداران پشاور کے آخری فیصلے کا پختہ ارادہ کر لیا اور اس سلسلے میں خہرے اوتمان زئی پر حملے کا منصوبہ تیار ہو گیا تو ایک جماعت درہ خیبر کی سمت بھیجی گئی تھی تاکہ وہاں کے لوگوں کو اٹھا کر پشاور پر اقدام کے لیے آمادہ کر دیا جائے۔ اس جماعت میں سید احمد علی، مولوی مظہر علی عظیم آبادی، شیخ ولی محمد پھلتی وغیرہ اکابر کے علاوہ شیخ علی محمد بھی شریک تھے۔

عام خدمات

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ موصوف پشتو بے تکلف بولتے تھے۔ چنانچہ جب غازی زیدہ میں رات کے وقت یار محمد خاں درانی کے لشکر پر حملے کے لیے نکلے تھے اور راستے میں انھیں یار محمد خاں کے سوار مل گئے تھے تو ان کے تمام سوالات کا جواب پشتو میں شیخ علی محمد ہی نے دیا تھا۔ شیخ موصوف ان منتخب سواروں میں بھی شریک تھے جنھیں مولانا شاہ اسمٰعیل نے سید صاحب اور پائندہ خاں کی ملاقات کے وقت مقام ملاقات سے قریب ایک خفیہ جگہ کھڑا کر دیا تھا۔

شہادت

فتح امب کے بعد پائندہ خاں کا ایک لشکر چھتر بائی کی گڑھی میں محصور ہو گیا تھا جو امب سے تقریباً چھ میل شمال میں دریا کے کنارے واقع تھی۔ غازیوں نے گڑھی کا محاصرہ کر لیا تھا لیکن توپوں کے بغیر اس کی تسخیر مشکل نظر آتی تھی۔ مولانا شاہ اسمٰعیل محاصر فوج کے سالار تھے۔ انھوں نے گڑھی کی دیواروں پر چڑھنے کے لیے سیڑھیاں بنوا لی تھیں اور دریا کی سمت چھوڑ کر گڑھی کے اردگرد اپنے مختلف دستے مورچوں میں بٹھا دیے تھے۔ توپیں لانے کے لیے آدمی پنجتار چلے گئے تھے۔ ان کے انتظار میں حملہ ملتوی ہو چکا تھا

اس اثنا میں حافظ عبداللطیف کو خدا جانے کیا سوجھی کہ مولانا کو مطلع کیے بغیر بطور خود مورچوں میں پھیر پھیر کر غازیوں سے کہہ دیا، عصر کے بعد گڑھی پر حملہ ہوگا۔ انھیں غالباً خیال تھا کہ ایک مجاہدانہ اقدام سے گڑھی فتح ہو سکتی ہے اور توپوں کے انتظار میں معطل بیٹھے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ غازیوں نے سمجھا کہ یہ پیغام خود مولانا شاہ اسمٰعیل نے دیا ہوگا، چنانچہ وہ عصر کی نماز سے فارغ ہوتے ہی اچانک گڑھی پر حملہ آور ہوئے۔ حافظ عبداللطیف تکبیر کہتے ہوئے سب سے آگے تھے۔ تمام راہ کانٹوں اور خاردار جھاڑیوں سے گزرتے ہوئے گڑھی کی دیواروں کے پاس پہنچ گئے۔ اس وقت سیڑھیوں کی ضرورت پڑی جو مولانا کے خیمے میں تھیں۔ سیڑھیاں مانگی گئیں تو مولانا حیران کہ حملہ کس کے حکم سے ہوا؟ موقع بحث کا نہ تھا۔ مولانا نے سیڑھیاں دے دیں۔ انھیں دیواروں سے لگایا گیا تو چھوٹی نکلیں اور غازی اوپر نہ پہنچ سکے۔ تاریکی پھیلی تو سب کو مورچوں میں واپس ہونا پڑا۔ اس یورش میں جو چند غازی شہید ہوئے، ان میں سے ایک شیخ علی محمد تھے۔

تعزیت — شیخ بلند بخت اس وقت توپیں لانے کے لیے پنجتار گئے ہوئے تھے۔ واپسی میں ستھانہ پہنچ کر بھائی کی شہادت کی خبر ملی۔ جب پہنچے تو سید صاحب نے حسب معمول محبت سے پاس بٹھایا۔ کچھ دیر خاموش رہے پھر شہید کی تعزیت کرتے ہوئے یہ تسلی دی:

> آپ کے بھائی جو مراد لے کر اللہ کی راہ میں وطن سے نکلے تھے، وہ پوری ہو لی۔ ہم سب کو اللہ تعالیٰ اپنی رضامندی کی راہ میں صرف کر دے اور ہم سب کی یہی نیت ہو۔ یہی ہم سب بھائیوں کی مراد ہے۔

بھائی کسے عزیز نہیں ہوتا؟ پھر ایسا بھائی جو دنیا میں خیر و سعادت کا قابل فخر پیکر تھا۔ وطن سے دور، عزیزوں سے علیحدگی اور اقربا سے مفارقت کی حالت میں موت آئی۔ ہم لوگوں نے زندگی کے جو تصورات قائم کر رکھے ہیں، شیخ بلند بخت ان سے فارغ نہ تھے۔ انھیں بھی ہر رشتہ دنیا ہی عزیز تھا جیسا انسان کو ہونا چاہیے، لیکن ایک بلند تر جذبہ اور نیک تر نصب العین نے ان کی تمام محبتوں اور علاقہ مندیوں کو دوسرے ہی سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

نواں باب

مولوی مظہر علی عظیم آبادی

یہ غالباً اسی زمانے میں سید صاحب سے بیعت کر چکے تھے، جب آپ کی دعوت و جہاد کا شہرہ ہوا تھا۔ سفر حج کے سلسلے میں سید صاحب عظیم آباد پہنچے تو اس حیثیت میں مولوی مظہر علی کے مکان پر گئے، گویا ان سے دیرینہ مراسم تھے۔ نیز اس موقع پر روایات میں مولوی صاحب کے اہل و عیال، اقربا اور اہل محلہ کی بیعت کا ذکر ہے۔ خود مولوی صاحب کی بیعت کا ذکر نہیں۔ یہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ مولوی صاحب سفر حج سے پیشتر بیعت کر چکے تھے۔ موصوف نسباً سید تھے اور لودی کٹرہ میں رہتے تھے۔

دعوت و ارشاد اونچے درجے کے عالم ہونے کے علاوہ مولوی صاحب بڑے غیور شخص تھے۔ بیعت کے ساتھ ہی دعوت و اصلاح شروع کر دی۔ بعض اوقات جوش کے عالم میں منکو چیزوں کو بزور مٹا دینے پر بھی آمادہ ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک موقع پر تعزیے کو نقصان پہنچایا۔ اس بنا پر مولوی صاحب کے خلاف مقدمہ قائم ہو گیا۔ ایک شخص نے ضمانت دے کر انھیں گرفتاری سے بچایا۔ مولوی صاحب ضمانت پر رہا ہوتے ہی وطن چھوڑ کر گورکھپور جا پہنچے۔ وہاں بھی دعوت و اصلاح جاری رکھی۔ چنانچہ مولوی جعفر علی نقوی نے اپنے والد ماجد سید قطب علی کے حوالے سے لکھا ہے کہ مولوی مظہر علی کے وعظ و ارشاد سے اکثر لوگوں نے ہدایت پائی۔ ایک مسلمان زمیندار نے دو ہندو عورتوں کو بیک وقت نکاح کر رکھا تھا۔ سید قطب علی نے بار بار اسے منع کیا، شرعی مسئلہ بتایا، لیکن وہ جواب دیتا کہ ہماری برادری میں یہ دستور پہلے سے چلا آ رہا ہے، ہم کیوں چھوڑیں؟ سید قطب علی نے مجبور ہو کر اس سے سلام کلام بند کر دیا۔ مولوی مظہر علی ان اطراف میں پہنچے اور انھوں نے تلقین کی تو اس نے فوراً ایک بیوی کو طلاق دے دی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولوی صاحب کے بیان میں خدا نے خاص تاثیر ودیعت کر دی تھی۔

تعلیمِ عزیمت

اسی زمانے میں سید صاحب سے ملنے کے لیے رائے بریلی پہنچے آپ نے فرار کے جواز سے تو بہت ناراض ہوئے۔ پھر مولوی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا: آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا۔ حالانکہ آپ نے سخت غلطی کی۔ خود بچ کر نکل آئے اور ایک نیک دل مسلمان (ضامن) کو پھنسا دیا۔ آپ میں نتائج کی برداشت کا حوصلہ نہ تھا تو اصلاح شروع کیوں کی تھی؟ آپ کی تو بیعت بھی قائم نہیں رہی۔ نئے سرے سے بیعت کیجیے، وطن جائیے، اور جو کچھ پیش آئے اسے صبر سے برداشت کیجیے۔

مولوی صاحب نے بے چون و چرا اس حکم کی تعمیل کی۔ لیکن خدا کی رحمت دیکھیے کہ ان کے جاتے ہی مقدمہ ختم ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ سید صاحب اپنے تمام خلفا اور داعیوں سے شانِ عزیمت کے متقاضی تھے۔ اس کے بغیر اصلاح کا کام پورا نہ ہو سکتا تھا۔ مولوی مظہر علی پر ناراض ہونے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مقامِ عزیمت میں ثابت قدم نہ رہے اور مقدمہ قائم ہوتے ہی بچ کر نکل گئے۔

قافلۂ مجاہدین

سید صاحب کی طرف سے بلاوے کے خطوط پہنچے تو مولوی صاحب مجاہدوں کا قافلہ لے کر سرحد گئے تھے یا کم سے کم وہ بالکل ابتدائی قافلوں میں مقامِ جہاد پر پہنچ گئے تھے، اس لیے کہ جنگ شیدو کے بعد جو غازی چنگلئی پہنچے تھے ان میں مولوی صاحب کا نام موجود ہے۔

جنگِ مردان

اغلب ہے مختلف لڑائیوں میں شریک رہے ہوں۔ جنگِ مردان میں ان کا ذکر بتصریح آیا ہے۔ اس جنگ میں سید محمد حبان قاضی القضاۃ سپہ سالار تھے۔ انھوں نے شہر پر حملے کے لیے غازیوں کی فوج کو مختلف جیشوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ مولوی مظہر علی کو ہدایت فرمائی تھی کہ اپنا جیش لے کر کھلیانوں کی طرف جائیں اور جونہی بندوقوں کی آواز سنیں تو نقارہ بجاتے ہوئے شہر پر حملہ کر دیں۔ مولوی صاحب نے حرفاً حرفاً اس ہدایت پر عمل کیا۔ کھلیانوں والے بندوقچی بھاگ گئے اور مولوی صاحب اپنا جیش لے کر آگے بڑھے۔ اتفاقاً ران کے بالائی حصے میں گولی لگی اور وہ زمین پر گر پڑے۔ لیکن عزیمت، ہمت اور عشقِ مقاصد کی شان ملاحظہ ہو کہ گولی لگنے کا معاملہ کسی پر ظاہر نہ کیا تاکہ کوئی ساتھی ان کی دیکھ بھال میں یورش سے باز نہ رہے۔ گرتے ہی سنبھل کر زمین پر بیٹھ گئے۔ جو غازی پاس سے گزرتا اور حال پوچھتا تو بلند آواز سے فرماتے: تم پھر

میں ابھی آتا ہوں۔ ہر شخص یہی سمجھتا کہ پاؤں میں کانٹا چبھ گیا ہوگا، جسے نکالنے کے لیے دم بھر کو بیٹھ گئے ہیں۔ شاہ اسمٰعیل ان کے پاس پہنچے تو حقیقت حال بتائی۔ ساتھ ہی کہا آپ میرا خیال نہ فرمائیں۔ پہلے گڑھی کا فیصلہ کر لیجیے۔ فتح کے بعد دیکھ لیجیے گا میں کس حال میں ہوں۔

مردان فتح ہوگیا تو شاہ اسماعیل نے اس جنگ میں دو غازیوں کے کارنامے بطور خاص قابل ذکر بتائے۔ ان میں سے ایک مولوی مظہر علی تھے کہ سخت زخمی ہونے کے باوجود اپنی حقیقی حالت ختم جنگ تک کسی پر ظاہر نہ ہونے دی۔

پشاور میں منصب قضا: پشاور فتح ہوا اور سید صاحب اپنے غازیوں کے ساتھ وہاں پہنچے تو مولوی مظہر علی صاحب نے مہابت خاں کی مسجد میں خطبے دینے شروع کیے، جن میں سورۂ یوسف کی تفسیر نہایت دلپسند الفاظ میں پیش کی۔ اس وجہ سے وہ اہل پشاور میں بہت ہر دل عزیز ہو گئے۔ چنانچہ سلطان محمد خاں درانی سے معاہدۂ صلح کے بعد پشاور اس کے حوالے کیا اور وہاں قاضی کے تقرر کا سوال سامنے آیا تو مولوی مظہر علی ہی اس عہدے کے لیے منتخب ہوئے۔ علم و فضل اور زہد و تقویٰ کے علاوہ یہ بات بھی پیش نظر تھی کہ اہل پشاور انھیں بہت پسند کرتے ہیں۔ سید صاحب پشاور سے پنجتار کی طرف روانہ ہوئے تو مولوی مظہر علی چکلئی تک ساتھ گئے۔ وہاں سے پشاور لوٹے۔ پھر عالم ناسوت میں ملاقات مقدر نہ تھی۔

درانیوں کی بدعہدی: سلطان محمد خاں نے پشاور پر دوبارہ قابض ہوتے ہی سازش کا جال بچھانا شروع کر دیا تھا۔ جب اس نے اندازہ کر لیا کہ میدانی علاقے کے اکابر اس کے ہم نوا بن گئے ہیں تو مولوی مظہر علی سے کھلم کھلا نزاع پر آمادہ ہو گیا۔ ایک روز مولوی صاحب اس کے پاس پہنچے تو فوراً سوال کیا کہ میرے بھائی یار محمد خاں کو کیوں قتل کیا گیا؟ ساتھیوں نے ایک ہنگامہ سا بپا کر دیا۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ شور مچانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ باری باری ایک ایک سوال کرو اور جواب سنتے جاؤ۔ پھر تمام تفصیلات کھول کر بیان کیں اور ثابت کر دیا کہ خادے خان اور یار محمد خاں سے جو سلوک ہوا، وہ شرعاً بالکل جائز تھا۔ مولوی صاحب نے یہ حالات سید صاحب کو لکھ بھیجے۔ آپ کے حکم سے شاہ اسمٰعیل نے ایک مفصل خط لکھا، جس میں سلطان محمد خاں کے تمام اعتراضات کا جواب درج تھا۔ یہ خط مولوی مظہر علی کے پاس بھیج کر تاکید کر دی کہ کوئی شخص اطمینان طلب

کے لیے سوال کرے تو نرمی سے جواب دے دیں۔ بحث کی نوبت آئے تو یہ قوم کو خدا کے حوالے کر کے آپ چلے آئیں۔

شانِ احتیاط — سید صاحب نے سلطان محمد خان کی صلح ارباب نجیب اللہ خان نے کرا دی تھی وہ معاہدہ کیا تھا کہ اگر سلطان محمد خان نے دوبارہ خیانت کی تو میں اس کا ساتھ چھوڑ دوں گا۔ پشاور کے حالات بگڑتے دیکھے تو ارباب نے مولوی مظہر علی کو اطلاع دے دی تھی کہ مجھے سلطان محمد خان پر اطمینان نہیں رہا۔ آپ میر فوج سے واپسی کی اجازت لے لیں۔ مولوی صاحب بڑے محتاط اور حد درجہ فرض شناس بزرگ تھے۔ انھوں نے مناسب نہ سمجھا کہ تمام معاملات کا اندازہ کیے بغیر کوئی بات کہیں اور عجلت میں خبر مشتہر اور سید صاحب تک پہنچانے کے موجب ہوں۔

شہادت — انھیں حالات میں سلطان محمد خان اور اس کے درانیوں نے مولوی مظہر علی کو پشاور میں شہید کر دیا۔ شہادت کی تفصیل صرف اس قدر معلوم ہو سکی کہ ایک روز سلطان محمد خان نے ضروری مشورے کے بہانے سے مولوی صاحب کو ایک مکان کے کمرے میں بلوایا۔ وہ پہنچے تو ہر طرف سے ایک دم ان پر تلواریں پڑنے لگیں۔ اسی حالت میں وہ واصل بحق ہو گئے۔ وہیں کا بیان ہے کہ مولوی صاحب بہت بڑے عالم، متقی، ذکی الطبع صاحب اخلاق پسندیدہ و اوصاف حمیدہ۔ سید صاحب کے مخلص معتقد اور محب راسخ تھے۔ موصوف سپہ گری کے فن میں یکتائے زمانہ اور شجاعت و بہادری میں یگانہ مانے جاتے تھے۔

دسواں باب

شیخ محمّد اسحٰق گورکھپوری

نسبت مقام سے ظاہر ہے کہ یہ گورکھپور کے باشندہ تھے۔ معمولی تعلیم پائی تھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کسبِ فیض کے شوق میں اپنے وطنِ مالوف سے پیدل دہلی پہنچے۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب سید صاحب ایک بڑے قافلے کے ساتھ حج کے لیے گئے ہوئے تھے۔ شیخ اسحٰق نے شاہ صاحب سے بیعت کی درخواست کی تو جواب میں ارشاد ہوا کہ میں گوناگوں عوارض میں مبتلا ہوں۔ میرا نواسہ محمد اسحٰق درس و تدریس میں مشغول ہے۔ میرے خلیفہ سید احمد واپس آئیں گے تو ان سے بیعت کر لینا۔ شیخ اسحٰق نے عرض کیا کہ میں آپ سے بیعت کا آرزومند ہوں۔ صرف دس روز دہلی میں ٹھہروں گا، پھر واپس چلا جاؤں گا، اس لیے کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اور ان کے گزارے کی کوئی سبیل نہیں۔

بیعت سید صاحب حج سے واپس آئے تو شاہ عبدالعزیز کا انتقال ہو چکا تھا۔ شیخ اسحٰق بیعت کے شوق میں سید صاحب کے پاس رائے بریلی پہنچ گئے اور بیعت کر لی۔ چند روز کے بعد سید صاحب نے خانوادہ فیض روحانی کے معمول کے مطابق منصبِ خلافت دینا چاہا تو شیخ اسحٰق نے یہ عذر پیش کیا کہ میں قرآن مجید اور چند ضروری مسائلِ دین کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ منصبِ خلافت اسے ملنا چاہیے جسے دین کا وسیع علم حاصل ہو۔ سید صاحب نے بے تکلف فرمایا کہ میرا علم بھی اسی قدر ہے۔ شیخ اسحٰق نے عرض کیا کہ ہمارے وطن میں ایک بزرگ عالمِ دین ہیں جو ہر وقت یادِ خدا میں مصروف رہتے ہیں۔ انھیں خلافت عطا فرمانا مناسب ہوگا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ میں آپ کو بھی خلیفہ بناتا ہوں اور اس بزرگ کو ساتھ لائیں گے تو انھیں بھی خلافت دے دوں گا۔ شیخ کا اشارہ سید قطب علی کی طرف تھا۔ جنھیں منصبِ خلافت ملنے کی کیفیت ان کے حالات میں مذکور ہے۔

ہجرت سید صاحب مجاہدین کی پہلی جماعت کو لے کر جہاد کے لیے سرحد تشریف لے گئے تو شیخ اسحٰق کا

دن بھی اس کارِ خیر میں شرکت کے ولولوں سے بے تاب ہو گیا۔ چنانچہ وہ بال بچوں کو خدا کے حوالے کر کے گھر سے نکل پڑے۔ کچھ مدت عظیم آباد میں ٹھہرے رہے جو مجاہدین کا ایک بڑا مرکز تھا۔ پھر ایک قافلے میں شریک ہو کر دہلی پہنچے اور شاہ محمد اسحٰق کے پاس مقیم رہے۔ اس زمانے میں مولوی سید محبوب علی اپنے قافلے کے ساتھ سرحد سے واپس آ چکے تھے اس وجہ سے غازیانِ جہاد پر ایک گونہ افسردگی طاری ہو گئی تھی اور قافلوں کے جانے کا سلسلہ معرضِ تعطل میں پڑ چکا تھا۔ شیخ محمد اسحٰق ارباب عزیمت میں سے تھے۔ عام افسردگی ان کے عزم و ہمت پر قطعاً اثر انداز نہ ہو سکی۔ وہ صرف چار رفیقوں کو لے کر فقیرانہ لباس میں نکل پڑے اور سکھوں کی حکومت سے گزرتے ہوئے سید صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ چونکہ یہ کل پانچ آدمی تھے اس لیے جماعت مجاہدین میں "پنج تن" کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

جنگ مایار | شیخ صاحب تمام لڑائیوں میں شریک رہے۔ مایار کی جنگ میں انھوں نے مردانگی اور عزیمت کا جو نقشہ پیش کیا، اس کی صحیح کیفیت الفاظ میں نہیں سما سکتی۔ سید صاحب کے حالات میں بیان ہو چکا ہے کہ سواروں کا جیش ایک اتفاقی غلطی کے باعث غنیم کی ترکتاز کا ہدف بن کر منتشر ہو گیا تھا۔ شیخ اسحٰق جوشِ شجاعت میں گھوڑا لے کر سواروں میں شامل ہو گئے تھے۔ ایک درانی سوار نے نیزے سے ان پر حملہ کیا۔ وہ وار بچانے کے لیے دائیں جانب جھکے۔ نیزے کی انی سینے کے بجائے بائیں کندھے میں گھس گئی۔ پھر اور درانی سوار ان پر ٹوٹ پڑے۔ شیخ نے مقابلہ جاری رکھا، لیکن بری طرح زخمی ہو گئے۔ دائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئیں، تیغ تیز کی ایک ضرب سر پر پڑی۔ بائیں کندھے پر نیزے کے زخم کے بعد تلوار کا بھی ایک شدید زخم لگا۔

زخموں سے چور ہو جانے کے باعث لڑنے کی ہمت باقی نہ رہی تو شیخ نے اپنی رفل ایک غازی کے حوالے کی، تلوار دوسرے غازی کو دے دی، جن کے پاس تبر کے سوا کوئی ہتھیار نہ تھا اور ان دونوں سے کہا کہ یہ سرکار کا مال ہے۔ میں آپ کو امانت سمجھ کر دیتا ہوں۔ امید ہے آپ ان کا حق ادا کرنے میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھیں گے۔ پھر آہستہ آہستہ میدانِ جنگ سے مایار کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں میاں جی محی الدین ملے جن کا پاؤں سخت زخمی ہو چکا تھا اور وہ سہارے کے بغیر چلنے سے عاجز تھے۔ شیخ اسحٰق کے ہاتھ اگرچہ بری طرح زخمی ہو چکے تھے، لیکن انھوں نے میاں جی محی الدین کو سہارا دے کر اٹھایا اور ساتھ لے کر آہستہ آہستہ

چلے۔ تھوڑی دور جا کر دونوں کو غش آ گیا اور نقاہت سے گر پڑے۔ پھر ہوش آیا تو ایک درخت کے سائے میں جا کر بیٹھ گئے۔

دیر نیوں کی شکست کے بعد مولوی سید جعفر علی نقوی مؤلف "منظورۃ السعداء" شیخ کے پاس پہنچے تو انھوں نے سب سے پہلے لڑائی کا حال پوچھا۔ فتح کی خبر سن کر بہت مسرت سے فرمایا: آؤ بھائی! گلے سے لگ جاؤ۔ پھر کہا: یہ حدیث سچی ہے کہ شہیدوں کے سکرات موت کی کیفیت ویسی ہی ہوتی ہے جیسے کسی کو چیونٹی کاٹے[1]۔ میرا جسم زخموں سے چور چور ہو گیا، لیکن کانٹا چبھنے سے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔

"دیوانۂ شاہ" علاج سے تمام زخم اچھے ہو گئے، لیکن انگلیاں کٹ جانے کے باعث ان کا دایاں ہاتھ بندوق یا تلوار چلانے کے قابل نہ رہا تھا۔ تاہم انھوں نے مجاہدین کا ساتھ نہ چھوڑا۔ کچھ مدت تک فردوسہ (نزد اسب) میں تھانیدار رہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پاک کی محبت دل پر بہت غالب تھی۔ ایک مرتبہ مولانا شاہ اسمٰعیل نے وعظ میں "وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ" کی تفسیر بڑے پرتاثیر انداز میں فرمائی۔ شیخ محمد اسحٰق پر اس وعظ کا اتنا اثر ہوا کہ بے اختیار رونے لگے اور کھانا پینا ترک کر دیا۔ مولانا کو اس واقعے کا علم ہوا تو بلا کر وجہ پوچھی۔ شیخ نے کہا کہ مجھے اپنی بیوی سے محبت ہے اور ہر وقت اس کا خیال رہتا ہے۔ یہ صورت والذین آمنوا اشد حبًا للہ کے منافی ہے۔ مولانا نے پوچھا کہ کیا اس وقت بھی یہی کیفیت تھی جب آپ وطن میں تھے؟ جواب دیا کہ اس وقت تو یہ کیفیت نہ تھی، لیکن اب یہ خیال دل سے زائل ہی نہیں ہوتا۔ مولانا نے پھر پوچھا: کیا آپ بیوی کی محبت کے جوش میں لشکر اسلام کو چھوڑ کر وطن جا سکتے ہیں؟ جواب دیا: ہرگز نہیں! مجھے دل پر اتنا قابو حاصل ہے کہ یہاں اگر ہزاروں تکلیفیں بھی پیش آ جائیں تو خوشی خوشی جھیل لوں گا اور وطن کا قصد نہ کروں گا۔ مولانا نے فرمایا: پھر اطمینان رکھیے کہ آپ یقیناً اشد حبًا للہ کے گروہ میں شامل ہیں۔ اس کے بعد کھانا کھایا۔

ایک مرتبہ سید صاحب کا وعظ سن کر شیخ محمد اسحٰق کے دل میں یہ وسوسہ بیٹھ گیا کہ ان کا ایمان نوع نفاق سے پاک نہیں۔ چنانچہ شدت رنج و غم میں خورد و نوش سے ہاتھ اٹھا لیا۔ سید صاحب نے تسلی دی تو مطمئن

[1] ما یجد الشہید من مس القتل الا کما یجد احدکم من مس القرصۃ۔

ہوئے شیخ صاحب کی اس والہانہ کیفیت کو دیکھ کر سید صاحب انہیں محبت سے دیوانہ شاہ کہہ کر پکارا کرتے تھے۔

بالاکوٹ بالاکوٹ کی لڑائی میں شریک تھے لیکن مایار کی جنگ میں دائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئی تھیں اس لیے بندوق نہ چلا سکتے تھے اور انہیں گنڈاسا دے دیا گیا تھا۔ مولانا احمد اللہ ناگپوری کی جماعت میں شریک تھے۔ مولانا احمد اللہ میان جنگ میں سید صاحب کے ساتھ رہتے تو فیصلہ کر چکے تھے اپنے بعد کسی کو جماعت کا امیر بنا دینا ضروری سمجھا۔ مولوی سید جعفر علی نقوی کو یہ منصب پیش کیا تو موصوف نے جو خط لکھا ہے اس میں جن اصحاب کو اہل ترجیح پایا ان میں حافظ مصطفیٰ کاندھلوی، مولوی محمد حسن بنارسی کے علاوہ شیخ محمد اسحاق گورکھپوری بھی تھے۔

سکھوں نے مٹی کوٹ کے ٹیلے سے اتر کر بالاکوٹ پر پیش قدمی شروع کی تو مجاہدین قصبے کی مسجد کلاں میں اور اس کے آس پاس جمع تھے۔ سکھوں کی طرف سے گولے اور گولیاں اولوں کی طرح برس رہی تھیں۔ مولوی سید جعفر علی نقوی کے بیان کے مطابق اس وقت شیخ محمد اسحاق نے فرمایا: اب دل میں شہادت کے سوا کوئی خیال باقی نہیں رہا۔ مجاہدین نے قصبے سے اتر کر سکھوں پر یورش کی تو ابتدا ہی میں شیخ محمد اسحاق کے دائیں بازو پر گولی لگی۔ دایاں بازو پہلے ہی بیکار تھا۔ بایاں بھی بیکار ہو گیا تو وہ یہ کہتے ہوئے قصبے میں واپس آ گئے کہ میں اب صرف دعا کے قابل رہ گیا ہوں۔

شہادت یقینی طور پر معلوم نہ ہو سکا کہ جنگ بالاکوٹ میں ان پر کیا گزری۔ حاجی غریب اللہ گورکھپوری ان مجاہدین میں سے تھے جو مٹی کوٹ کے دامن میں لڑتے ہوئے سکھوں کے ہجوم کے باعث قصبے میں پہنچ گئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شیخ محمد اسحاق بالاکوٹ میں بیہوش پڑے تھے۔ سکھوں کی فوج نے قصبے کی جنوبی سمت سے پیش قدمی کی تو شیخ غریب اللہ ست بنڈ کے راستے چلے گئے۔ شیخ محمد اسحاق چونکہ بیہوش تھے اس لیے انہیں ساتھ نہ لے جا سکے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ جتنے مجاہدین قصبے میں زخموں کے باعث معذور پڑے تھے سکھوں نے ان سب کو شہید کر ڈالا اور قصبے کو آگ لگا دی۔ شیخ محمد اسحاق بھی انہیں میں شامل تھے۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

گیارھواں باب

ارباب بہرام خاں

یہ تہکال کے رئیس تھے جو پشاور کے قریب ایک مشہور مقام ہے اور خلیل قبیلے میں سے تھے۔ اہل وعیال کے ساتھ سید صاحب کے ظہور سے بیشتر آپ کے پاس پہنچے۔ مال، اسباب، ہتھیار لے گئے۔ جو کچھ پاس تھا آپ کی خدمت میں بطور نذر پیش کر دیا۔ یہاں تک کہ اہلیہ کے بعض قیمتی پارچے بھی گھر میں نہ رکھے۔ سید صاحب نے دو گھوڑے اور دو تلواریں رکھ لیں، باقی ہر چیز واپس کر دی اور فرمایا کہ ہتھیار وغیرہ اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیجیے۔ ایک تلوار بطور تبرک اپنے پاس سے دی۔

اشقر انھیں دو گھوڑوں میں سے ایک کا نام اشقر تھا جو سید صاحب نے اپنی سواری کے لیے رکھ لیا تھا۔ پھولڑہ پر یورش کے سلسلے میں سید احمد علی رائے بریلوی کو امیر لشکر بنا کر بھیجا تو سواری کے لیے انھیں اشقر گھوڑا دے دیا۔ پھولڑہ کی جنگ میں سکھ اسے پکڑنے چلے تو محمد خاں خیرآبادی نے پکار کر کہا: بھائیو! یہ امیر المومنین کی سواری کا گھوڑا ہے۔ اسے دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔ پھر تنہا سکھوں کے اس گروہ پر حملہ کر دیا جس کے پاس اشقر تھا اور تھوڑی ہی دیر میں اسے چھڑا لیا۔ سکھوں نے دوبارہ حملہ کیا۔ اس میں اشقر بھی مارا گیا اور محمد خاں بھی شہید ہو گئے۔

کارنامے: غرض ارباب موصوف سید صاحب سے وابستگی کے بعد ایک لمحے کے لیے بھی الگ نہ ہوئے اور اکثر معرکوں میں شریک رہے۔ پشاور کے درانی سرداروں نے ہندوستان سے آنے والے مجاہدین کے قافلوں کو کنڈورہ میں روک دیا تو سید صاحب نے ملا قطب الدین ننگرہاری کے علاوہ ارباب موصوف کو بھیجا تا قافلوں کو ساتھ لے آئیں۔ ان کے پہنچنے میں اتفاق سے چند ایسے شکل آئے اور رہا ہو گئے۔ اپنے آدمیوں کو بھیج دیا۔ ارباب محترم کی مزید سرگرمیوں کا اجمالی مرقع ذیل میں درج ہے:

۱۔ قیام خہر کے دوران میں اتمان زئی اور پشاور پر پیش قدمی کی تجویز ہوئی تھی تو سید صاحب نے خیبر کی سمت کے قبیلوں کو بھی امداد پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس سلسلے میں بعض ہندوستانی مجاہدوں کے علاوہ ارباب بہرام خاں اور ان کے بھائی ارباب جمعہ خاں کو بھی بھیجا تھا۔

۲۔ پنجتار میں ارباب موصوف اور ان کے متعلقین شمشوت کے باغ میں رہتے تھے جو آبادی سے ایک تیر کے فاصلے پر جنوب مغرب میں واقع تھا۔

۳۔ اٹک پر یورش کے لیے جو لشکر بھیجا گیا تھا اس کے سالار ارباب بہرام خاں ہی مقرر ہوئے تھے۔

۴۔ ڈنگی پر شبخون میں بھی ارباب موصوف شریک تھے۔

۵۔ کوہ کنیرڑی (نزد عشرہ) کی جنگ میں مجاہدین کے سالار تھے۔

۶۔ قیام پنجتار کے دوران میں سید صاحب کو علاقے کے دورے کا مشورہ ارباب موصوف ہی نے دیا تھا۔

۷۔ پشاور پر پیش قدمی میں بھی ارباب موصوف اور ان کے بھائی جمعہ خاں شامل تھے، چنانچہ پشاور میں ارباب کو سرائے گورکھتری کے دروازۂ کلاں میں ٹھہرایا گیا تھا، جس کے اندر کی حویلی میں سید صاحب ٹھہرے تھے۔ ارباب جمعہ خاں کابلی دروازہ میں ٹھہرا تھا۔

پشاور اور ہجرت ثانیہ

۸۔ جن اصحاب نے سلطان محمد خاں درانی کے ساتھ مصالحت اور پشاور کی حوالگی سے اختلاف کیا تھا ان میں ارباب بہرام خاں بھی شامل تھے۔ چنانچہ انھوں نے کسی ذریعے سے عرض کرایا کہ یہ علاقہ کسی کو دینا ہی ہے تو مجھے عنایت فرمائیں۔ میں اس کی حفاظت کروں گا اور چار ہزار سپاہی ملازم رکھ کر حضرت کے ہم رکاب کر دوں گا۔ ان کی تنخواہ وغیرہ کا سارا بوجھ میرے ذمے ہوگا۔ سید صاحب نے یہ سن کر فرمایا کہ ہم اور ارباب میں کوئی مغایرت نہیں۔ علاقے کو ارباب کے حوالے کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اپنا قبضہ بحال رکھا۔ ارباب نے ہمارا مقصد نہیں سمجھا۔

۹۔ سید صاحب نے ہجرت ثانیہ کا فیصلہ کیا تو ارباب نے اپنے تمام متعلقین کو اجازت دے دی کہ اب لوگ چاہیں تو واپس چلے جائیں، میں تو حضرت کے ساتھ رہوں گا۔ ان میں سے کسی نے بھی علیحدگی گوارا نہ کی۔

۔۔ سید صاحب راج دواری میں مقیم ہوئے تو ارباب کو شاہ رکوں میں اقامت کا حکم دے دیا۔ جب سید صاحب نے پنجوں سے بالاکوٹ جانے کا فیصلہ کیا تو ارباب نے بھی معیت کی درخواست کی۔ اس وقت سے وہ آخری دم تک سید صاحب کے ساتھ رہے ۔

بالاکوٹ سکھوں کا لشکر یہاں جابہ وغیرہ ہوتا ہوا اس مقام پر پہنچا جسے آج کل شہید گلی کہتے ہیں تو میرزا احمد بیگ کے دستے سے مقابلہ ہو گیا۔ میرزا نے کمک کے لیے درخواست بھیجی تو تین اصحاب کو جانے کا حکم ملا۔ ان میں ارباب بہرام خاں بھی تھے۔ جب میرزا احمد بیگ سے معلوم ہوا کہ اب مٹی کوٹ میں سکھوں سے مقابلہ نہیں ہو سکتا اس لیے کہ پہاڑ پر پہنچ جانے کے بعد وہ بیسیوں پگ ڈنڈیوں سے نیچے اتر سکتے ہیں اور ہم ہر پگ ڈنڈی پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اس وقت ارباب نے یہ تجویز پیش کی کہ سکھوں کی لشکرگاہ پر حملہ کرنا مناسب ہوگا۔ سید صاحب نے فرمایا کہ ہم نے دریا کا پل تڑوا دیا ہے اور ہم دریا سے پار اتر کر مشرقی کنارے پر نہیں جا سکتے، جہاں سکھ لشکرگاہ ہے۔ ارباب نے عرض کیا، پل راتوں رات تیار ہو سکتا ہے۔ سید صاحب نے فرمایا: اس بات کو چھوڑیے، جو کچھ ہونے والا ہے، یہیں ہو رہے گا۔ جان نثار ارباب نے انگشت شہادت سے اپنی گردن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا:

ایں سر در راہ خدا تعالیٰ حاضر است ۔ یہ سر خدا تعالیٰ کی راہ میں قربانی کے لیے حاضر ہے ۔

شہادت سید صاحب سکھوں پر یورش کے لیے مسجد بالا سے مسجد زیریں میں آ گئے۔ وہاں سے میدان میں نکلے تو ارباب بہرام خاں ساتھ تھے۔ پھر کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ ارباب نے کہاں شہادت پائی۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ارباب کی قبر بالاکوٹ کے شمال مشرق میں ست بنے نالے کے پار شاہ اسمٰعیل کے مرقد سے ملی ہوئی تھی۔ اس بنا پر قیاس یہ ہے کہ ارباب اور شاہ صاحب مٹی کوٹ کے دامن سے لڑتے لڑتے پیچھے ہٹتے ہوئے اس مقام پر پہنچ کر شہید ہوئے، جہاں ان کی قبریں ہیں ۔

انتقال میت واقعہ بالاکوٹ سے چھ مہینے بعد ارباب شہید کے بھتیجے اور داماد محمد خاں نے اپنے ہم قوموں سے مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ ارباب کی میت کو بالاکوٹ سے تہکال منتقل کر لیں۔ بعض لوگوں نے کہا بھی کہ اب ان مرحوم کی ہڈیاں کھدوا کر لانے سے کیا حاصل ہوگا؟ محمد خاں نے جواب دیا، میرے چچا نے خلوص نیت سے

سید بادشاہ کا ساتھ دیا تھا۔ اپنا پورا مال اسباب راہِ خدا میں لٹا دیا۔ آخر جان بھی دے دی۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی لاش قبر میں سلامت ہوگی۔

غرض محمد خاں نے ایک صندوق بنوایا اور چالیس آدمیوں کے ساتھ بالا کوٹ گیا۔ قبر کھودی گئی تو میت بالکل محفوظ تھی۔ نہ اس کا کوئی حصہ بگڑا تھا، نہ بدبو پیدا ہوئی تھی۔ صرف پاؤں کے ناخنوں میں خفیف سا تغیر معلوم ہوتا تھا۔ میت کو صندوق میں رکھ کر تہکال لائے۔ پوری قوم نے انتہائی احترام سے اسے ازسرِ نو دفن کیا۔ ارباب شہید کا یہ مرقد تہکال کی جنوبی سمت کے قبرستان میں راستے کے قریب واقع ہے۔ مرقد بالکل سادہ ہے لیکن عام قبروں کے مقابلے میں خاصا بلند ہے۔ بچہ بچہ جانتا ہے کہ یہ ارباب شہید کی قبر ہے اور اکثر لوگ جاتے آتے فاتحہ پڑھتے ہیں۔

اولاد: ارباب بہرام خاں کے پانچ بیٹے تھے اور ایک بیٹی، جو ان کے بھتیجے محمد خاں کے نکاح میں تھی۔ ارباب کی شہادت کے وقت بیٹوں میں سے دو کم سن تھے۔ سرحد کے اکابر مخلصین میں سے قاضی سید محمد جان اور سید اکبر شاہ ستھانوی کے سوا کوئی فرد ارباب بہرام خاں کے پائے کا نہ تھا۔

شانِ اخلاص: ارباب شہید صد درجہ مخلص، نیک دل اور صاف گو تھے۔ سید صاحب کی مجلس شوریٰ میں بھی عموماً شریک رہے۔ ایک مرتبہ سوال پیدا ہوا کہ جہاد کا آغاز کس مقام سے ہو۔ اس موقع پر مختلف سرحدی خوانین بھی موجود تھے۔ ارباب نے بے تکلف کہا: ہم سب غرض مند ہیں۔ میں پشاور سے نکالا ہوں۔ میرا جی چاہتا ہے کہ جلد سے جلد پشاور فتح ہو جائے۔ محمد خاں جمعدار اٹک سے نکلا ہے لہٰذا وہ اٹک کا خواہاں ہے۔ مر خاں کو پکھلی کی آرزو ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہم سب خاموش رہیں اور فیصلہ ہندوستانی بھائیوں پر چھوڑ دیا جائے کہ ان کی رائے ذاتی خواہش یا طبعی رجحان سے بالکل پاک ہوگی۔ وہ جس جگہ حملے کی تجویز کریں اسی کے مطابق عمل کیا جائے۔

ایک سبق آموز واقعہ: سید صاحب کو ارباب سے بڑی محبت تھی لیکن ایک موقع پر صاف گوئی میں تامل نہ ہوا۔ غالباً پنجتار میں سید صاحب کی اہلیہ کے لیے پالکی کا انتظام کیا گیا اس لیے کہ وہ حالتِ حمل میں تھیں۔ ارباب کا اہلِ خانہ کو پیدل [illegible] مساوات کے خلاف [illegible]۔ سید صاحب کو اطلاع ہوئی تو فرمایا: ارباب سے کہہ دیجیے میں آپ کو [illegible] دوسروں کی خوشامد یا طرفداری ملحوظ نہیں کیونکہ وہ جہاں بھی ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ البتہ ساتھیوں کی دلجوئی کر سکتا ہوں تاکہ وہ ایمان پر پکے ہو جائیں۔ میری اہلیہ حالتِ حمل میں ہے ورنہ اس کے لیے بھی گھوڑے ہی کی سواری کا انتظام کیا جاتا۔ ارباب کے اہلِ خانہ میں سے کسی کو ایسا عذر ہو تو ضرور پالکی کا انتظام کر دیا جائے گا۔

اور بعض دوسرے اکابر کو نامزد کرکے آخری فیصلہ فرمایا۔ پھر عبدالحمید خاں کو بلا کر کہا: "خان بھائی! ہم کئی روز سے کسی کو رسالدار مقرر کرنا چاہتے تھے۔ سو ہم نے آپ کو یہ عہدہ دیا۔ آپ ان بھائیوں کو سواری اور سپہ گری کی تعلیم دیتے رہیں۔" عبدالحمید خاں نے عرض کیا: "حضرت! میں فرماں بردار ہوں، لیکن میرا مزاج ذرا تند ہے اور یہ امر اختیاری نہیں کہ چھوڑ دوں۔ شاید بھائیوں کو میری افسری گراں گزرے۔ یہ کام خدا کے واسطے ہے اور نوابوں رئیسوں کی سی فوج کا نہیں۔" سید صاحب نے سراپا شفقت بن کر فرمایا: "خان بھائی! اس کا اندیشہ نہ کریں۔ ہم دعا کریں گے۔ امید ہے، اللہ تعالیٰ آپ کے مزاج کی تیزی دور کر دے۔"

دعا غرض آپ نے دست مبارک سے اپنا عمامہ عبدالحمید خاں کے سر پر باندھا اور فرمایا کہ دو شالے اور رومال میں سے جو پسند ہو لے لیجیے۔ خان نے رومال لے لیا۔ سید صاحب نے سنہری قبضے کی ایک سروہی عبدالحمید خاں کے گلے میں ڈال دی جو نواب امیر خاں والی ٹونک نے بطور نذر پیش کی تھی۔ یہ نواب کو راجہ مان سنگھ والی جودھ پور نے دی تھی۔ اس کا پرتلا سادہ ہی تھا۔ ایک تنوار اور گھوڑا بھی دیا۔ پھر برہنہ سر ہو کر دعا کی۔ رسالدار نے ایک اشرفی اور پانچ روپے نذر کے طور پر پیش کیے اور مسجد میں جا کر شکرانے کے دو نفل پڑھے۔ بلاشبہ عبدالحمید خاں کا مزاج بڑا تیز تھا۔ سید احمد علی بھی ان کے محاسن کے معترف تھے۔ صرف یہ کہتے تھے کہ ان کا مزاج تیز ہے۔ وہ بات بات پر ناخوش ہو جاتے ہیں، لیکن تمام راوی متفق ہیں کہ رسالدار مقرر ہونے کے بعد عبدالحمید خاں حلم، بردباری اور حلاوت مزاج کا پیکر بن گئے تھے۔

جنگ امب جب سید صاحب نے پکھلی کے رؤسا و خوانین کی طلب پر اس طرف پیش قدمی کا ارادہ کیا تو ایک لشکر اپنے بھانجے سید احمد علی کی سرکردگی میں بھیج دیا تھا، جو پائندہ خاں کی مخالفت کے باعث ستھانہ میں ٹھیر گیا تھا۔ رسالدار عبدالحمید خاں کو اس لشکر میں نائب سالار بنایا تھا۔ پائندہ خاں سے جنگ کی صورت پیش آگئی تو سید صاحب نے مولانا شاہ اسمٰعیل کو سالار اعظم بنا دیا تھا۔ وہ خود ڈومسرٹ میں مقیم ہو گئے تھے اور کچھ جیش انھوں نے جا بجا دوسرے مقامات پر متعین کر دیے تھے۔ پھر پہلے کا ایک نہایت عمدہ منصوبہ بنا کر تمام جیشوں کو پیش قدمی کے وقت اور یورش کے مقامات کی نسبت مفصل ہدایات دے دی تھیں۔ پائندہ خاں نے جب دیکھا کہ غازیوں کی یورش کے مقابلے میں کامیابی کی کوئی صورت نہیں تو شاہ اسمٰعیل کے سامنے صلح کی تجویز

پیش کردی اور انھوں نے تمام جیشوں کو پیش قدمی سے روک دیا۔ خود پائندہ خاں خفیہ خفیہ پیش قدمی کی تیاری کرتا
رہا۔ سید احمد علی اپنے لشکر کے ساتھ ستھانہ سے روانہ ہو چکے تھے کہ شاہ اسمٰعیل کا امتناعی حکم مل گیا۔ وہ وہیں سے
لوٹ پڑے۔ لیکن وہ ایسی جگہ تھے، جہاں سے پائندہ خاں کی فوج کی نقل و حرکت صاف صاف نظر آ رہی تھی ۔
عبدالحمید خاں نے کہا کہ سید احمد علی صاحب! پائندہ خاں دھوکا دے رہا ہے۔ آپ واپس نہ ہوں اور آگے بڑھیں
انھوں نے فرمایا کہ میں سالار اعظم کے حکم سے مجبور ہوں۔ اس اثنا میں پائندہ خاں کی فوج نے کوہ کھیرڑی کے نمازیوں
پر حملہ کر دیا اور گولیاں چلنے لگیں۔ عبدالحمید خاں نے پھر کہا کہ سید احمد علی! لڑائی شروع ہے۔ بہتر یہ ہے کہ آپ
چلیں، مدد مجھے جانے دیں۔ سید احمد علی نے انھیں بھی روک دیا۔ اس اثنا میں لڑائی کی خبر آ پہنچی اور عبدالحمید
خاں کی رائے درست ثابت ہوئی۔

انتظام عشر

انتظام عشر کے سلسلے میں عبدالحمید خاں قاضی سید حبان کے ساتھ تھے۔ اس کے علاوہ
بھی یہ عموماً دیہات کا دورہ کرتے رہتے تھے۔ اپنے تھوڑے تھوڑے سوار جا بجا متعین کر رکھے تھے، لیکن طریقہ یہ
تھا کہ اپنے کسی سپاہی کو گاؤں کے اندر نہ جانے دیتے تھے۔ سب کو حکم تھا کہ جس چیز کی ضرورت ہو، باہر ٹھہر کر
منگوا لیں۔ ایک دفعہ ایک مجاہد سے غلطی سرزد ہو گئی تو رسالدار نے اسے سخت سزا دی۔ ایک مرتبہ پانی میں دو
سواروں نے ایک ایسے شخص کے کھیت سے چارا کاٹ لیا جس کی باری نہ تھی۔ رسالدار تک یہ بات پہنچی تو
اس درجہ خفا ہوئے کہ ایک سوار کے کندھے پر الٹی تلوار ماری۔

جنگ مایار

مایار کی جنگ میں انھیں حکم ملا تھا کہ رسالے کے ساتھ ایک خاص مقام پر ٹھہرے رہیں اور
امیر المومنین کے حکم کے بغیر حملہ نہ کریں۔ جنگ نازک صورت اختیار کر گئی اور نظر بظاہر سید صاحب دشمنوں میں گھر
گئے تو ایک سوار نے یہ سمجھ کر حملہ کر دیا کہ سید صاحب کو بچانا ہر مصلحت پر مقدم ہے۔ رسالدار نے سمجھا کہ حملے کا حکم
آ گیا ہے۔ انھوں نے بھی ہلہ بول دیا۔ ان کے پاس دو گھوڑے تھے، جن پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ جنگ
مایار کے دن سمند کی باری تھی۔ جس طرف باگ اٹھاتے، دشمن کی صفیں چیر کر رکھ دیتے۔ تین چار مرتبہ درانی لشکر
میں گھسے اور تلواریں مارتے ہوئے پار نکل گئے۔ ان حملوں میں خود بھی زخموں سے چور ہو گئے۔ آخر گھوڑے سے
گر پڑے۔ جسم قدرے فربہ تھا۔ زرہ کی کڑیاں گوشت میں کھب گئیں۔ راوی کا بیان ہے کہ جنگ کے بعد انھیں

میدان سے اٹھا کر لائے تو جس کی نظر محبوب رسالدار پر پڑتی، بے اختیار شک پیدا ہوتا۔ خود رسالدار بالکل صابر و شاکر تھے۔ ایک بھی مرتبہ تکلیف کا کوئی کلمہ زبان پر نہ آیا۔ وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ ایک بیان ہے کہ ٹونک پہنچ کر وفات پائی۔ دوسرا بیان ہے کہ ٹونک سے انھیں پنجتار لے گئے تھے۔ وہیں جان بحق ہوئے۔

شانِ انتظام راویوں نے بیان کیا ہے کہ ان کا گھوڑا ہر وقت ساز و سامان سے لیس رہتا تھا تاکہ ضرورت کے موقع پر اداے فرائض میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ ہو۔ انتظام کی یہ کیفیت تھی کہ کسی شخص کو کسی معاملے میں دخل دینے کی مجال نہ تھی اور کسی کی سفارش نہ سنتے تھے۔

ان کے بعد حمزہ علی خان رسالدار مقرر ہوئے۔ وہ بڑے عابد و زاہد اور صاحب تاثیر تھے۔ سپاہ گری اور نیزہ بازی میں بے نظیر مانے جاتے تھے۔ حمزہ علی خاں حج میں بھی ساتھ تھے۔ انھیں کی یہ روایت ہے کہ سید صاحب کے پاس قیامِ کلکتہ کے دوران میں بے اندازہ شیرینی آتی تھی اور اس میں اکثر بتاسے ہوتے تھے۔ سید صاحب کو ایک ایک دو دو بتاسہ چکھنا پڑتا تھا۔ چکھتے چکھتے زبانِ مبارک پر آبلے پڑ گئے تھے۔

پسماندگان کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ رسالدار عبدالحمید خان کے متعلقین میں سے کون کون موجود تھے۔ سید صاحب کے ایک مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اہل و عیال سرونج میں تھے۔ ایک مکتوب میں نواب وزیرالدولہ کو لکھتے ہیں کہ اخلاص نشان عبدالحمید خان خدمت دین میں مستعدی سے مصروف ہیں۔ ان کے متعلقین آپ کے زیر سایہ رہتے ہیں۔ امید ہے کہ ان کی پرورش پر خاص توجہ مبذول رکھیں گے۔

تیرھواں باب

سیّد محمّد علی رام پوری

معلوم نہیں سیّد محمد علی نے کس زمانے میں بیعت کی، البتہ یہ معلوم ہے کہ وہ مجاہدین کا قافلہ لے کر ابتدا دور ہی میں سرحد پہنچ گئے تھے جس زمانے میں سیّد محبوب علی دہلوی کی مراجعت کے باعث قافلوں کی آمد رک گئی تھی، اس زمانے میں جن اصحاب کو بغرض دعوت و تبلیغ ہندوستان بھیجا گیا، ان میں سیّد محمد علی بھی تھے

وقائع کا بیان | "وقائع" میں ان کے ارسال کی کیفیت یوں بیان ہوئی ہے :

مولوی محمد علی رام پوری کو حضرت علیہ الرحمۃ نے فرمایا کہ تم طرف حیدر آباد دکھن کے جاؤ۔ انھوں نے عذر کیا کہ مجھ کو نہ اس قدر علم ہے کہ کسی عالم سے مباحثہ یا مناظرہ کروں اور نہ یہ سلیقہ ہے کہ لوگوں کے انبوہ میں وعظ و درس کروں۔ مجھ کو تو آپ کسی کام کو وہیں بھیجیں کہ وہ کام کر کے چلا آؤں۔ آپ نے فرمایا کہ خیر جس بات کا عذر کرتے ہو، اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ خود دور کر دے۔ پھر آپ نے اپنا کرتا اور پاجامہ اور تاج (ٹوپی) ان کو پہنایا۔ ۔ چار پانچ آدمی ان کے ہمراہ کیے۔ ان میں ایک نعیم خاں رام پوری تھے اور دوسرے عنایت اللہ خاں تنکی والے اور تیسرے عبداللہ کہ انھیں کے رفیقوں میں سے تھے اور باقی کے نام یاد نہیں اور فرمایا کہ یہاں سے سندھ کو جانا۔ وہاں پیر کوٹ میں بی بی صاحبہ سے ملتے ہوئے کراچی بندر کو جانا۔ وہاں سے کشتی پر سوار ہو کر بمبئی میں اترنا پھر وہاں سے حیدر آباد کو جانا[1]۔

حیدر آباد | سیّد محمد علی نے حیدر آباد کا قصد کیا تو وہاں مخالف بھی تھے اور موافق بھی۔ مولوی حیدر علی دیوان چندو لال کے پیشکار تھے، انھوں نے سیّد محمد علی کی مدد کی۔ دیوان کے سامنے نہایت بڑے رنگ میں پیش کیا۔ کہا کہ

[1] وقائع، ص ۷۴۸-۵ ۔

سید محمد علی نے ملا بحر العلوم کے فرزند مولوی عبد الرب کے مدرسے میں ڈیرے ڈالے اور کتاب و سنت کی اشاعت شروع کی۔ آپ کے وعظ و نصیحت سے ہزاروں لوگ راہ راست پر آ گئے۔ ان میں سے خاص طور پر قابل ذکر نواب خان عالم خاں بہادر تہور جنگ ہیں، جو مدراس کے معزز رؤسا میں سے تھے اور ان کی صاحبزادی نواب ارکاٹ کی بیگم تھی۔ نواب موصوف نے بیعت کرتے ہی راہ سنت اختیار کر لی اور اپنے گھر کی وہ تمام چیزیں تڑوا ڈالیں جو شریعت کی رو سے ناجائز تھیں۔

تبلیغ کے نتائج: خود نواب خان عالم نے سید محمد علی کی تبلیغ کے اثرات یوں بیان کیے ہیں:

۱۔ شراب، سیندھی، گانجا پینے والے فاسق اور ترشول[1] کو پوجنے والے عوام و خواص پنج وقتہ نماز پڑھنے لگے۔

۲۔ مردوں کے علاوہ بعض عورتیں بھی تہجد گزار ہو گئیں۔

۳۔ تمام غیر شرعی اعمال و رسوم کا خاتمہ ہو گیا[2]۔

دس مہینے کی تبلیغ کے یہ کرشمے دیکھ کر مخالف بھی جوش میں آ گئے اور انھوں نے اعتراضات شروع کر دیے۔ سید محمد علی کا طریقہ یہ تھا کہ فضول بحثوں اور مناظروں میں نہ الجھتے، اپنے اصل مقصد سے کام رکھتے اور اصلاحِ عقائد و اعمال پر زور دیتے۔

مدراس کا دوسرا سفر: سید صاحب کی شہادت کے بعد سید محمد علی رام پور چلے گئے۔ ۱۲۴۸ھ میں حج کے ارادے سے کلکتہ پہنچے تو مدراس والوں نے پے در پے درخواستیں بھیجیں کہ یہاں ٹھہرتے ہوئے جائیے بلکہ نواب ارکاٹ کی والدہ نے ایک خاص آدمی کلکتہ روانہ کر دیا کہ سید محمد علی کو ہمارے جہاز "دریا دولت" پر سوار کر کے لائے۔ ان کی اوّلین غرض یہ تھی کہ سید محمد علی صاحب سے اپنے بیٹے کے لیے اولاد کی دعا کرائیں۔ سید موصوف مدراس پہنچ کر پہلے متیال پیٹ میں ٹھہرے۔ وہاں ان کے لیے بڑی حویلی خالی کرا دی گئی تھی۔ بعد ازاں نواب ارکاٹ کی والدہ نے جعفر علی خاں خانساماں کو بھیج کر سید صاحب کو اپنے ہاں بلا لیا اور سید صبغۃ اللہ شاہ کی حویلی میں اتارا۔ سید موصوف کی دعا سے خدا نے نواب ارکاٹ کو اولاد عطا کی۔ اس موقع پر مخالفوں نے

---

[1] ایک ہندو دیوتا جسے مسلمان بھی پوجتے تھے۔ [2] "تنبیہ الضالین" ص ۲۔

چودھواں باب

میاں جی محی الدین چشتی

یہ سید صاحب کے مخلص ارادت مند تھے۔ ان کا ایک قابل ذکر واقعہ یہ ہے کہ انھیں شاہ بخارا کے پاس دعوت جہاد کی غرض سے بھیجا گیا۔ جب سفارت کی تجویز پختہ ہوگئی تو سید صاحب نے فرمایا کہ کوئی موزوں آدمی تجویز کیا جائے۔ شاہ اسمٰعیل نے میاں جی چشتی کا نام تجویز کیا۔ سید صاحب نے انھیں تیاری کا حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ دو آدمی ساتھ لے جائیں۔ چنانچہ انھوں نے مندرجہ ذیل آدمی تجویز کیے: شیخ محب اللہ ساکن [illegible] ضلع مظفر نگر، نصیر الدین، رحیم بخش، اسمٰعیل شاہ، ہمت خاں، فتح یاب خاں، حکیم عبدالحکیم دہلوی جو حکیم جی [illegible] والے مشہور تھے۔ دو آدمی قندھاری تھے۔

سید صاحب نے انھیں کئی قلمی قرآن مجید دیے کہ راستے کے رؤسا کو دیے جائیں۔ ان میں سے ایک قرآن مجید شاہ بخارا کے لیے تھا۔ متعدد خدام ساتھ دیے۔ میاں جی صاحب اس سفر سے جنگ زیدہ کے تین روز بعد واپس آئے۔ سفر کی کیفیت ذیل میں درج ہے جو میاں جی صاحب کے پڑنواسے شیخ محب اللہ سے معلوم ہوئی۔ شیخ صاحب سید صاحب کی شہادت کے بعد ٹونک میں آ بسے تھے اور وہاں انھوں نے دکان کھول لی تھی۔

میاں جی صاحب نے خرچ کے لیے نقد روپیہ بھی ساتھ لے لیا تھا، لیکن واقف کار لوگوں نے انھیں مشورہ دیا کہ بعض حصوں میں سکے کا رواج ہی نہیں اور جنس کے بدلے جنس لی جاتی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ایسی چیزوں کی خاصی مقدار ساتھ لے لی، جن کی طلب راستے کے لوگوں کو رہتی تھی۔ مثلاً ہلدی، سونٹھ، نمک، سوئیاں، سوتی کپڑا۔ وہ باجوڑ ہوتے ہوئے چترال گئے اور شاہ چترال سے ملاقات کی۔ سید صاحب کا ایک مکتوب انھیں دیا۔ اس نے قیام و طعام کا اچھا بندوبست کر دیا۔ وہاں میاں جی صاحب کے

نے بڑی چیزیں فروخت کیں۔ مثلاً ایک ایک سوئی کی قیمت میں پچیس تیس سیب یا شفتالو مل جاتی
تھیں۔ سوئی اور مہندی کی ایک ایک گرہ انگور کے پانچ پانچ خوشے دے کر خریدی جاتی تھی۔ کپڑے کا
چوتھائی بالشت یا [illegible] کے برابر دیا گیا تھا۔ اس کے بدلے پشمینے کا نہایت عمدہ چوغہ مل جاتا تھا۔ حکومت کا کاروبار
بہت سادہ تھا۔ وہاں شمعیں بھی نایاب تھیں۔ لوگ چیڑ کی لکڑیاں جلا کر شمعوں کا کام لیتے تھے۔

چترال سے بدخشاں کی سرحد تک رہبروں کا انتظام شاہ چترال نے کر دیا۔ پھر یہ لوگ فیض آباد
پہنچے۔ وہاں کے حاکم سے میاں جی نے قلعے میں ملاقات کی۔ اس نے بھی قافلے کو بہت ٹھہرایا اور
مہمان داری کا انتظام کر دیا۔ پانچ دن فیض آباد میں گزار کر رہبر کے ساتھ قندوز روانہ ہوئے جہاں کا حاکم
محمد مراد بیگ تھا۔[1]

وہاں بھی قافلے کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ عام لوگوں کی زبان ترکی تھی۔ شہر کے رئیس فارسی اور ترکی
دونوں بولتے تھے۔ میاں جی نے محمد مراد بیگ کو بھی ایک قرآن اور ایک غلام نذر دیا۔ اس نے اپنے
ایک درباری کو قافلے کی مہمان داری کا حکم دے دیا۔ ایک مہینہ وہاں ٹھہرے رہے۔ اس اثنا میں مراد بیگ
سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ وہاں پلنگ پر سونے کا دستور نہ تھا۔ عام لوگ فرش پر قالین بچھا کر سوتے تھے۔
غیر مسلموں کو حکم تھا کہ مسلمان سامنے آجائیں تو گھوڑے سے اتر پڑیں۔ شلوار یا سفید پگڑی کی پابندی تھی۔ صرف
ایک ہندو آتما رام ان پابندیوں سے آزاد تھا۔ یہ پشاور کا باشندہ تھا اور اس نے ایک بہت نازک
موقع پر مراد بیگ کے بیٹے کے علاج کا انتظام کر دیا تھا۔ مراد بیگ نے اس کی خواہش کے مطابق تمام پابندیاں
اٹھا دیں اور اسی کو اپنے تمام کاروبار کا مختار بنا دیا۔

قندوز کی ایک خصوصیت یہ بتائی گئی کہ ہفتے میں دو بار ایک کھلی جگہ بازار لگتا تھا جس میں شام تک
خرید و فروخت جاری رہتی تھی۔ دکاندار اچھی چیزیں تو گھر اٹھا لے جاتے، باقی سب چیزیں وہیں کی وہیں
چھوڑ جاتے، اور کسی کا ذرا سا بھی نقصان نہ ہوتا۔

میاں جی صاحب نے اپنے کچھ ساتھی قندوز میں چھوڑے اور تین کو ہمراہ لے کر بخارا پہنچے۔ شاہ بخارا نے
عزت و تکریم سے [illegible] کا انتظام کر دیا۔ ابتدا میں بڑی گرم جوشی سے ملتا رہا۔ پھر [illegible]

[1] [illegible] مرزا حسن جان نے اپنے سفرنامے میں [illegible] مراد بیگ کا حلیہ یوں بیان کیا ہے۔ قد چھوٹا، جسم دبلا پتلا، آنکھیں بہت چھوٹی، [illegible]
[illegible]

چھپی سی گرمجوشی باقی نہ رہی۔ معلوم ہوا کہ ان کے درباریوں نے غلط بیانیوں کے ذریعے سے شاہ کو بدظن کر دیا ہے۔ غلط بیانی یہ تھی کہ سید صاحب جہاد کے لیے نہیں آئے بلکہ انگریزوں نے اپنا دلال وسط ایشیا میں بھید لینے کی غرض سے انھیں بھیجا ہے، لہٰذا ان کی امداد نامناسب ہے۔ میاں جی چشتی پانچ مہینے وہاں ٹھہرے رہے۔ جب دیکھا کہ مزید قیام بالکل فضول ہے تو واپسی کا فیصلہ کر لیا۔ شاہ نے انھیں ایک ترکی گھوڑا، تین بانات، تین تھان کتان کے اور پچاس اشرفیاں دیں۔ چنانچہ وہ ایک قافلے کے ساتھ قندز پہنچے وہاں سے بدخشاں آئے، یہاں حکیم عبدالحکیم دہلوی نے وفات پائی۔ پھر چترال، سوات، دیر ہوتے ہوئے پنجتار پہنچے۔ اس سفر میں تقریباً دو سال صرف ہوئے۔

میاں جی صاحب کا ذکر جنگ مایار میں بھی آیا ہے جس میں ان کی ایڑی پر ایسا سخت زخم لگا تھا کہ چلنے سے معذور ہو گئے تھے۔ جنگ بالاکوٹ میں شریک نہ تھے۔ غالباً معذوری کے باعث انھیں وہیں چھوڑ دیا تھا جہاں بی بی صاحبہ مقیم تھیں۔

پندرھواں باب

نواب وزیر الدولہ

آپ امیر الدولہ امیر الملک نواب محمد امیر خاں بہادر شمشیر جنگ والیٔ ٹونک کے فرزند ارجمند تھے۔ ۲۷ جمادی الاخریٰ ۱۲۵۰ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۸۳۴ء کو مسند نشین ہوئے۔ اکبر شاہ ثانی مغل شہنشاہ ہند کی طرف سے وزیر الدولہ امیر الملک بہادر نصرت جنگ کا خطاب ولی عہدی کے زمانے ہی میں عطا ہو چکا تھا۔ باپ بیٹا دونوں سید صاحب کے مخلص ارادت مند تھے۔ بیٹے نے باقاعدہ بیعت کر کے منصب خلافت حاصل کیا تھا۔ ایک نیاز مند نے لکھا ہے:

امیر المومنین نواب خاں ہست | مجسم غیرت از صدق و اخلاص
وزیر الدولہ آں ذو الفیض والجود | ببیں در گلشنش "بحر الفیض" موجود
ز نقد معرفت گنجینہ او ست | کہ سر احمدی در سینہ او ست
چو من دیگر کہ جام دیدہ باشم | ہم ایزد دیگرے بگزیدہ باشم[1]

نواب وزیر الدولہ نے کم و بیش تیس سال عدل و داد سے حکومت کی۔ ۱۳ محرم الحرام ۱۲۸۱ھ (۱۸ جون ۱۸۶۴ء) کو نماز عصر کے وقت امیر باغ کی کوٹھی میں انتقال کیا۔

روزانہ زندگی: ان کی زندگی اسلامیت کا بہت پاکیزہ نمونہ تھی۔ تہجد اور ظہر کے سوا تمام نمازوں کے لیے گرمی ہو یا سردی، پیدل مسجد میں جاتے۔ بارش میں بھی یہ پروگرام بدستور قائم رہتا۔ مستغیث راستے میں مل جاتا تو ساتھ ساتھ آتے اور اس کا بیان سنتے۔ روزانہ مشاغل کی کیفیت یہ تھی: صبح کی نماز مسجد میں ادا کرتے۔ اور وہیں ختم کا سلسلہ طلوع کے بعد تک جاری رہتا۔ نماز اشراق کے بعد تھوڑی دیر کے لیے دیوان خانے میں جاتے۔ پھر کبھی پالکی میں بیٹھ کر اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر سیر کرتے۔ بعد ازاں [illegible]

[1] [illegible] اگر یہ بات صحیح ہو تو مجھے شرک کا مجرم سمجھو۔

سپہ گری کے اُستاد آجاتے مثلاً بانک، پٹا، پھینکیت، بستر خانی، نجی مدد، گدکا، نیزہ بازی،
تیراندازی وغیرہ اور تھوڑی دیر تک ان فنون کی مشق جاری رہتی۔ مشق سے فارغ ہو کر خاصہ تناول فرماتے
اور سپاہ کے ساتھ بیٹھتے۔ دوپہر کے بعد قیلولہ کرتے۔ ظہر کی نماز ادا کر کے قرآن پڑھتے۔ سہ پہر
کے وقت اہل کار طلب کر لیے جاتے اور خزانے کا حساب دیکھتے۔ رات کا کھانا کبھی نمازِ مغرب کے
بعد کبھی نمازِ عشا کے بعد کھاتے۔ نمازِ عشا کے بعد حافظ کریم اللہ سے قرآن سنتے پھر بستر پر چلے جاتے۔

شانِ عقیدت: سید صاحب سے عقیدت کے جو عملی ثبوت نواب وزیر الدولہ نے پیش کیے، کم از کم امراء کی صف
میں ان کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ جہاد میں ہر قسم کی امداد کی۔ سفرِ ہجرت میں ٹونک سے اجمیر تک سید
صاحب کے ہم رکاب رہے۔ جب سنا کہ سرحد میں سید صاحب کو امیر جہاد بنا لیا گیا ہے تو نواب
مرحوم نے ایک جمعیت تمام سید صاحب کی خدمت میں بھیج دی اور عرض کیا کہ حکم ہو تو وہاں حاضر ہو
جاؤں۔ سید صاحب نے روک دیا کہ تھوڑی دیر انتظار کیجیے۔ شہادت کے بعد سید صاحب کے
اہل و عیال اور متعلقین کو براہِ سندھ ٹونک میں بلوا لیا اور سید صاحب کی اہلیہ کی پالکی ایک میل کے فاصلے
سے اپنے کندھے پر اٹھا کر ٹونک لائے۔ تمام متعلقین کے لیے وظیفے مقرر کیے۔ سید صاحب کی بڑی
صاحبزادی سیدہ سائرہ کے بیٹے کے لیے دو ہزار کی جاگیر مقرر فرمائی۔ جماعت مجاہدین سے جتنے اصحاب ٹونک
پہنچے ان سب کے لیے موزوں عہدے تجویز فرما دیے۔ جن اصحاب نے عہدے قبول نہ کیے، ان کے لیے
وظیفے مقرر کر دیے۔ جماعت مجاہدین کے لیے ایک الگ محلہ آباد کر دیا جو اب تک "محلہ قافلہ" کے نام سے
مشہور ہے۔

سید صاحب کے حالات: اس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف کارنامہ یہ ہے کہ جماعت مجاہدین میں سے جتنے اصحاب اپنے اپنے
وطنوں میں واپس آ گئے تھے، پے در پے قاصد بھیج کر انھیں ٹونک بلوایا اور اس کام پر مامور کر دیا کہ سید
صاحب کے متعلق تمام مستند حالات جمع ہو جائیں۔ چنانچہ سید صاحب کے بڑے بھانجے سید محمد علی سے
"مخزنِ احمدی" مرتب کرائی جو سفرِ حج کے اختتام تک سید صاحب کے حالات میں ایک مستند کتاب ہے۔
یہ کتاب ایک مرتبہ مطبع مفید عام آگرہ میں چھپ بھی گئی تھی۔ سید جعفر علی نقوی نے "منظورۃ السعداء فی

"احوال الغزاۃ والشہداء" فارسی میں مرتب کردی جو کم و بیش پانسو صفحات پر مشتمل ہے۔ علاوہ بریں مختلف مجاہدین روزانہ قافلہ کی مسجد میں بیٹھ جاتے اور جس شخص کو جو حالات معلوم ہوتے وہ بطور روایت بیان کرتا اور یہ روایت نقل کرلی جاتی۔ کسی کو اس روایت کے کسی حصے سے اختلاف ہوتا تو اس کا اختلاف الگ بطور روایت لکھ لیا جاتا۔ اس طرح "وقائع احمدی" مرتب ہوئی جو کم و بیش تین ہزار صفحات میں پھیلی ہوئی ہے۔ سید صاحب کے حالات کے متعلق مستند روایات کا یہ نہایت قیمتی ذخیرہ ہے۔

تذکرۂ حق سید صاحب کی شہادت سے کچھ مدت بعد مولوی سید نصیر الدین دہلوی نے احیاء تحریک جہاد کی کوشش کی تھی اور مولوی صاحب موصوف بھی سید صاحب کی طرح مجاہدین کی ایک جماعت کے ساتھ **ٹونک** سے سندھ پہنچ گئے تھے۔ وہ کچھ مدت سندھ میں رہے۔ پھر امیر دوست محمد خاں کی حمایت میں انگریزی فوج سے جنگ کی جس نے شاہ شجاع کو تخت کابل پر بٹھانے کے لیے پیش قدمی کی تھی۔ بعد ازاں مولوی صاحب ستھانہ پہنچ گئے اور جماعت مجاہدین کی قیادت سنبھال لی۔ نواب وزیر الدولہ خاں کی امداد میں بھی کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا جاتا۔

وصایا نواب وزیر الدولہ کے فرزند ارجمند امین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علی خاں بہادر صولت جنگ بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریزوں نے انھیں تین سال بعد مسند حکومت سے اتار کر بنارس بھیج دیا۔ اگرچہ اس اقدام کے وجوہ بہ ظاہر کچھ اور بتائے گئے۔ نواب وزیر الدولہ بڑے عالم تھے۔ اس کا اندازہ ان کی ضخیم کتاب "وصایا الوزیر علی طریق البشیر والنذیر" سے ہو سکتا ہے۔ اس کتاب میں سید صاحب اور جماعت مجاہدین کے بعض دوسرے اکابر کے متعلق بہت سی حکایتیں درج کی ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتیں۔ اگرچہ ملک کے سیاسی حالات نے انھیں اور بعض دوسرے مخلصین کو بے بس کر دیا تھا لیکن دلی جذبات بعض اوقات بے اختیار زبان پر آ جاتے تھے۔ "وصایا" میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ میرے والد نواب امیر خاں اور انگریزوں کے درمیان صلح کی گفتگو ہو رہی تھی تو سید صاحب نے پیشتر بتا دیا تھا کہ فلاں فلاں علاقے نواب کو ملیں گے، چنانچہ وہی علاقے ملے۔ اس حکایت میں لکھتے ہیں:

سولھواں باب

سیّد قطب علی اور سیّد جعفر علی

نجھوا میر ضلع بستی (یو۔ پی) وطن، متوسط درجے کے زمیندار تھے۔ شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کے بیان کے مطابق علم و فضل اور زہد و تقویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ سید صاحب نے شیخ اسحٰق کو خلافت دینی چاہی تو انھوں نے قسمت علم کے عذر کی بنا پر سید قطب علی ہی کا نام لیا تھا۔ اس دریائے فیض سے بے تکلف قطرہ کہ سید موصوف کو بھی لے آئے۔

قطب علی ستر آدمیوں کو لے کر سید صاحب کے پاس اس زمانے میں تکیہ شریف پہنچے، جب آپ حج سے واپس آئے تھے۔ اس قافلے میں ان کے چھوٹے بیٹے سید حسن علی بھی شامل تھے۔ بڑے بیٹے سید جعفر علی صاحب منظورۃ السعداء اس وقت لکھنؤ میں تعلیم پا رہے تھے۔ وہ علالت کے باعث ساتھ نہ جا سکے۔

سید قطب علی بہت کبیر السن تھے۔ راستے بریلی سے ایک کوس کے فاصلے پر رحمت مغفرت کے باعث بیمار پڑ گئے۔ تکیہ شریف پہنچے تو ان کی مہمان داری سید صاحب کے بھتیجے سید محمد یعقوب کے سپرد ہوئی۔ ایک مہینہ ٹھہرے رہے۔ پھر سید صاحب نے مولانا عبدالحی سے خلافت کی سند لکھوا دی۔

سید صاحب کی شہادت کا غم قصد ہجرت کی شہرت ہوئی تو سید قطب علی بھی معیت کے لیے تیار ہو گئے۔ سید صاحب نے ضعیفی کے پیش نظر انھیں روک دیا اور فرمایا کہ دعا کرتے رہیے اور ہمارے لیے دعا انتظار کیجیے۔ منتظر رہیے۔ وہ رک گئے۔ سید صاحب کی شہادت کی خبر سن کر بہت روئے۔ مولوی جعفر علی نقوی کا بیان ہے کہ بار بار فرماتے تھے: کاش میرا بیٹا سید جعفر علی مر جاتا اور سید صاحب زندہ رہتے۔ نیز فرماتے تھے کہ سید صاحب کے ہاتھوں غلبۂ اسلام دیکھنے کی آرزو تھی۔ اب میں زندہ نہیں رہنا

حیات۔ مولوی سید جعفر علی کے بیان کے مطابق انھوں نے فرمایا :

تمنا بود کہ اللہ تعالیٰ از دست حضرت	آرزو تھی کہ اللہ تعالیٰ حضرت امیر المومنین
امیر المومنین کفار نگونسار را ازیں دیار پاک گرداند	کے ہاتھوں اس سرزمین کو کافروں سے پاک
شوکت اسلام معائنہ نماید۔ چوں جناب	کردے اور اسلام کا غلبہ دکھائے۔ امیر المومنین
ممدوح در دنیا نماندند، ماہم اگر ترک دنیا کنیم چہ	زندہ نہ رہے، مجھے بھی موت آجائے تو کیا
غم است ؛	غم ہے ؛

وفات غالباً سنہ ۱۲۴۸ھ (سنہ ۱۸۳۳ء) میں وفات پائی۔ آخری وقت میں متعلقین کو جو وصیتیں کیں ان میں سے چند یہ ہیں :

۱۔ توحید پر قائم رہو اور سنت کا اتباع کبھی نہ چھوڑو ؛

۲۔ میرے بعد کسی بدعت کا ارتکاب نہ ہونے پائے، ورنہ قیامت کے دن تم سے مواخذہ کروں گا؛

۳۔ میرے مرنے پر نوحہ کیا جائے، نہ سوم یا کوئی دوسری رسم منائی جائے ؛

سید جعفر علی مولوی سید قطب علی کے فرزند اکبر تھے۔ سنہ ۱۲۱۱ھ میں بمقام [illegible] پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں پائی، پھر لکھنؤ جا کر علوم کی تکمیل کی۔ والد ماجد اور چھوٹا بھائی سید حسن علی تکیہ شریفہ جا کر بیعت کر چکے تھے۔ سید جعفر علی بوجہ علالت نہ جا سکے۔ کچھ مدت بعد سید بغرض جہاد رائے بریلی سے سرحد چلے گئے اور سید جعفر علی کو شرف لقا بھی حاصل نہ ہوا ؛

باپ اور بھائی کی صحبت میں ان پر بھی سید صاحب کا رنگ چڑھ گیا۔ اس کے بعد دونوں بھائیوں میں سبقت بالخیر کے لیے کشاکش شروع ہوگئی۔ والدین کبیر السن تھے۔ دو بھائیوں کے سوا گھر میں کوئی نہ تھا جو ان کی خبرگیری کرتا۔ بڑے کا اصرار تھا کہ چھوٹا گھر پر خبرگیری کے لیے موجود رہے اور میں جہاد کے لیے جاؤں۔ چھوٹا بار بار کہتا تھا کہ بڑے کو والدین کی خدمت میں رہنا چاہیے اور مجھے جہاد کے لیے جانے کی اجازت دی جائے۔ آخر چھوٹے بھائی نے یہ معاملہ آخری فیصلے کی غرض سے بوڑھی والدہ کے سامنے پیش کر دیا۔ اس خدا پرست خاتون نے کہا کہ جو جانا چاہے اسے روکا نہیں جا سکتا۔ جو نہ جائے وہ گناہ گار ہوگا۔ تم دونوں

بھائی آپس میں فیصلہ کرو۔ ہم اپنی عاقبت کیوں خراب کریں؟

قطعی فیصلہ

اس اثنا میں سید جعفر علی کو ایک مقدمے کے سلسلے میں گورکھپور جانا پڑا۔ وہاں سے لوٹے تو ان کے استاد مولوی حمید علی کا خط آیا پڑا تھا کہ نقیر محمد خاں رسالدار کو رد روافض میں بعض رسائل و کتب کی تصحیح کے لیے ایک آدمی کی ضرورت ہے۔ یہ خدمت قبول کر لو۔ لیکن سید جعفر علی سید صاحب کی خدمت میں پہنچنے کا عزم صمیم کر چکے تھے، اس لیے مولوی حمید علی کو معذرت لکھ بھیجی پھر منت سماجت سے چھوٹے بھائی کو خدمتِ والدین کے لیے ٹھہرے رہنے پر راضی کر لیا اور خود جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ گھر میں غلہ بہت تھا، لیکن نقد روپے زیادہ نہ تھے۔

ان کی شادی ہو چکی تھی۔ گویا والدین کے علاوہ عیال داری کی زنجیر بھی ان کے پاؤں میں پڑ چکی تھی، لیکن سلطانِ فرض کے حکم کی بجا آوری میں انھوں نے علائق کے تمام رشتوں سے بے تکلف انقطاع اختیار کر لیا۔ بھائی کے سوا کسی کو ان کے حقیقی ارادے کا علم نہ تھا۔

روانگی

گورکھپور میں مقدمے کی پیروی کے لیے انھیں وقتاً فوقتاً جانا پڑتا تھا۔ دل میں طے کر لیا کہ وہیں سے منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہو جائیں۔ گھر میں صرف ایک گھوڑا تھا۔ اسی پر حسبِ ضرورت والد یا دونوں بھائی سوار ہوتے تھے۔ چنانچہ بظاہر مقدمے کی پیروی کے لیے گورکھپور روانہ ہوئے۔ گھوڑے کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازم کو ساتھ لے لیا۔ رخصت ہوتے وقت والد ماجد سے عرض کیا کہ دعا فرمائیے: اللہ تعالیٰ مجھے فتح و نصرت سے واپس لائے۔ ساتھیوں نے سمجھا کہ مقدمے میں کامیابی کے لیے دعا کے طلب گار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے دعا کی۔ یوں صاحبِ عزم بیٹا والدین اور گھر بار سے رخصت ہوا اور اس منزلِ دشوار میں اس نے قدم رکھا، جہاں سے زندہ واپس آنے کی امید موہوم تھی۔ بھائی چھ کوس تک ساتھ گیا۔ اپنی بندوق پیش کی۔ سید جعفر علی نے کہا کہ اسے اپنے پاس رکھو، مجھے خدا اور دے دے گا۔ بھائی نے روتے ہوئے کہا کہ جب آپ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جا رہے ہیں تو دنیا کی دولت میرے لیے کیا حقیقت رکھتی ہے؟ سید جعفر علی نے اسے تسلی دی اور وصیت فرمائی کہ والدین کی خدمت میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھنا۔ سید جعفر علی نے اپنے بعض ہم مشرب دوستوں کو پہلے سے اطلاع دے رکھی تھی اور فیصلہ یہ ہوا تھا

کہ تمام دوست مقررہ تاریخ پر ایک خاص جگہ جمع ہو جائیں۔ سید جعفر علی کا بھائی واپس چلا گیا تو ان کے ایک دوست شیخ دارالاب مل گئے اور دوسرے دوستوں کے انتظار میں دونوں نے اکٹھے سفر شروع کیا۔

راہ حق میں پہلا قدم عجیب بات یہ ہے کہ انسان راہ خدا میں قدم اٹھاتا ہے تو اکثر ابتدا ہی میں امتحان کی سختیاں پیش آجاتی ہیں۔ یہ غالباً قدرت کی طرف سے تربیت کا سازوسامان ہوتا ہے۔ سید جعفر علی گھر سے نکلے تھے تو برسات کا موسم تھا۔ دریا اور ندی نالے طغیانی پر تھے۔ اس وجہ سے مرور و عبور سخت مشکل تھا۔ طرفہ یہ کہ سفر کی پہلی ہی رات آشوب چشم کا عارضہ شروع ہو گیا اور اتنا شدید درد ہوا کہ رات بھر ایک لمحہ کے لیے سو نہ سکے۔ رات موضع بیر گنج میں گزاری۔ صبح اٹھے تو گھوڑا نوکر کو دے کر واپس کر دیا تاکہ والد اور بھائی کو تکلیف نہ ہو۔ خود گورکھپور پہنچ گئے۔

دعوت و ایثار اتفاق سے اسی زمانے میں انگریزوں نے ایک رسالے کو چھ مہینے کی تنخواہ انعام میں دے کر توڑ دیا تھا اور اس کے سوار نوکری سے فارغ ہو کر گورکھپور میں جمع تھے۔ ان میں سے بعض سید جعفر علی کے دوست تھے۔ سید موصوف نے معاً انھیں راہ حق کی دعوت دی اور کہا کہ تم لوگ دنیا کی نوکری سے الگ ہو گئے ہو۔ آؤ اب گھوڑے اور ہتھیار لے کر اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

ان میں سے نجیب خاں نام ایک شخص کے پاس چار گھوڑے تھے۔ اس نے ایک گھوڑا فی سبیل اللہ سید جعفر علی کے حوالے کر دیا۔ دو گھوڑے بیچ کر ان کی رقم ضروری مصارف کے لیے گھر میں دے دی۔ چوتھا گھوڑا اپنی سواری کے لیے رکھ لیا اور بولا کہ چند ضروری کام کر کے میں بھی روانہ ہو جاؤں گا۔ اگر آپ پہلے پہنچے تو سید صاحب کو میرا سلام پہنچا دینا۔ اگر میں پہلے پہنچا تو آپ کا سلام پہنچا دوں گا۔

سید جعفر علی نے اپنی کچھ چیزیں پانچ روپے میں فروخت کیں۔ ایک اور شخص رفاقت کے لیے تیار ہو گیا لیکن بولا کہ میرے پاس سواری نہیں اور پیدل چل نہیں سکتا۔ سید جعفر علی نے نجیب خاں کا دیا ہوا گھوڑا اس کے حوالے کر دیا۔

سترھواں باب

سیّد جعفر علی اور سفر کی صعوبتیں

غازی پور اور جون پور: ایک چھوٹی سی کشتی میں دریا عبور کر کے گوپال پور پہنچے، جہاں تمام دوستوں کو جمع ہونا تھا اور پانچ روز وہاں ٹھہرے رہے۔ پھر دریائے گنگا سے پار اتر کر مبارک پور ہوتے ہوئے گھوسی آ گئے۔ وہاں سے قریب ہی سید جعفر علی کے خالو تھانیداری کے عہدے پر مامور تھے۔ انھیں بھی خبر نہ ہونے دی کہ مبادا رکاوٹ پیدا کریں۔ بہادر گنج اور قاسم آباد کے راستے غازی پور پہنچ کر شیخ فرزند علی کی مسجد میں مقیم ہوئے، جو سید صاحب کے خلیفہ تھے۔ شیخ صاحب انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دو ہفتے اپنے پاس ٹھہرائے رکھا۔ روانگی کے وقت ایک سو روپے نقد دیے، ایک ٹٹو پیش کیا، نیز چودہ آدمیوں کے لیے ہتھیاروں کا انتظام فرما دیا۔ شیخ صاحب کے بیٹے شیخ محمد علی پہلے سے سید صاحب کے ساتھ تھے، ان کے لیے کپڑے، بانات کی ایک چادر اور ایک خط دیا۔

غازی پور سے بھیتری اور کرکت کے راستے جون پور پہنچے۔ شہر سے باہر تھانیدار نے روک لیا اور پوچھا کہ ہتھیار لگا کر جا رہے ہو، شناخت کے بغیر جانے نہ دوں گا۔ سید جعفر علی نے کہا کہ شہر میں چل کر شیخ کرامت علی کی ضمانت دے دیں گے۔ شیخ کا نام سن کر تھانیدار نے اجازت دے دی۔ وہ شیخ کرامت علی کی مسجد میں ٹھہرے۔ شیخ نے موضع منڈیاہو سے ایک اونٹ منگوا کر قافلۂ مجاہدین کی نذر کر دیا۔ وہاں دو دن رہ کر غازی پور گئے۔ اس اثنا میں سید جعفر علی کے والد کو اطلاع مل چکی تھی کہ ان کا بیٹا گھر سے نکل گیا ہے، جہاد کے لیے سید صاحب کے پاس جا رہا ہے۔ وہ اطلاع ملتے ہی دوسرے عزیزوں کو ساتھ لے کر پیچھے نکل کھڑے ہوئے اور جون پور میں ان سے آ ملے۔ اصرار کیا کہ واپس چلو، پھر خود بھی سید صاحب کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن سید جعفر علی نے یہ تجویز منظور نہ کی اور کہا کہ آپ کا تنہا اس وقت جانا مناسب ہوگا جب

امیر المومنین مع قبائل طلب فرمائیں گے۔ غرض سید صاحب موصوف نے منشی صاحب سے والد اور دوسرے عزیزوں کو راضی کر کے واپس بھیج دیا۔

شیخ غلام علی الٰہ آبادی جون پور سے یہ قافلہ مچھلی شہر اور مئو ہوتا ہوا مہرواڑا پہنچا جو شیخ غلام علی الٰہ آبادی کا وطن تھا۔ شیخ نے معمول کے مطابق خاطر داری میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ رخصت کے وقت مجاہدین کی خدمت میں مختلف قسم کے ہتھیار مثلاً تلواریں، کٹاریں اور ڈھالیں، ان کے علاوہ جاجم، دیگچے، طباق پیالے وغیرہ پیش کیے۔ نقد رقم بھی دی ہو گی جس کی مقدار معلوم نہ ہو سکی۔ شیخ صاحب ان دنوں سخت پریشانیوں میں مبتلا تھے۔ مہاراجہ بنارس نے ان پر گراں قدر رقم بطور تاوان ڈال دی تھی اور ان کا بڑا لڑکا اس عہد کے نوجوان امیروں کی طرح آزادانہ روش اختیار کر چکا تھا۔

گھتی، کان پور اور قنوج مہرواڑا سے یہ لوگ گھتی پہنچے، جہاں امجد خاں سے ملاقات ہوئی۔ وہ مستورات کے قافلے کو ٹونک پہنچا کر واپس آئے تھے۔ سید صاحب کے عزیز سید محمد ظاہر بھی تکیہ شریف سے امجد خاں کی ملاقات کے لیے آئے ہوئے تھے۔ خان نے اپنا بیٹا مجاہدین کی خدمت میں پیش کر دیا۔ بالائی کشتی کی درستی کے لیے ایک دن گھتی میں گزار کر یہ لوگ کڑا اور فتح پور ہوتے ہوئے کان پور میں وارد ہوئے۔ وہاں چنگی کے دو مسلمان کارکنوں نے قافلے کا سامان روک لیا۔ ایک ہندو کارکن مصری لال نے جو سید جعفر علی کے چچا سید احمد علی کا دوست تھا، سامان چھڑا دیا۔

کان پور میں یہ قافلہ چار روز مقیم رہا۔ سید جعفر علی ہر اس شخص کو ساتھ لے لیتے تھے، جو جہاد کے لیے آمادگی ظاہر کرتا تھا۔ کان پور میں الٰہی بخش نام ایک شخص ساتھ ہو گیا۔ اس نے اہل قافلہ کو بڑی پریشانیوں میں مبتلا کیا۔ یہ لوگ قنوج پہنچ کر سید اولاد حسین سے ملے، جو اسی زمانے میں سرہند سے واپس آئے تھے۔ میر احمد علی رئیس قنوج نے سید صاحب کے لیے ایک نہایت عمدہ تلوار سید جعفر علی کے حوالے کی۔ ان سے الٰہی بخش کے حالات پوچھے تو جواب ملا کہ یہ شخص مفسد ہے اور ضرور کوئی فتنہ برپا کرے گا۔ سید جعفر علی نیک طبعی کے باعث گھوڑا اس کے حوالے کر چکے تھے۔ سردی کا موسم شروع ہو گیا تھا، اس لیے قنوج میں مولوی صاحب نے اپنے ساتھیوں کے لیے لحاف بنوائے۔ قنوج سے مین پوری ہوتے ہوئے محمود گنج پہنچے۔ سید جعفر علی نے

لکھا ہے کہ بہت سے ساتھی بیمار ہو گئے تھے اور ان میں سے بعض ساتھ نہ چل سکتے تھے۔ ایک بیمار کو قنوج میں چھوڑنا۔ دوسرے کو پالکی پر سوار کرا کے مین پوری پہنچایا۔ جن بیماروں کو ساتھ لے لیا تھا، وہ بھی زیادہ دور چلنے سے معذور تھے۔ سید جعفر علی نے ایک شخص کو یہ پیغام دے کر مین پوری بھیج دیا کہ وہاں کے بیمار کی پوری دیکھ بھال کی جائے۔ خود پالکی لے کر لوٹے کہ قنوج والے بیمار کو سوار کرا لائیں۔ عین اس موقع پر الٰہی بخش نے آنکھیں پھیر لیں اور بولا: تمہارے ساتھی بہت برے ہیں۔ میں الگ ہوتا ہوں۔ میری آرزو تھی کہ ایک ہزار کا قافلہ تیار کرتا۔ ان لوگوں کے ساتھ گھوڑے، اونٹ اور قیمتی اسلحہ ہوتے لیکن تمہیں منظور نہیں۔ سید جعفر علی کے رفیقوں میں سے منصور خاں بہت قوی تھا۔ اس نے کہا کہ گرچہ بیمار ہوں، لیکن اسے پکڑ کر ہڈیاں توڑ ڈالوں۔ سید صاحب نے ہاتھا پائی سے روک دیا، لیکن رفیقوں نے کہہ دیا: یہ ہمارا ساتھی نہیں، خواہ مخواہ ہمیں اپنا بتاتا ہے۔

غرض سید صاحب رفیقوں کی بیماری کے باعث آہستہ آہستہ چلے۔ الٰہی بخش گھوڑا دوڑاتا ہوا آگے نکل گیا اور محمود گنج کی مسجد میں جا اترا۔ اس نے لوگوں کو بتایا کہ میں قافلۂ مجاہدین کا سالار ہوں۔ پیچھے ایک مولوی آرہا ہے۔ اس کے ساتھی بیمار ہیں۔ انھیں مسجد میں نہ ٹھہرنے دینا۔ چنانچہ سید جعفر علی بیماروں کے ساتھ محمود گنج پہنچے تو لوگوں نے مسجد میں اترنے سے روک دیا اور انھیں چھ آنے یومیہ کرائے پر سرائے میں حجرے لینے پڑے۔

آزمائش در آزمائش

سید جعفر علی کا گھوڑا اور میر احمد علی رئیس قنوج کی دی ہوئی تلوار الٰہی بخش کے پاس تھی۔ اب مولوی صاحب نے تلوار مانگی تو اس نے جھگڑا شروع کر دیا۔ آخر میں پھر بولا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاتا۔ میں چاہتا تھا کہ ہزار بارہ سو جوانوں کا قافلہ تیار ہو جائے۔ سب کے پاس ہتھیار، گھوڑے اور اونٹ ہوں، لیکن تمہیں یہ منظور نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے کوئی ہتھیار دے دو تو چلا جاؤں۔ دو تلواریں تھیں۔ ان میں سے ایک اس کے حوالے کر دی۔ وہ بھری ہوئی بندوق کا منہ سید جعفر علی کی طرف کر کے لڑنے کے لیے تیار ہو گیا۔ بڑی مشکل سے یہ مصیبت ختم ہوئی۔

ساتھیوں کی بیماری کم پریشانی کا باعث نہ تھی۔ محمود گنج پہنچ کر رکن الدین کو سرسام ہو گیا۔ سید جعفر علی رات دن اس کی خدمت کرتے تھے۔ ایک رات وہ اچانک اٹھ کر باہر نکل گیا۔ بہتیرا تلاش کیا۔ کچھ پتہ نہ چلا۔

شمس الدین : تم حنفی ہو یا شافعی ؟

مولوی صاحب : آپ کو اس سے کیا غرض، مسئلے کی صحیح صورت میں نے عرض کر دی ۔

شمس الدین : میرے مکان سے نکل جاؤ ۔

مولوی صاحب : بہتر، میں نے تو خیر خواہی سے ایک شرعی بات بتائی تھی ۔

غرض مولوی صاحب لوٹ گئے ۔ دوسرے روز مسجد میں دوبارہ ملاقات ہوئی اور شمس الدین مولوی صاحب کے ایک ساتھی منصور خاں کی طرف متوجہ ہوا، جو بہت وجیہ تھا۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب سے بات کیجیے۔ اس وقت شمس الدین نے اپنے سابقہ طرز عمل پر معذرت کی اور غور و مشورہ کے بعد تجویز کیا کہ پٹیالہ، مالیر کوٹلہ، جگراؤں اور ممدوٹ کا راستہ اختیار کیا جائے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے اپنے قافلے کے ساتھ یہی راستہ اختیار کیا ۔

اٹھارھواں باب

پٹیالہ سے سرحد

پٹیالہ اور ممدوٹ: ریاست پٹیالہ کے ایک گاؤں میں قافلے کے ایک آدمی نے بندوق سے مور کا شکار کیا۔ گاؤں کے لوگ لاٹھیاں لے کر نکل آئے اور بڑا ہنگامہ برپا ہوا۔ اہل قافلہ کو علم نہ تھا کہ ریاست کے حدود میں مور کا شکار ممنوع ہے۔ بڑی مشکل سے یہ مصیبت ختم ہوئی۔ ممدوٹ پہنچے تو وہاں نواب قطب الدین اس زمانے میں رئیس تھا۔ اس کے بھائی شمس الدین کی معرفت درخواست کی گئی کہ دریائے ستلج سے پار اترنے کا بندوبست کر دیجیے۔ تیسرے روز نواب سے ملاقات ہوئی تو اس نے صاف جواب دے دیا اور بولا کہ اس طرح میں سکھوں کی سرکار میں بدنام ہو جاؤں گا۔ ناچار سید جعفر علی نے ممدوٹ سے بہاول پور کا قصد کر لیا۔ راستے میں تبارک اللہ نام ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی جو رئیس ممدوٹ سے ناراض ہو کر ریاست بہاول پور کے حدود میں جا بیٹھا تھا۔

بہاول پور: بہاول پور میں مولانا عبدالحی کے ایک شاگرد مولانا محمد کامل تھے جنھیں اس بنا پر مقتدیوں سے ملاقات کی ممانعت کر دی گئی تھی کہ حیات انبیاء کے مسئلے پر وہ عام بہاول پوری علما سے مختلف رائے رکھتے اور کہتے تھے کہ انبیاء اور علما یقیناً عنداللہ زندہ ہیں لیکن ان کے لیے حیات دنیا ثابت کرنا محال ہے۔ سید جعفر علی کو اتفاقیہ ان سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ نیز ان کے بیٹے محمد اکمل سے ملاقات کی۔ انھیں کے مشورے سے یہ قرار پایا کہ احمد پور شرقیہ ہوتے ہوئے تونسہ جانا چاہیے۔ احمد پور شرقیہ میں امین شاہ اور امام شاہ سے بھی ملاقات کی تاکید کی۔ سید جعفر علی نے لکھا ہے کہ بہاول پور میں ہر جگہ گیارھویں شریف اور دوسرے محدثات کا دور دورہ تھا، لیکن تمام پڑھے لکھے آدمی محمد کامل کا نام احترام سے لیتے تھے۔ بہاول پور سے تین منزل پر خیر پور میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جن کی داڑھی اور مونچھیں وزیر ریاست نے اس جرم

شدہ وہی تھیں کردہ اتباع سنت پر زور دیتے تھے ۔

تونسہ : غرض قافلے نے بھکر پہنچ کر دریا عبور کیا ۔ ڈیرہ غازی خاں میں شیخ نور علی جونپوری سے ملاقات ہوئی ۔ وہاں سے براہ بادیہ تونسہ پہنچے اور وقت کے قطب الارشاد شیخ خواجہ سلیمان تونسوی سے ملاقات کی ۔ سید جعفر علی لکھتے ہیں : خواجہ صاحب فرش پر بیٹھے تھے ۔ چاروں طرف لوگوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا ۔ میں نے عرض کیا کہ کوئی آدمی رہبر کے ذریعے سے آگے پہنچا دیجیے ۔ انھوں نے فرمایا کہ یہ ارادہ ٹھیک نہیں ۔ راستہ خطرناک ہے ، سکھوں کی فوج کے آدمی چھاپے مار رہے ہیں اور اپنے ہاتھوں ہلاکت میں پڑنا منع ہے ۔

خواجہ سلیمان سے گفتگو ساتھ ہی فرمایا : لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ ۔ میں نے عرض کیا کہ اس آیت کا مضمون میں خوب سمجھتا ہوں ، یہ راہ خدا میں خرچ کرنے کے متعلق نازل ہوئی ہے ۔ اس پر وہ خاموش ہو گئے ۔ میں نے رہبر کی درخواست کی تو خواجہ صاحب نے فرمایا :

اچھا نایاب ہے ۔ لوگ پریشان حال ہیں ۔ دشمنوں کے ہاتھ سے بچ نہیں سکتے ۔ نہ آگے جانے کی صورت ہے نہ پیچھے ہٹنے کی ، ادھر ٹھہرنے میں محفوظ رہنے کی کوئی امید ہے ۔

سید جعفر علی : آپ کیا کریں گے ؟

خواجہ صاحب : میں پہاڑوں میں چلا جاؤں گا ۔

سید جعفر علی : ہمیں بھی ساتھ لے لیجیے ۔

خواجہ صاحب : بلوچ تمھیں مار ڈالیں گے ۔

سید جعفر علی : جنگل کا راستہ بتا دیجیے ۔

خواجہ صاحب : جنگل میں پانی نہ ملے گا اور ہلاک ہو جاؤ گے ۔

پھر فرمایا : بہتر یہ ہے کہ بہاول خاں رئیس بہاولپور کی نوکری کر لو ۔ راستہ صاف ہو جائے گا تو آگے چلے جانا ۔ ساتھیوں میں سے نوروز بیگ اس کے لیے تیار ہو گیا ۔ لیکن سید جعفر علی نے صاف صاف عرض کر دیا کہ ہم لوگ نوکری کے لیے نہیں ، جہاد فی سبیل اللہ کے لیے آئے ہیں ۔ ہمیں راستہ بتا دیجیے اور رہبر دے دیجیے ۔ ہم رات کے وقت نکل جائیں گے ۔ فرمایا : اس کا انتظام نہیں ہو سکتا ۔

رہبر اور سامانِ سفر مایوسی کے بعد سید جعفر علی نے بطورِ خود آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔ تونسہ سے پانچ کوس آگے موضع کسرانی میں پہنچے تو ایک سید سے ملاقات ہوئی۔ وہ قافلے کو اپنی مسجد میں لے گیا۔ ماحضر تواضع کی۔ پھر دو بلوچوں کو بلایا۔ اپنی داڑھی ان کے ہاتھ میں دے کر سید جعفر علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا: یہ سید ہے، اسے اور اس کے ساتھیوں کو بحفاظت منزلِ مقصود پر پہنچانے کا حلف اٹھاؤ۔ گویا اس سید کی مہربانی سے قدم آگے بڑھانے کا انتظام ہوا۔

رہبروں کا انتظام ہو گیا تو سفر کی تیاری شروع کر دی۔ قافلے میں روزانہ سولہ سیر آٹا خرچ ہوتا تھا۔ سید جعفر علی نے بیس سیر آٹا خریدنے کے لیے رقم آدمی کے حوالے کر دی۔ اس لیے کہ دو بلوچ رہبروں کے اضافے کے باعث خرچ بڑھ گیا تھا۔ وہاں اتفاقیہ نزاع کی صورت پیدا ہو گئی اور پانچ سیر سے زیادہ آٹا نہ مل سکا۔ سید جعفر علی زادِ راہ سے بالکل بے پروا ہو کر چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ ایک گھوڑے اور ایک یابو پر سامان رکھا۔ ایک گھوڑا اور ساتھ تھا۔ لکھتے ہیں: میں نے نیت کر لی تھی کہ ساتھیوں میں جو تھک جائے گا اسے سوار کرا دوں گا۔ خود پیدل چلوں گا۔

کمالِ ہمت و عزیمت اب راہِ حق کے ان مسافروں کی حالت کا تصور کیجیے۔ کھانے پینے کو کوئی چیز ساتھ نہیں۔ منزل نہایت کٹھن، راستہ کوہستانی یا صحرائی جہاں دُور دُور تک کھانے پینے کو کچھ نہ ملتا تھا۔ ہر وقت سکھوں کے حملے کا خطرہ تھا: جن کے جیش گھاس چارے کے لیے مسلسل ان حصوں میں گردش کرتے رہتے تھے۔ سید جعفر علی بار بار اپنے ساتھیوں سے کہتے کہ بھائیو! ہمت کرو۔ ہم آٹھ آدمی ہیں اور مسلح ہیں۔ سکھوں سے مڈبھیڑ ہو جائے گی تو انھیں مار کر گھوڑے اور دولت لے لیں گے۔ پھر دو دو منزلیں ایک ایک دن میں طے کر کے امیر المومنین کے پاس پہنچ جائیں گے۔

سفر کی صعوبتیں پہلے تو مطلع ابر آلود تھا۔ ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ ظہر، عصر اور مغرب کی نمازیں راستے میں ادا کیں۔ پھر بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا۔ ایک جگہ بیریوں کے درخت تھے۔ وہاں سے پکے ہوئے بیر چنے۔ کچھ کھا لیے اور کچھ ساتھ لے لیے۔ رات باقی تھی کہ ایک گاؤں میں پہنچے، جسے سکھ جلا کر راکھ بنا چکے تھے۔ مسجد کے صحن میں ایک بے آب حوض پر ٹھہرے۔ تیمم سے صبح کی نماز ادا کی۔ رہبروں نے

دھر اُدھر بکھر کر دو تین گھڑیوں سے تھوڑا سا پانی لیا، کھانا تیار کیا اور کھا کر تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ اسی دوران میں بارش شروع ہو گئی۔ برتنوں میں بارش کا جو پانی جمع ہوا تھا، وہ ساتھ لے لیا، اور مزید بارہ کوس کی مسافت طے کر کے ظہر کے وقت ایک دریا[1] پر پہنچے۔

وہاں سے رہبر ایک پہاڑی راستہ بتا کر واپس چلے گئے۔ مجاہدین نے کچھ منزلیں طے کر لیں تو راستے کا نشان گم ہو گیا۔ ایک جگہ دیکھا کہ کوئی شخص جانور چرا رہا ہے۔ راستہ پوچھنے کے لیے اس کی طرف چلے تو وہ اس خیال سے ریوڑ چھوڑ کر بھاگ گیا کہ یہ لٹیرے ہیں۔ پھر ایک گائے کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے اور ایک آبادی میں پہنچے۔

اس سلسلے میں سید جعفر علی نے اپنے سفرنامے میں جن مقامات کا ذکر کیا ہے، یہ ہیں: اوچھوکی، مروت، چوڑواں[2]، درہ بند، لونی، کوٹلہ مرید خاں، عیسٰی خیل، کالاباغ۔ اوچھوکی سے سولہ سیر آٹا، بارہ سیر دال اور گھاس خریدنی چاہی۔ وہاں کے ملا نے گھاس بھی مہیا کر دی اور کھانا بھی کھلایا، نیز نصیحت کی کہ آگے رہزن ملیں گے۔ ان سے کہنا کہ ہم سید ہیں۔ چنانچہ رستے میں کئی جگہ مشتبہ آدمیوں سے سابقہ پڑا۔ ایک رات چوڑواں میں بسر کی۔ درہ بند میں ایک ملا نے بڑی تواضع کی۔ اس مقام اور کوٹلہ مرید خاں کے درمیان لونی کے علاوہ دو منزلوں کا ذکر آیا ہے۔ لونی سے جو رہبر ساتھ لیا تھا، اس کا نام ابوبکر صدیق تھا۔ اس سے اگلے دو مقاموں کے رہبروں کے نام بالترتیب عمر خطاب اور عثمان غنی تھے۔ عیسٰی خیل کے رئیس احمد خاں نے بڑی خاطر تواضع کی۔ ایک رات راستے میں گزار کر کالاباغ پہنچ گئے، جہاں کا نواب اللہ یار خاں سکھوں کی تابعیت قبول کر چکا تھا۔ یہیں دس اور اصحاب ملے، جو سید صاحب کے پاس جا رہے تھے: وزیر خاں باغپتی، غلام رسول خاں مقتدی، مولا بخش گولہ انداز ناگپوری، احمد خاں قاصد، علیم الدین بنگالی، برادر زادہ مولوی امام الدین، نیز بارہ اور اصحاب۔

---

[1] تونسہ سے ڈیرہ اسمٰعیل خاں اور اس کے بعد عیسٰی خیل کی طرف جائیں تو چھوٹی بڑی کئی ندیاں ہیں جو کوہستان سلیمان سے نکل کر دریائے سندھ میں ملتی ہیں۔ جس دریا کا ذکر ہے اس سے مراد غالباً "وہوا" ہے۔ اس سے آگے بڑا دریا لونی ہے جو ڈیرہ اسمٰعیل خان کے قریب ہے۔ [2] چوڑواں سے مراد غالباً چھنڈواں ہے جو کوہ سلیمان کے نزدیک ہے۔

منزلِ مقصود | سید جعفر علی اور وزیر خاں پانی پتی نے نواب سے ملاقات کی تاکہ کسی تیز رہبر کا بندوبست ہو جائے۔ اس کی مجلس میں سکھوں کی کثرت تھی، لہٰذا یہ مدعا بیان کیے بغیر لوٹ آئے۔ تخلیے میں ملاقات کر کے رہبر کا انتظام کرا لیا۔ اس نے ایک دو کوس چل کر اجرت مانگی۔ چونکہ وہ ہر قدم پر شر پیدا کرتا تھا، اس لیے اجرت دے کر اسے واپس کر دیا۔

آگے صرف دو منزلوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔ ایک ٹوڑہ جہاں سید جعفر علی نے دو گھوڑوں کے نعل بندھوائے تھے، دوسرا ستر غی۔ لنڈے دریا کو عبور کر کے تئیس آدمیوں کا یہ قافلہ ۹ رمضان المبارک (۲۴ مارچ ۱۸۳۱ء) کو پنجتار پہنچا۔ سید صاحب اس زمانے میں مقامِ امب تشریف فرما تھے۔ ان کے بھانجے سید احمد علی کسی کام کے سلسلے میں پنجتار آئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات کی۔ ایک روز وہاں ٹھہرے، ایک رات گنڈف میں گزاری۔ ۱۰ رمضان کو عصر کے وقت ستھانہ پہنچے۔ سید اکبر شاہ نے ٹھہرایا۔ جعفر علی نے عرض کیا کہ اب امیر المومنین سے ملنے کا اشتیاق ہے۔ عشرہ میں حافظ عبداللطیف اور مولانا مظہر علی سے بھی ملے۔ [illegible] امب گئے۔ سید صاحب کو آمد کی اطلاع پہلے مل چکی تھی اور وہ دو مرتبہ استقبال کی غرض سے باہر گردِ امب چلے گئے تھے۔ ایک آدمی یہ کہہ کر بھیجا کہ راستے میں ملا کر جلد بندوق سر کر دو تاکہ آمد کا حال معلوم ہو جائے۔ سید صاحب خود گھوڑے پر سوار ہو کر پچاس سواروں کے ساتھ آم کے درخت تک آئے۔ بآوازِ بلند السلام علیکم کہا، پھر مجاہدین کو دو صفیں بنا لینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ جب میں کہوں بسم اللہ اللہ اکبر، سب بندوقیں سر کریں۔ سید جعفر علی کے قافلے سے کہا کہ آہستہ آئیں۔ خود تیز چلے گئے، اس لیے کہ افطار کا وقت قریب تھا۔ راستے میں افطار کا سامان آگیا۔ دال، نوتنگ میں نمک مرچ ڈال کر لائے۔ افطار کے بعد جلد از جلد مسجد میں پہنچ کر سید صاحب کی امامت میں نماز ادا کی۔

ذکرِ موعظت | یہ حالات میں نے اس خیال سے تفصیلاً بیان کیے کہ سید صاحب کی شانِ مردم گری کا ایک حد تک اندازہ ہو جائے۔ سید جعفر علی نے سید صاحب کو دیکھا نہ تھا اور براہِ راست ان سے بیعت بھی نہ کی تھی۔ صرف اپنے والد اور بھائی کے واسطے سے کسبِ فیض کیا تھا، لیکن غور فرمائیے کہ اس بالواسطہ فیض نے بھی انھیں عزیمت کا کیسا عجیب و غریب پیکر بنا دیا۔ ذرا تصور کیجیے کہ کہاں گورکھپور ہے اور کہاں

پہنچنا۔ راستہ سراسر صعوبتوں سے لبریز۔ قدم قدم پر ندیاں اور دریا یا صحرا اور پہاڑ۔ سواریاں مفقود۔ ہر جگہ جان کا خطرہ۔ اکثر مقامات پر لوگ غیر ہمدرد جو معاون بننے کے بجائے مزاحم ہوتے رہے اور یہ لوگ نوکری یا تجارت کے لیے نہ نکلے تھے کہ شدائد و صعب کی برداشت تحصیل زر کا ایک لازمہ سمجھی جاتی۔ وہ راحت بھری زندگیاں چھوڑ کر ایک بلند اسلامی نصب العین کی تکمیل اور ثواب اخروی کی تحصیل کے لیے نکلے تھے۔ آج کتنے مسلمان ہیں جو مال کی طرح خدا کی راہ میں صرف خدا کی خوشنودی کے لیے ایسے چند دن بھی بسر کر سکیں، جیسے سید جعفر علی اور ان کے ساتھیوں نے کم و بیش دس مہینے بسر کیے۔

کاروبارِ جہاد سید جعفر علی نقوی تقریباً ایک سال مصروف جہاد رہے۔ پنجتار یا بالاکوٹ کا واقعہ پیش آ گیا۔ ان کی تحریر بہت اچھی تھی اس لیے انھیں منشی خانے میں لے لیا گیا تھا یعنی وہ کاروبار جہاد کے علاوہ منشی گری کا کام بھی انجام دیتے تھے۔ اس سلسلے میں بعض واقعات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً:

۱ - ایک موقع پر شیخ بلند بخت دیوبندی کو ایک معتمد علیہ آدمی کی ضرورت پڑی جسے پائندہ خان تنولی کی زنبورکیں لانے کے لیے بھیجنا تھا۔ وہ شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری کی تلاش میں آئے جو دن بھر پھرتے پھراتے واپس آ کر سو گئے تھے۔ سید جعفر علی خود اس کام کے لیے تیار ہو گئے۔ راتوں رات اسب سے پنجتار پانی پہنچے۔ عبور دریا کے بعد اس مقام پر گئے، جہاں زنبورکیں پڑی تھیں۔ چار سلامت مل گئیں۔ پانچویں ایک گاؤں میں زیر مرمت تھی۔ سید جعفر علی نے پانچوں بحفاظت اونٹوں پہ بار کرائیں اور سکھوں کی چوکی کے پاس سے گزرتے ہوئے انھیں لے آئے۔ اگرچہ مشقت کے باعث بخار آ گیا تھا لیکن جب تک زنبورکیں منزل مقصود پر نہ پہنچا لیں ایک لمحے کے لیے بھی آرام نہ کیا۔

۲ - وہ شاہ اسمٰعیل کے ساتھ پنجتار سے بالاکوٹ جا رہے تھے۔ برف باری کا زمانہ تھا۔ پہاڑ کی چڑھائی پر سردی کی شدت کے باعث بے بس ہو گئے۔ پیسے، ہتھیار اور دوسری ضروری چیزیں ایک شخص کے حوالے کر دیں کہ اگر میں مر جاؤں تو یہ چیزیں بیت المال میں دے دینا۔ پھر ایک گوجر سے کہا کہ میری دستار لے لو اور کسی طرح مجھے گاؤں پہنچا دو۔ صرف دستار کی پیش کش اس لیے کی کہ جو سامان

وہ گھر سے لاسکے تھے، اس میں سے صرف دستار رہ گئی تھی۔ باقی کپڑے بیت المال کے تھے۔ وہاں
کی شان واللہ اس درجہ کی مدد اور دیانت تھی کہ بیت المال کی کوئی چیز ذاتی کام کے معاوضے میں کسی کو دیں۔
غرض انھیں چارپائی پر ڈال کر گاؤں پہنچا دیا گیا اور کئی روز کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوئے۔
بالاکوٹ کے میدان میں وہ سید صاحب سے قریب تھے۔ جب فوج میں یہ مشہور ہوئی کہ سید صاحب کو گوجر پہاڑ
میں لے گئے ہیں تو وہ دوسرے مجاہدین کے ساتھ سید جعفر علی کی پہاڑ پر پہنچ گئے۔ پھر ناصر خاں جیسے گراہی کی
معیت میں شملئی پہنچے جہاں سید صاحب کی اہلیہ اور دوسری مستورات تھیں۔

کا حق کسی نے نہ چھینا تھا۔ ملا شکور نے جواب دیا کہ یہ تو ارفع و اعلیٰ مرتبہ ہے، لیکن حق دار کا حق دلانا بھی نیکی کا کام ہے۔

پھر زمان شاہ کا وکیل جمال الدین آ کر ساتھ لے گیا۔ ایک حویلی میں ٹھہرایا اور شاہ کی طرف سے کھانا مقرر کر دیا۔ شاہ سے ملاقات ہوئی تو بڑی عزت سے پیش آیا۔ اس کے پاس ایک حکیم موجود تھا۔ پوچھا: یہ عالم آدمی ہیں؟ جواب اثبات میں ملنے پر کھڑے ہو کر مصافحہ کیا اور پاس بٹھایا۔ پھر کہا کہ جب امیر المومنین نے ملک خراسان کو پشاور واپس کر دیا تو ہمیں بہت دکھ ہوا۔ ہم جانتے تھے کہ جن منافقوں نے ہم سے وفا نہ کی وہ امیر المومنین سے کیا وفا کریں گے؟ ہمارا وکیل بھی نہ تھا جو امیر المومنین کو ہماری یاد دلاتا۔

غرض زمان شاہ نے سید جعفر علی کو سات روز اپنے پاس ٹھہرائے رکھا۔ ایک روز طعام خاص بھیجا جس کے ساتھ قسم قسم کے آم تھے۔ جو شخص کھانا لایا تھا اس نے کہا کہ شاہ کے طعام خاص کی تعظیم کے لیے اٹھیے۔ سید جعفر علی نے جواب دیا کہ میں آپ کی تعظیم کرتا ہوں اور یہ کافی ہے۔ طعام کی تعظیم اس کے سوا کچھ نہیں کہ ضائع نہ ہو۔

دہلی لدھیانہ سے سید جعفر علی انبالہ، کرنال، پانی پت ہوتے ہوئے دہلی پہنچے۔ راستے میں محمد سعید خاں رسالدار کنج پوری سے ملاقات ہوئی جو سکھوں کے پاس ملازم تھا اور ملازمت چھوڑ کر سید صاحب کی خدمت میں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ بیس سوار اور پیادے تھے۔ سید صاحب کے حالات سن کر ان کی صحت پر یقین نہ کیا اور سمجھا کہ سید جعفر علی وہاں سے بھاگ آئے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ آپ نے پوچھا تو جو کچھ مجھے معلوم تھا، بتا دیا۔ آپ میرا بیان صحیح نہیں سمجھتے تو خود چھان بین فرما لیجیے۔

دہلی پہنچ کر مسجد نہر میں ٹھہرے جو لاہوری دروازے کے قریب تھی۔ اگرچہ رات کا وقت تھا لیکن لوگوں نے پہچان لیا۔ وہ بہت افسوس کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے کہتے تھے کہ یہ شخص پانچ گھوڑے، ایک اونٹ اور قافلہ لے کر گیا تھا۔ اب اس حال میں واپس آیا ہے۔ کھانا کھلایا۔ خود بخود نئے کپڑے بنوا دیے۔ مولانا سید محمد علی ان دنوں اکبر آبادی مسجد میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا تو آدمی بھیج کر بلوایا۔ تمام حالات سنے، لیکن شہادت کی تصدیق نہ کی۔

بیسواں باب

اللہ داد خاں پٹھان

اللہ داد خاں کا خاندان اس زمانے میں ممتاز حیثیت پر فائز تھا۔ جب ہندوستان میں فوجی نظام جاگیرداری کا عام رواج تھا۔ ان کا سلسلہ نسب یہ ہے۔ اللہ داد خاں بن محمد سعید خاں بن پیردل خاں۔ پیردل خاں کے پوتے بھائی نواب کرامت خاں کو بھی فوجی جاگیر ملی ہوئی تھی۔ یہ دونوں فتح پور ہسوہ میں رہتے تھے۔ ان کی امارت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ جب شاہ زادوں سے نکاح کیا۔ اس کا پورا مہر پانچ لاکھ پانچ سو پانچ اشرفی مقرر کیا۔ وہ شجاع الدولہ والی اودھ سے وابستہ تھے۔ لیکن صرف اس شرط کے ساتھ کہ ضرورت پیش آنے پر لڑائی کے لیے انہیں مع فوج طلب کر لیا جائے۔ ویسے میل جول میں ان کی حیثیت برابری کی تھی۔

مفسدوں کی شکست اتفاق سے بندیل کھنڈ میں سرکشی کا فتنہ اٹھا۔ نواب شجاع الدولہ نے نواب کرامت خاں کو لکھنؤ طلب کیا۔ یہ اپنے چند ہمراہیوں کے ساتھ دیوان خانے میں پہنچے تو شجاع الدولہ اس غرض سے اٹھ گیا کہ کرامت خاں کی تعظیم کے لیے کھڑا نہ ہونا پڑے۔ کرامت خاں نے یہ دیکھا تو خدمت گار کو اشارہ کیا۔ اس نے مصلیٰ بچھا دیا اور یہ تلاوت قرآن میں مصروف ہو گئے۔ آخر شجاع الدولہ آگیا۔ یہ بھی تلاوت سے فارغ ہو کر اٹھے۔ معانقے کے بعد برابر بیٹھ گئے۔ دوسرے سردار بھی آئے ہوئے تھے۔ شجاع الدولہ نے ان سے کہا کہ بندیل کھنڈ میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔ سامنے کشتی میں پان کا بیڑا اور تلوار رکھی ہوئی ہے۔ دیکھیں کون سرکشوں کی خبر لیتا ہے۔ کرامت خاں نے یہ سنتے ہی پان کا بیڑا اٹھا لیا۔ تلوار ان کی کمر میں باندھ دی گئی۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ بندیل کھنڈ پہنچ گئے۔ سرکشوں کو شکست فاش دی۔ ایک بندیلا ان کے کیمپ میں گھس آیا۔ کرامت خاں نے اس کے سر پر تلوار ماری اور وہ دو ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔ حالانکہ اس نے پگڑی کے نیچے سر پر لوہے کے دو تین توے باندھ رکھے تھے۔ ان

کرامت خاں کی شہ زوری کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

شہادت وہ فتح کے شادیانے بجاتے ہوئے واپس آرہے تھے کہ چند بدھیلوں نے جو گھات میں چھپے ہوئے تھے، ایک دم فیر بندوقیں چلادیں۔ گولیوں سے کرامت خاں کا سینہ چھلنی ہوگیا اور وہ گر پڑے۔ ان کا وفادار گھوڑا سرپٹ دوڑ پڑا۔ فتح پور میں نواب کی ڈیوڑھی پر پہنچتے ہی ٹرکا گرا اور ختم ہوگیا۔ نواب کی والدہ زندہ تھیں۔ انھیں تشویش ہوئی کہ خدا جانے میرے بیٹے کا کیا حال ہوا۔ پیغام رکھ دیا کہ اگر وہ میدانِ جنگ سے بھاگا ہے تو دودھ کبھی نہ بخشوں گی۔ دوسرے دن خبر ملی کہ نواب کو دھوکے سے شہید کرڈالا گیا۔ ایسے جوانمرد بیٹے کی شہادت سے جو رنج انھیں پہنچا ہوگا، اس کا اندازہ کون کرسکتا ہے۔ لیکن اس شکرانے میں دو نفل پڑھ کر بیٹھے۔ فیصلہ مردانگی کا حق ادا کیا۔ چنانچہ ان کی میت فتح پور لاکر دفن کی گئی۔ مزار موجود ہے۔ گھوڑے کو بھی وہیں دفنا دیا۔ اس کی قبر بھی اب تک باقی ہے۔

پُردل اور محمد سعید کرامت خاں کے چھوٹے بھائی پُردل خاں اور ان کے بیٹے محمد سعید خاں کے تفصیلی حالات معلوم نہ ہوسکے لیکن کرامت خاں کے حالات سے ظاہر ہے کہ وہ بھی مردانِ رزم و پیکار ہی ہوں گے۔ پُردل خاں کے پوتے اللہ داد خاں کی والدہ شیر زماں خاں کی بیٹی تھیں اور ان کا نام صاحب زمانیہ بیگم یا زمانیہ بائی تھا۔ یہ وہی شیر زماں خاں ہیں، جن کے دادا محمد شہاب خاں نے نواب سعادت علی خاں والیٔ اودھ کے زمانے میں قصبہ گوتنی (گنگا کے کنارے کی چراگاہ) آباد کیا تھا۔ سید صاحب کے واقعہ نگار اسے گنتہ لکھتے ہیں۔ اللہ داد خاں کی ننھیال میں مذہبیت کا یہ عالم تھا کہ خلاف شرع کوئی بات ہوتے نہ پاتی تھی۔ جامع مسجد کے چاروں طرف جو محلّے ہیں ان میں اب تک شادی کے وقت بھی گانا بجانا نہیں ہوتا اور اس پاس سے باجا بجاتے ہوئے گزرنا ممنوع ہے۔

اللہ داد خاں اللہ داد خاں کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شہر فتح پور میں سید خاں سواتی رئیس کی صاحبزادی سے۔ یہ خاتون رسوم و بدعات میں ڈوبی ہوئی تھیں اور اللہ داد خاں کے بار بار کہنے پر بھی انھیں چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ لہٰذا خان موصوف نے مجبوراً ان سے قطع تعلق کرلیا۔ دوسرا نکاح آصف زماں خاں بن شیر زماں خاں رئیس گوتنی کی صاحبزادی عائشہ بی بی سے کیا۔ جن سے خدا نے انھیں دو بیٹے

نے دو بیٹیاں دیں۔ بیٹوں میں سے بڑے محمد اسمٰعیل خاں تھے جن کا نام شاہ اسمٰعیل کے نام پر رکھا گیا،
چھوٹے محمد یوسف۔ اللہ داد خاں کی سسرال کے تعلقات گرتی سے زیادہ لکھنؤ سے تھے، اور ان کے تینوں
برادران نسبتی محمد علی خاں، اشرف علی خاں اور واحد علی خاں بہ سلسلہ ملازمت لکھنؤ ہی میں رہتے تھے۔ لہٰذا
اللہ داد خاں بھی یا تو لکھنؤ میں مقیم رہتے یا اپنے پیر و مرشد کے وطن رائے بریلی آ جاتے تھے۔

تنظیم مجاہدین: یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جہاد میں شریک ہوئے یا نہیں۔ اتنا معلوم ہے کہ انھوں نے اپنی
ساری جائداد مجاہدین کے لیے وقف کر دی تھی۔ صرف سسرالی ترکے کا ایک مکان اور ایک باغ جو گرتی سے
متصل شیر گڑھ میں تھا، باقی رکھا تھا۔ قیاس یہ ہے کہ وہ سید صاحب کی شہادت کے بعد جماعت مجاہدین
از سر نو منظم کرنا چاہتے تھے۔ غدر سے پیشتر ان کا انتقال ہو گیا۔ قبر کا کچھ پتا نہیں کہ کہاں ہے۔ خیال یہ ہے کہ
انتقال کسی سفر میں ہوا جو تنظیم مجاہدین کے سلسلے میں اختیار کیا گیا تھا۔

محمد یوسف خاں: ان کے فرزند اکبر محمد اسمٰعیل خاں کی ولادت اسی سال ہوئی جس سال سید احمد نے
بالاکوٹ میں شہادت پائی۔ ان کے چھوٹے بھائی محمد یوسف خاں گھوڑا افغانستان آیا جایا کرتے تھے۔ یہ سفر
تاجرانہ حیثیت میں ہوتے تھے۔ اسی ضمن میں متعدد حج کیے، بیعت بھی لیتے تھے۔ ان کے پاس ایک غار دار
داڑھی تھی۔ اولاد کوئی نہ چھوڑی۔ ابتدا میں ان کا نکاح خالہ زاد بہن سے ہوا تھا، وہ فوت ہو گئیں تو پھر
نکاح نہ کیا۔ قیاس یہ ہے کہ ان کا تعلق سرحد آزاد کے مرکز مجاہدین سے تھا اور اس سلسلے میں وہ سفر کیا کرتے تھے۔

محمد اسمٰعیل خاں: محمد اسمٰعیل خاں کی عمر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے وقت پچیس چھبیس سال کی ہو گی۔
اودھ کی شاہی فوج میں ملازم تھے۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں انگریزوں کے خلاف نمایاں حصہ لیا۔ اللہ آباد
بادشاہ محبت اللہ کے خاندان کے ایک بزرگ شاہ احمد اللہ فاروقی تھے۔ ان کے ہاتھ پر باقاعدہ جہاد کی بیعت
کی تھی۔ کانپور، لکھنؤ اور دوسرے مقامات پر مجاہدین انقلاب کے سرخیل رہے۔ ان کی سرگرمیوں کے مفصل حالات
معلوم نہ ہو سکے۔ تحریک کی ناکامی کے بعد گرفتاریاں اور سزائیں شروع ہو گئیں۔ محمد اسمٰعیل خاں چھپتے چھپاتے
اردہ پہنچے اور مولوی سید فرید الدین کمشنر کے پاس ٹھہرے، جو عدالت عالیہ کے مشہور وکیل تھے۔ پھر دہلی
لے گئے اور نواب فیض علی خاں رئیس پہاسو (ضلع علی گڑھ) یا حکیم اجمل خاں مرحوم کے والد ماجد حکیم محمود خاں

کی وساطت سے اندور میں پولیس کے افسر بن گئے۔ تیس سال وہیں مقیم رہے۔ پنشن لے کر گوتنی میں مستقل اقامت اختیار کر لی۔ ۱۹۵۰ء میں بمقام الٰہ آباد انتقال ہوا۔

حالاتِ غدر: اہلِ خاندان نے محمد اسمعیل خاں سے ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے متعلق جو باتیں سنیں، ان سے تحریک کی بے نظمی و [illegible] کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً:

۱۔ [illegible] سب اسی پر پڑتے اور [illegible] میں تلواریں نکل آتیں، حالانکہ بہت سے صندوق مجروحوں کے پڑے تھے۔ ان کی طرف کسی کی توجہ نہ ہوتی تھی۔

۲۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہنگامے میں حصہ لینے والوں کی حیثیت ایک غیر منظم بھیڑ کی سی تھی۔ کہیں سے کوئی افواہ آئی تو لوگ ادھر [illegible] بھاگ گئے۔ سرداروں میں سخت رقابت تھی۔ ہر سردار کی کوشش یہ تھی کہ دوسرے کو گرا کر خود آگے بڑھ جائے۔ خصوصاً پوربیوں کی بدلگامی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ بعض اوقات ذرا ذرا سی معمولی فتح کی کامیابیوں نے ان میں اس درجہ غرور پیدا کر دیا تھا کہ کہتے تھے "ہم جس کے سر پر جوتی رکھ دیں گے وہی [illegible] جس کے سر پر جوتا رکھ دیں گے، وہی بادشاہ ہو جائے گا۔"

ایمیلیا کک: محمد اسمعیل خاں کانپور سے ایک انگریز خاتون کو بھی لے آئے تھے۔ اس کا نام ایمیلیا کک[۱] تھی۔ اسے مسلمان کر کے نکاح کر لیا۔ انگریزی تسلط بحال ہو گیا تو وہ خاتون ہر چند کہتی رہی کہ میں تمہیں [illegible] دوں گی، لیکن محمد اسمعیل خاں تیار نہ ہوئے۔ خاتون کو لکھنؤ یا کانپور پہنچا دیا۔ بعد ازاں انگریزوں نے محمد اسمعیل خاں کا پتا لگانے کے لیے بہت جستجو کی، مگر وہ جا چکے تھے اور ان کا سراغ کسی کو نہ مل سکا۔ معلوم نہیں تلاش کے لیے یہ تگ و دو اس غرض سے کی گئی تھی کہ انھیں جاگیر دی جائے یا سزا دینی منظور تھی۔

محمد اجمل خاں: محمد اسمعیل خاں کے تین بیٹے ہوئے: محمد یعقوب خاں، محمد اجمل خاں اور محمد اشرف خاں۔ محمد یعقوب خاں نے ساری عمر خانہ نشینی میں گزار دی۔ محمد اشرف خاں تعلیم پا کر سرکاری ملازمت میں داخل ہو گئے۔

۱؎ EMILIA COOK

محمد اجمل خاں نے ایف۔ اے تک سائنس کی تعلیم پائی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خاں مرحوم سے محمد اسمٰعیل خاں کی گہری دوستی ہو گئی تھی۔ انھیں کے نام پر فرزند کا نام اجمل خاں رکھا۔ انھیں کے مشورے سے سائنس کی تعلیم ولایتی طرز طب اور ڈاکٹری سیکھ سکے۔ محمد اسمٰعیل خاں کے انتقال کے بعد سائنس کو چھوڑ کر علی گڑھ کالج سے ڈگری بی۔ اور فلسفے میں ایم۔ اے۔ ساتھ ساتھ قانون کا امتحان دینے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسی زمانے میں ترک موالات کی تحریک شروع ہو گئی اور محمد اجمل خاں نے ضلع کی خلافت اور کانگرس کا کام سنبھال لیا۔ چند سال بعد عربی کا ایم۔ اے کر لیا اور ایل ایل بی کا امتحان دے کر وکالت شروع کر دی۔ پھر کچھ مدت الٰہ آباد یونیورسٹی میں عربی کے لکچرار رہے۔ ۱۹۲۹ء میں "ڈان" کے نام سے انگریزی کا ایک ہفت روزہ اخبار الٰہ آباد سے جاری کیا۔ ۱۹۳۱ء میں آزادی کی جو تحریک شروع ہوئی اس میں شامل ہو گئے۔ ۱۹۳۲ء میں بہار گئے۔ واپس آکر الٰہ آباد میں فلسطین کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ پھر ایک اہم تصنیف "نزولِ قرآن کریم" کے نام سے شائع کی۔ ۱۹۳۳ء میں حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے انھیں اپنا پرائیویٹ سکریٹری بنا لیا، اب تک انھیں کے ساتھ ہیں۔

تصانیف خان محمد اجمل خاں نے اور کتابیں بھی تصنیف کیں مثلاً سیاسیات، بین منظر اسلام اور سیرت نبوی پر دس جلدیں مرتب کیں۔ بنیادی ہندوستانی پر تقریباً پچاس مضامین اور رسالے شائع کیے جن کی مجموعی مقدار ایک ہزار صفحات سے کم نہ ہوگی۔ متوسط درجے کی ایک سیرت اردو زبان میں مرتب کی جو قرآن کریم پر مبنی ہے۔ یہ شائع ہو چکی ہے۔ اب ایک طرف اس کا ترجمہ مختلف زبانوں میں کرانا چاہتے ہیں دوسری طرف قدرے مبسوط سیرت مرتب کر چکے ہیں جو چھپ چکی ہے۔ پہلی کتاب کی طرح یہ بھی قرآن کریم ہی پر مبنی ہے۔

اکیسواں باب

محمد مقیم، عبدالوہاب، نور احمد

میاں محمد مقیم رام پوری | یہ میاں کریم اللہ کے بھائی تھے جو نواب احمد علی خاں والیٔ رام پور کی جانب سے نیابت کے عہدے پر مامور تھے۔ بیعت امامت جہاد کے بعد سیّد صاحب نے دعوت نامے ہندوستان بھیجے تو جو اصحاب سب سے پہلے مجاہدین کے قافلے لے کر سرحد پہنچے، ان میں میاں محمد مقیم بھی تھے جو چالیس پچاس غازیوں کے ساتھ گئے تھے۔ وہ تمام جوان، شجاع اور جدوجہد پر ہمہ تن تیار تھے۔ نقد روپے کے علاوہ قرابینوں کی بھی خاصی بڑی تعداد ساتھ لے گئے تھے۔

پکھلی میں جہاد | خوانینِ پکھلی کی دعوت پر سیّد صاحب نے غازیوں کی ایک جماعت ہزارہ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا تو میاں محمد مقیم نے سبقت بالخیر کرتے ہوئے عرض کیا کہ میرا قافلہ ضروری ساز و سامان سے لیس ہے۔ تمام مجاہد آزمودہ کار ہیں اور اس مہم پر ہمیں ضرور بھیجا جائے۔ سیّد صاحب نے ان کی درخواست منظور کر لی۔ چالیس پچاس غازی میاں مقیم کے قافلے کے تھے۔ تقریباً ایک سو غازی دوسری جماعتوں سے منتخب کیے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل کو ان کا سالار بنایا۔ مولوی خیرالدین شیرکوٹی اور ملا شاہ سیّد حیدر منگی کو ان کے نائب و مشیر مقرر کر دیا۔

ارسلان خان کی معیت | مولانا شاہ اسمٰعیل پکھلی (ضلع ہزارہ) میں پہنچے تو انھیں محسوس ہوا کہ یہاں جہاد کا اقدام قبل از وقت ہوا ہے، لہٰذا وہ تنظیمات میں مصروف ہو گئے۔ میاں مقیم جوشِ شجاعت میں جنگ کے لیے مضطرب تھے۔ مولانا شاہ اسمٰعیل ضروری تنظیمات کے بغیر آغازِ جنگ کو خلافِ مصلحت سمجھتے تھے۔ اس اثنا میں خانِ باگروڑ کے بھائی ارسلان خان نے اعلان کر دیا کہ میں سکھوں سے لڑنے کے لیے جا رہا ہوں۔ جن لوگوں کو جہاد کا شوق ہو، میرے ساتھ ہو جائیں۔ ان سب کا خرچ میں برداشت کروں گا۔ میاں محمد مقیم اور ان کے ساتھی معاً تیار ہو گئے اور مولانا سے اجازت مانگی۔ اگرچہ اجازت مطابقِ مصلحت نہ تھی لیکن سیّد صاحب

نے روانگی کے وقت میاں محمد مقیم کی دلداری کی تاکید فرمادی تھی اس لیے مولانا نے اجازت دے دی اور میاں سلطان خاں کے ساتھ روانہ ہو گئے ۔

جنگ ڈمگلہ جب مولانا کو معلوم ہوا کہ ڈمگلہ میں سکھوں کی فوج جمع ہو رہی ہے تو خود بھی آگے بڑھ کر شنکیاری کے قریب پہنچ گئے جو بٹگرام سے تین میل پر درہ بھوگڑ منگ کے سامنے ایک مشہور مقام ہے ۔ وہاں سے میاں محمد مقیم کو ایک سو مجاہدین کا سالار بنا کر ڈمگلہ پر شبخون مارنے کا حکم دے دیا ۔ چودہ پندرہ سو ملکی آدمی ان کے ساتھ ہو گئے ۔ مولوی خیر الدین شیرکوٹی کو میاں مقیم کا مشیر و نائب بنا دیا ۔ گولی بارود کے علاوہ بارود بھرے ہوئے نل بھی مجاہدین کو دے دیے ۔ انھیں وقت کے " ہینڈ گرینیڈ " سمجھنا چاہیے ۔ چونکہ سکھ لشکر نے اپنی قیام گاہ کے ارد گرد خاردار بندی کر رکھی تھی اس لیے مجاہدین نے کچھ چارپائیاں بھی ساتھ لے لیں تاکہ خاربندی سے لگا کر بسہولت اندر پہنچ سکیں ۔

میاں مقیم کی دلاوری تین میل کی مسافت میں بہت سے ملکی آدمی ادھر ادھر چھپ گئے اور میاں مقیم کے ساتھ صرف تین چار سو رہ گئے ۔ میاں صاحب بلند ہمت آدمی تھے ۔ اپنے ساتھیوں کی قلت تعداد سے بے پروا ہو کر انھوں نے حملہ کیا ۔ پہلے بارود بھرے نل لشکر گاہ میں پھینکے پھر چارپائیاں خاربندی سے لگا دی گئیں ۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ جو شخص سب سے پہلے لشکر گاہ میں پہنچا وہ مجاہدین کا بہادر سالار محمد مقیم تھا ۔ میاں نے پورے زور سے نعرۂ تکبیر لگایا ۔ راویوں کا بیان ہے کہ سکھ غول غول بن کر کئی جگہ جمع ہو گئے تھے ۔ مجاہدین پہلے ان پر نل پھینکتے پھر تیر اسنگینیں چلاتے ہوئے حملہ کرتے " منظورہ " میں مرقوم ہے کہ محمد مقیم اور ان کے ساتھیوں نے جوانمردی کے وہ جوہر دکھائے کہ رستم و اسفندیار کی داستانیں فراموش ہو گئیں ۔ وہ لوگ اس طرح سکھوں کے ہجوم میں گھستے تھے جیسے کوئی کبڈی کھیلتا ہے ۔ تین چار نوبتوں میں سکھوں کو خاربندی سے باہر نکال دیا ۔

جب سکھوں پر واضح ہوا کہ حملہ آور تعداد میں کم ہیں تو انھوں نے دوبارہ اکٹھے ہو کر مقابلے کی ٹھانی ۔ مولوی خیر الدین نے یہ حالت دیکھی تو مشورہ دیا کہ اب باہر نکل چلو ۔ مولوی صاحب ایک جماعت لے کر سکھوں کا مقابلہ کرنے لگے ۔ باقی مجاہدین کو مراجعت کا حکم دے دیا ۔ پھر خود بھی آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتے

ہو کر نکل گئے۔ اس معرکے میں سکھ مقتولین کی تعداد تین سو کے قریب تھی۔ غازیوں میں سے دو سخت زخمی ہوئے اور شہادت پائی۔ چھ سات کے ہلکے زخم لگے۔ خود میاں محمد مقیم کی ٹانگ پر بھی تلوار کا ایک زخم تھا۔

مراجعت اور وفات ہزارہ سے واپسی کے بعد میاں صاحب کے بھائی کریم اللہ کے مرنے کی اطلاع پہنچی اور غالباً ان کے متعلقین اور خود نواب احمد علی خاں کی طرف سے معروضہ پیش ہوا کہ میاں محمد مقیم کو واپس بھیج دیا جائے۔ وہ جانے کے لیے تیار نہ تھے۔ سید صاحب نے حکماً انہیں واپس بھیجا۔ رام پور میں وہ اپنے عہدے پر مامور ہو گئے تھے۔ ایک ریاستی کی سرکشی کے انسداد کے لیے پالکی میں بیٹھ کر گئے۔ ادھر سے اچانک گولیوں کی بوچھاڑ آئی۔ میاں محمد مقیم بری طرح زخمی ہو گئے اور کچھ دیر بعد وفات پائی۔

طریقۂ محمدیہ نواب وزیر الدولہ نے "وصایا" میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ عطاء اللہ نے جو حکیم غلام حسین نائب والی رام پور کے بڑے بھائی تھے نیز میاں محمد مقیم نے سید صاحب سے بہ ادب پوچھا کہ آپ چشتی، قادری، نقشبندی اور مجددی طریقوں میں بیعت کے بعد طریقۂ محمدیہ میں بھی بیعت لیتے ہیں، اس کی حقیقت ہمیں معلوم نہ ہو سکی۔ سید صاحب نے اس کا جواب بطریق اجمال یہ دیا: چشتی اور قادری طریقوں کے اشغال کی تعلیم اس طریق پر دی جاتی ہے کہ ذکر جہر کرو اور ضرب اس طرح لگاؤ۔ طریقۂ نقشبندیہ و مجددیہ کی تلقین اس طرح کی جاتی ہے کہ ذکر خفی کرو، پھر سمجھایا جاتا ہے کہ یہ لطیفۂ قلب ہے، یہ لطیفۂ روح، یہ لطیفۂ نفس، یہ لطیفۂ سر، یہ لطیفۂ خفی ہے اور یہ لطیفۂ اخفیٰ۔ ان طریقوں کی نسبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باطنی ہے۔ طریقۂ محمدیہ کے اشغال یوں سکھائے جاتے ہیں:

کھانا اس نیت سے کھایا جائے، لباس اس نیت سے پہنا جائے، نکاح اس نیت سے کیا جائے، رات کو سویا اس نیت سے جائے، لکڑی بازی اس نیت سے کی جائے، تجارت اس نیت سے اور نوکری اس نیت سے۔ اس طریقے کی نسبت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بطور ظاہر شریعت ہے۔[1]

[1] وصایا، حصہ دوم، صفحہ ۴۳-۴۴۔ مراد یہ ہے کہ سب کچھ خدا کے لیے کیا جائے۔ کھانے سے مقصود جسم میں قوت (باقی صفحہ ۲۳۲ پر)

گویا عمل کا مقصد رضائے باری تعالیٰ ہو، اس کے سوا کچھ نہ ہو اور جو کام بھی کیا جائے شریعت محمدیہ کے مطابق کیا جاتے ۔

مولوی عبدالوہاب | شاہ یقین اللہ کے فرزند بڑے سلیم المزاج، نیک کردار، بُردبار اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ پھُلت میں سید صاحب نے انھیں رسد کی تقسیم پر مامور فرما دیا تھا۔ "قاسم غلہ" ان کے نام کا جزو بن گیا۔ مختلف عوارض کے باعث بہت لاغر اور نحیف ہوگئے تھے، اس لیے قسیم غلہ کی خدمت میں عذر کیا۔ سید صاحب نے فرمایا۔ ہم دعا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ چنانچہ خدا کے فضل سے آپ کے ناصحے بھی جاتے رہے اور جسم کی حالت بھی بہتر ہوگئی۔

حفظ قرآن اور حسن تقسیم | مولوی صاحب کو حفظ قرآن کا بہت شوق تھا۔ کئی مرتبہ سید صاحب سے عرض کیا کہ دعا فرمائیے، اللہ تعالیٰ حفظ کی توفیق عطا کرے اور میں ایک بار تراویح میں پورا قرآن سناؤں۔ آپ کو سنا دیں کیفیت یہ تھی کہ غلہ تقسیم فرماتے وقت آہستہ آہستہ قرآن مجید پڑھتے جاتے۔ ایک ایک وقت میں بیس بیس پچیس پچیس مجاہد رسد کے لیے آجاتے۔ وہ یہ سب کو باری باری مقررہ پیمانے کے مطابق دیتے جاتے۔ طریقہ یہ اختیار کر لیا تھا کہ بڑا ہو یا چھوٹا، افسر ہو یا سپاہی، جس ترتیب سے لوگ آتے تھے، اسی ترتیب سے سب کو رسد دیتے۔ تقدم و تاخر نہ ہونے پاتا۔

عفو و حلم | ایک روز مولوی امام علی عظیم آبادی رسد لینے کے لیے آئے۔ وہ نو وارد تھے اور مولوی صاحب کے طریق تقسیم سے انھیں آگاہی نہ تھی۔ اصرار کیا کہ پہلے مجھے رسد دیجیے۔ مولوی صاحب نے تحمل سے فرمایا کہ بھائی رسد باری سے ملے گی۔ وہ قوی الجثہ اور جسیم آدمی تھے۔ غصے میں آ گئے اور مولوی صاحب کو دھکا دے کر آٹے کے انبار پر گرا دیا۔ مولوی صاحب تمام قندھاریوں میں بہت ہی معزز و محترم مانے جاتے تھے۔ قندھاری غازیوں نے یہ کیفیت دیکھی تو مولوی امام علی کو مارنے کے لیے تیار ہوگئے۔ مولوی عبدالوہاب

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۲۱)

کی بجا لائی ہو تاکہ دین کی خدمات احسن طریق پر انجام پائیں۔ لباس سے مقصود جسم کی حفاظت ہو۔ نکاح سے مقصود یہ ہو کہ نفسانی خواہش سے محفوظ رہے۔ کھیتی باڑی، تجارت یا نوکری کی غرض یہ ہو کہ انسان کمائی کر کے متعلقین کے حقوق ادا کرے اور جو رقم بچائی جا سکے اسے خدا کی راہ میں صرف کرے۔

نے انھیں روک دیا اور کہا کہ امام علی میرا بھائی ہے۔ دھکا دیا تو مجھے دیا۔ آپ لوگ کیوں جوش میں آ گئے۔

ہوتے ہوتے یہ بات سید صاحب تک پہنچی۔ آپ نے مولوی عبدالوہاب کو بلا کر تفصیل پوچھی۔ موصوف نے عرض کیا: امام علی نیک بخت آدمی ہیں۔ بلا ارادہ بیچ میں آ گئے تھے۔ باری ان کی نہ تھی۔ انھوں نے عجلت کی اور مجھے دھکا لگ گیا۔ کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ نمازیوں نے مولوی صاحب کے عفو و تحمل کی یہ داستان مولوی امام علی کو سنائی تو وہ بہت پشیمان ہوئے۔ خود سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی زیادتی کا صاف صاف اقرار کیا۔ ساتھ ہی کہا کہ مولوی صاحب سے میرا جرم معاف کرا دیجیے۔ سچی اسلامی اخوت کے یہ دلکش مناظر جماعت مجاہدین میں عام تھے۔ انھیں سے سید صاحب کی شانِ تربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

جب سید صاحب پنجتار سے ہجرت کر کے راج دواری پہنچے تو مولوی عبدالوہاب نے رمضان شریف کی تراویح میں قرآن سید صاحب کو سنایا اور اس طرح ان کی دیرینہ آرزو پوری ہوئی۔ ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۶ھ کو سید صاحب کے ساتھ جنگ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔

رضائے باری تعالیٰ | مولوی سید جعفر علی نقوی نے قیامِ امب کا ایک واقعہ لکھا ہے جو سننے کے قابل ہے۔ ایک روز سید صاحب نے فرمایا کہ بعض دل دیوانے ہوتے ہیں۔ مجھے بہشت کی بھی خواہش نہیں۔ محض اللہ کی رضا پر نظر ہے۔ شاہ اسمٰعیل نے یہ سن کر کہا کہ یہ ٹھیک اونچا مرتبہ ہے، لیکن بہشت سے بے پروائی کا ذکر زبان پر نہ لائیں۔ اس لیے کہ بہشت سے مراد حق اور دوزخ سے مراد باطل ہے۔ مومن کے لیے حق سے بے پروائی مناسب نہیں۔

سید صاحب: جب خدا راضی ہوگا تو بندے کو خود بہشت میں بھیجے گا۔ اصل میں رضا ہے، بہشت رضا کی ایک شاخ ہے۔

شاہ اسمٰعیل: ویسا نہیں، بہشت کی بہترین شاخوں میں سے رضا ایک شاخ ہے۔

یہ سنتے ہی مولوی عبدالوہاب نے بآواز بلند یہ آیت پڑھی: وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ أَكْبَرُ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (سورۂ توبہ) اور کہا: اس سے ظاہر ہوا کہ رضا دوسری چیز ہے جس کا ایک ثمرہ بہشت بھی ہے۔

شاہ یقین اللہ : مولوی عبدالوہاب کے والد ماجد شاہ یقین اللہ سید صاحب کے مخلص مرید اور خلیفہ تھے۔ مجموعہ مکاتیب میں ایک خط بھی ان کے نام ملتا ہے جس میں جنگ شیدو، ورود پشاور، وصولات اہل سرحد کے اتفاق کا ذکر ہے۔ اس میں شاہ یقین اللہ کو ان الفاظ سے مخاطب کیا گیا ہے:

بحضور مستفیض درجت حقایق ونشیمن ارشاد وتلقین رہنمائے ارباب صدق ویقین

یادگار اسلاف کرام، تذکار اولیائے عظام مقبول بارگاہ الٰہ مخدومی ومکرمی شاہ یقین اللہ

مد اللہ ظلال ہدایتہ علی رؤس المستفیدین الی یوم الدین۔

ان الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ سید صاحب کی نظروں میں شاہ یقین اللہ کا مرتبہ کتنا اونچا تھا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ میاں دین محمد نے سید صاحب کے لشکر میں [illegible] روپے کی رقم شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کی تھی۔ ممکن ہے اس قسم کی اور نذریں بھی دی گئی ہوں۔

مولوی نور احمد نگرامی : مولوی صاحب مجاہدین کے لشکر اور سید صاحب کے عقیدت مندوں میں "مورخ اسلام" کے لقب سے مشہور تھے۔ ابتدا ہی سے آپ کے ساتھ رہے اور سب سے پہلے آپ کے حالات لکھنے کا التزام کر لیا تھا۔ جو کچھ لکھتے سید صاحب سے اس کی تصدیق کرا لیتے۔ سید جعفر علی نقوی لکھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے تمام واقعات سید صاحب کو سنا کر ان کی تنقیح کرا لی تھی۔ یہ کتاب معرکۂ جہاد میں ان کے پاس تھی۔ افسوس کہ اس کا محض نام باقی رہ گیا اور کتاب کا سراغ اب تک نہ مل سکا۔

شہادت : مولوی صاحب جہاد میں سید صاحب کے ہمراہ تھے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کن کن جنگوں میں انھوں نے حصہ لیا۔ جنگ بالاکوٹ میں ان کی شرکت ثابت ہے۔ محمد امیر خاں قصوری لکھتے ہیں کہ جنگ شروع ہو چکی تھی اور میں دھان کے کھیتوں سے آگے بڑھ کر ایک پتھر کی آڑ میں کھڑا بندوق چلا رہا تھا۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر مولوی نور احمد تھے۔ ایک گولی ان کے بازو پر لگی اور بولے: بھائی! میں تو معذور ہو گیا۔ میری چیزوں میں سے جو درکار ہو لے لو۔ میں نے گولیاں لے لیں۔ وہ پیشتر پیچھے کو چلے۔ اسی حالت میں ایک اور گولی لگی اور وہ زمین پر بیٹھ گئے۔ پھر معلوم نہ ہو سکا کہ اسی جگہ

شہید ہوئے یا کسی اور جگہ ۔

شہادت اس بنا پر یقینی ہے کہ جنگ بالاکوٹ کے بعد کسی نے مولوی صاحب کو زندہ نہ دیکھا۔ چونکہ سکھوں نے جنگ کے بعد بالاکوٹ کو آگ لگا دی تھی اور مجاہدین کی تمام چیزیں جل گئی تھیں اس لیے غالب ہے مولوی نور احمد کی مرتبہ سیرت بھی نذر آتش ہو گئی ہو۔ میں نے اس کتاب کی تلاش میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا، لیکن کسی نے اس کے وجود کی تصدیق نہ کی ۔

جب سید صاحب نواب امیر خاں کے لشکر میں تھے تو ان کے رفیقوں میں سید ظہور احمد نگرامی اور سید عبدالرزاق نگرامی کے نام بھی آئے ہیں۔ ممکن ہے یہ حضرات مولوی نور احمد نگرامی "مؤرخ اسلام" کے عزیزوں میں سے ہوں۔ مجھے حقیقت حال منکشف نہ ہو سکی ۔

بائیسواں باب

محمدی، باقر علی، محمد حسین، قمر الدین

منشی محمدی انصاری منشی محمدی انصاری جنھیں بعض روایات بردوانی بھی لکھتے ہیں سید صاحب کے میر منشی تھے۔ ان کا وطن راج محل سے بارہ کوس کے فاصلے پر تھا۔ صحیح نام معلوم نہ ہو سکا۔

منشی صاحب نے اس زمانے میں بمقام میرٹھ بیعت کی تھی جب سید صاحب میرٹھ، سہارنپور، مظفر نگر وغیرہ کے دورے پر نکلے تھے۔ اس وقت منشی صاحب کی عمر اٹھائیس انتیس سال سے زیادہ نہ ہوگی۔ جن لوگوں نے دوران جہاد میں انھیں دیکھا، ان کی عمر پچیس چھبیس سال کی بتائی۔ غالباً اسی وقت سے سید صاحب کی معیت اختیار کر لی۔ سفر حج میں سید صاحب کے ساتھ رائے بریلی سے روانہ ہوئے۔ راج محل پہنچ کر منشی صاحب سید صاحب کو باصرار اپنے وطن لے گئے اور منشی صاحب کے اکثر اقربا نے وہاں سید صاحب کی بیعت کی، مثلاً ان کے والد منشی شاہ محمد، منشی رؤف الدین، منشی مخدوم بخش، منشی حسن علی (جن کا رشتہ معلوم نہ ہو سکا)، منشی فضل الرحمٰن اور منشی عزیز الرحمٰن (یہ منشی صاحب کے ماموں تھے) اور لوگ بھی سید صاحب کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ منشی شاہ محمد حج کے لیے ساتھ گئے۔

اہل و عیال واپسی میں مرشد آباد سے منشی صاحب کو وطن جانے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی فرمایا کہ نکاح کر لیجیے۔ اس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت منشی صاحب کا عنفوان شباب تھا۔ چنانچہ انھوں نے نکاح کیا اور خدا نے ایک بیٹا دیا، جس کا نام محمد یحییٰ رکھا۔ خود فرماتے تھے: بچے کی محبت اس طرح دل و دماغ میں پیوست ہوگئی کہ یہ بھی ایک امتحان الٰہی بن گئی۔ تاہم کوئی شے منشی صاحب کو خدمت حق سے روک نہ سکی۔

ہجرت جب ہجرت کی خبر ملی تو منشی صاحب بیوی بچے اور اقربا کو چھوڑ کر رائے بریلی پہنچ گئے اور سید صاحب کے ساتھ ہجرت کا شرف حاصل کیا۔ ان کے ماموں منشی فضل الرحمٰن بھی ساتھ تھے۔ سید صاحب منشی محمدی

کو ”نانا“ انصاری بھائی“ کہہ کر پکارتے تھے۔ تمام اہل لشکر انھیں بھائی صاحب کہتے تھے۔

انتظام دفتر | یہ بتایا جا چکا ہے کہ منشی صاحب کو تحریر پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اندھیرے میں بھی بے تکلف لکھتے، لیکن نہ سطر ٹیڑھی ہوتی، نہ الفاظ ایک دوسرے سے پیوست ہوتے۔ انھوں نے مختلف امور کے لیے الگ الگ بستے بنا لیے تھے۔ یہ بستے ایک بڑے صندوق میں رہتے۔ جس بستے کی ضرورت پڑتی، محافظوں سے کہہ کر صندوق میں سے نکلوا لیتے۔ ہر مہینے کے آغاز میں روزنامچے کی جدولیں تیار کرا لیتے۔ اس روزنامچے میں تمام حالات تفصیل سے لکھوا لیتے۔ سید جعفر علی نقوی جہاد کے لیے سرحد پہنچے تو منشی خانے سے وابستہ ہو گئے۔ تحریروں کی تبییض کا کام انھیں سے لیا جاتا۔

خاص نشانات | سید صاحب نے اپنی مہر شاہ اسمٰعیل کے حوالے کر دی تھی۔ شاہ صاحب یہ مہر کبھی کبھی مولوی محمد حسن رامپور منہاران اور منشی محمدی انصاری کو دے دیتے تھے۔ منشی صاحب ہر مکتوب پر ایک اصطلاحی نشان بنا دیتے۔ جس پر یہ نشان ہوتا، اسی پر مہر لگائی جاتی۔ کسی کاغذ کے گوشے میں لفظ ”حضور“ لکھ دیتے۔ کسی کے گوشے میں ”مولانا“۔ ”حضور“ کا مطلب یہ ہوتا کہ مکتوب یا فرمان براہ راست سید صاحب کی طرف سے ہے۔ لفظ ”مولانا“ کا مطلب یہ ہوتا کہ شاہ اسمٰعیل کی وساطت سے یہ فرمان جاری ہو رہا ہے۔

شہادت | ان کے ماموں منشی فضل الرحمٰن نے جنگ مایار میں تورو اور مایار کے درمیان شہادت پائی۔ چنانچہ ان کی میت تورو میں دفن ہوئی۔ خود منشی صاحب کی شہادت بالاکوٹ میں سید صاحب کی شہادت گاہ کے قریب ہوئی۔ انھیں غالباً اسی گنج شہیداں میں دفن کیا گیا جو قصبہ بالاکوٹ کے مغرب میں مٹی کوٹ کے ٹیلے کے قریب ہے۔

اخلاق و عادات | راویوں نے لکھا ہے کہ منشی صاحب بڑے مخلص، سید صاحب کے کمال معتقد اور آپ کے نزدیک نہایت معتبر و معزز تھے۔ خلوص کا یہ عالم تھا کہ دوران جہاد میں کبھی کسی معاملے کے متعلق سید صاحب سے خفیف سے اختلاف کا بھی موقع نہ آیا۔ سید صاحب کی طرف سے جو فیصلہ یا فرمان صادر ہوتا، اس کی درستی کے پورے معتقد تھے۔ شہادت کے وقت عمر تیس برس سے کم تھی۔

باقر علی عظیم آبادی | یہ مولانا ولایت علی عظیم آبادی کے ہم جد، رشتے میں چچیرے بھائی تھے۔ شجرۂ نسب یوں ہے:

باقر علی بن مولوی بشارت علی بن مولوی وارث علی بن ملا محمد سعید۔ مولوی وارث علی کے دوسرے بیٹے مولوی فتح علی تھے جو مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے والد تھے۔ مولوی بشارت علی کی شادی حضرت شاہ محمد معز ساکن محلہ نمو میہ کی صاحبزادی مسمات نجیبن سے ہوئی تھی۔ جوانی ہی میں ان کا انتقال ہوگیا۔ صرف دو بیٹے اور ایک بیٹی یادگار چھوڑی۔ یہ بچے کمسن تھے۔ مولوی فتح علی ہی نے ان کی پرورش کی۔

شانِ ارادت سید صاحب حج سے مراجعت پر پٹنہ میں ٹھہرے تو خاندان اور شہر کے دوسرے افراد کے ساتھ مولوی باقر علی نے بھی بیعت کر لی۔ اس وقت سولہ سترہ سال کی عمر ہوگی۔ شادی نہ ہوئی تھی اور عیال داری کا کوئی جنجال نہ تھا۔ اس لیے اسی وقت سے مرشد کی رکاب پکڑ لی اور ساتھ نہ چھوڑا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک موقع پر ننگے پاؤں سید صاحب کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے۔ راستے میں کھٹے کا کانٹا چبھ گیا۔ شدید تکلیف ہوئی، باوجود یہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ رکے اور برابر ساتھ رہے۔ منزل پر پہنچ کر کانٹا نکلوایا۔

نائب تقسیم رسد جب سید صاحب جہاد کے لیے نکلے تو مولوی باقر علی پہلی جماعت میں شریک ہوئے۔ اس وقت مولوی محمد یوسف پھلتی سید صاحب کی طرف سے تمام انتظامات کے کفیل تھے۔ انھیں کے پاس روپیہ جمع ہوتا تھا۔ وہی جماعت مجاہدین کے لیے سارا سامان خریدتے تھے۔ مولوی باقر علی کو سید صاحب نے رسد کی تقسیم کے لیے ان کا نائب بنا دیا تھا۔

راہِ حق کا پہلا شہید اکوڑہ میں سکھوں کے لشکر پر شبخون کے لیے جو ایک سو چھتیس غازی منتخب ہوئے تھے، ان میں مولوی باقر علی بھی شامل تھے۔ ان کا شرف یہ ہے کہ سکھوں کی طرف سے جو پہلی گولی مجاہدین کی طرف آئی، وہ مولوی باقر علی کے لگی۔ زخم کاری تھا، وہ بیٹھ گئے اور بولے: بھائیو! میرا کام تمام ہوا۔ اب مجھ سے ہتھیار لے لو۔ یہ اللہ کا مال ہے۔ یہ کہتے ہی جان بحق ہو گئے۔ گویا جماعت مجاہدین میں سے وہ راہِ حق کے پہلے شہید تھے۔ ان کے پاس دو پستول تھے، ایک تلوار اور ایک بندوق۔ پستولوں میں سے ایک کا نام بسم اللہ تھا اور دوسرے کا عبداللہ۔ غازیوں نے پستول تو سنبھال لیے۔ تلوار اور بندوق وہیں رہ گئیں۔ شہادت کے وقت صرف اٹھارہ انیس سال کی عمر تھی۔

شاہ محمد حسین عظیم آبادی ان کے بزرگوں میں سے پہلے پہل میر معز الدین دیورہ میں آکر آباد ہوئے

دغیرہ کو بعض شبہات کی بنا پر نظر بند کر دیا تھا۔ تقریباً تین مہینے اس ابتلا میں گزرے۔

سواری وسپہ گری | فن سپہ گری میں پورا دخل تھا۔ گھوڑے کی سواری میں مشاق تھے۔ آخری عمر تک گھوڑے کے سوا کوئی سواری استعمال نہ کی۔ ہمیشہ شریر گھوڑا خرید لیتے اور اسے سدھا کر فروخت کر دیتے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ ہاشمی تخلص تھا۔ قد میانہ، رنگ بہت گورا، نہایت خوب صورت اور وجیہ تھے۔

وفات | ۸۔ رجب ۱۲۸۲ھ (۳۱۔ جنوری ۱۸۶۶ء) کو جمعرات کے دن وفات پائی۔ حکیم مومن اسداللہ نے تاریخ وفات کہی:

رفت بریم انجمن در قدم پاک وصاف
زیب سریر ارم شاہ محمد حسین!

آپ کی اہلیہ بی بی نصرت نے تقریباً ایک سو سال کی عمر پا کر انتقال کیا۔ مولوی محمد یوسف جعفری رنجور نے تاریخ وفات کہی:

چو جدہ ماجدہ ام بی بی نصرت جدا گشتہ زما زیر زمیں رفت
پئے تاریخ رحلت فکر کردم ندا آمد بہ فردوس بریں رفت

۱۲ ھ ۹۹

اولاد | شاہ محمد حسین کے ایک بیٹا اور چھ بیٹیاں تھیں۔ بیٹے کے کوئی اولاد نہ تھی۔ بیٹیوں میں سے ایک نے بچپن میں وفات پائی۔ باقی پانچ میں سے چار کے نکاح ان بزرگوں سے ہوئے جو سید صاحب کی تحریک جہاد میں سرگرمی سے شریک رہے۔ مثلاً:

۱۔ مولانا احمد اللہ: بہ سلسلۂ اعانت مجاہدین حبس دوام کی سزا پائی اور جزائر انڈمان میں فوت ہوئے۔ بڑی صاحبزادی ان کے نکاح میں تھی۔

۲۔ مولانا یحییٰ علی: بہ غرض جہاد سرحد میں بھی رہے۔ پھر جماعت مجاہدین کے لیے دعوت و تنظیم میں مشغول ہو گئے۔ گرفتار ہوئے اور پھانسی کی سزا پائی جسے عمر قید میں بدل دیا گیا۔ جزائر انڈمان ہی میں فوت ہوئے۔ دوسری صاحبزادی ان کے نکاح میں تھی۔

۳۔ مولوی فیاض علی : مولانا ولایت علی کے ساتھ جہاد میں شریک رہے۔ تیسری صاحبزادی ان کے نکاح میں تھی۔

۴۔ مولوی اکبر علی : مولانا ولایت علی کے ساتھ مجاہدین میں شریک رہے۔ پھر وطن ہی میں بعارضۂ ہیضہ وہاں انتقال کیا۔ جو صاحبزادی ان کے نکاح میں تھی، ان کا نکاح ثانی مولانا عنایت علی سے ہوا جو مولانا ولایت علی کے بعد امیر مجاہدین ہوئے اور انگریزوں سے لڑتے ہوئے چنئی (سرحد آزاد) میں وفات پائی۔

ان حضرات کے مفصل حالات کتاب کی آئندہ جلد میں بیان ہوں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

قمر الدین حسین شجرۂ نسب یہ ہے: قمر الدین حسین بن رکن الدین حسین بن رفیع الدین حسین نائب ناظم بہار۔ رفیع الدین حسین اور ان کے والد روح الدین حسین مغل بادشاہوں کی طرف سے بہار کے نائب ناظم رہے، اس لیے وہاں کے اکابر امراء میں شمار ہوتے تھے۔ رفیع الدین حسین قمر الدین حسین کے دادا اور مولانا ولایت علی کے نانا تھے۔ یہ بہار کا دوسرا بڑا خاندان تھا جس سے قمر الدین حسین کو قرابت قریبہ حاصل تھی۔

بیعت و رفاقت ان کی شادی مولوی الٰہی بخش کی صاحبزادی جمیلۃ النساء سے ہوئی تھی۔ مولوی صاحب موصوف بھی عظیم آباد کے رؤسا میں محسوب تھے۔ قمر الدین حسین نے اس زمانے میں سید صاحب سے بیعت کی جب آپ حج سے واپس آتے ہوئے عظیم آباد ٹھہرے تھے۔ اسی وقت سے رفاقت اختیار کر لی۔ بیعت امامت جہاد کے بعد سید صاحب نے بلوا بھیجا تو قافلے کے ساتھ سرحد پہنچے۔

شہادت سید صاحب نے مولوی مظہر علی عظیم آبادی کو پشاور میں قاضی مقرر کیا تو انھوں نے بعض احباب کو اپنے ساتھ رکھا۔ ان میں سے ایک قمر الدین حسین تھے۔ ممکن ہے مولوی صاحب نے انھیں ہم وطنی کی بنا پر چنا ہو۔ ممکن ہے قمر الدین حسین اور مولوی صاحب کی جماعت میں شریک ہوں۔ بہرحال یہ مولوی صاحب کے ساتھ رہے اور بتایا جاتا ہے کہ انھیں کے ساتھ شہید ہوئے۔ اولاد کوئی نہ تھی۔ ان کی بیوہ کا نکاح ثانی مولانا ولایت علی سے ہو گیا۔ صاحب وقائع منصور نے لکھا ہے کہ بہار و بنگال میں بیوہ کا یہ پہلا نکاح ثانی تھا۔

تئیسواں باب

احمد اللہ، خیر آبادی گھرانا، عبدالمجید خاں

احمد اللہ ناگپوری | مولانا عبدالحی کے چچیرے بھائی تھے۔ بعض نے حقیقی بھائی لکھا ہے لیکن اس کی صحت کسی ذریعے سے ثابت نہیں۔ عجیب امر یہ ہے کہ اتنے قریبی رشتے کے باوجود دونوں بھائیوں میں ظاہری ملاقات کبھی نہ ہوئی تھی۔ مولانا عبدالحی سرحد چلے آئے تو مولوی احمد اللہ نے زیارت کا پختہ ارادہ کر کے ہجرت کی اور ٹونک ہوتے ہوئے سرحد پہنچے۔ چند آدمی بھی ساتھ تھے۔ اس وقت سید صاحب خہر میں مقیم تھے۔ مولوی احمد اللہ کے خہر آنے سے صرف تین چار دن پیشتر مولانا عبدالحی نے وفات پائی۔ یہ جانگسل خبر مولوی احمد اللہ کو دی گئی ہوگی۔ ان کے رنج و قلق کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ صرف بھائی کے اشتیاق دیدار میں اتنا لمبا اور کٹھن سفر اختیار کیا۔ لیکن شوق پورا نہ ہو سکا۔

کمالات | خہر پہنچ کر سید صاحب سے ملاقات ہوئی تو معاً بیعت کر لی اور رفیقان خاص میں شامل ہو گئے۔ علم و تقویٰ میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ تیر اندازی، چابک سواری اور کشتی کے فنون میں استاد کامل تھے۔ جانوروں کے علاج میں بھی ید طولیٰ حاصل تھا۔ دعوت و عمل کے بھی ماہر مانے جاتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی شخص سید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میرے ایک عزیز کو آسیب کا عارضہ ہے۔ مہربانی فرما کر کوئی تدبیر کیجیے۔ سید صاحب نے مولوی احمد اللہ کو بھیجنا چاہا۔ انھوں نے عذر کیا کہ اس میں گوشت نہ کھانے کے علاوہ بعض اور پابندیاں بھی ہیں۔ سید صاحب نے پوچھا آپ پڑھتے کیا ہیں۔ عرض کیا وہی دعائیں جو قرآن مجید میں آئی ہیں۔ پوچھا کوئی اور چیز تو نہیں؟ عرض کیا: نہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ بے تکلف جائیے۔

مختلف خدمات | سید صاحب نے مولوی صاحب کو ایک جماعت کا سالار بنا دیا تھا۔ مختلف فنون

میں باکمال ہونے کے باعث وہ غازیوں کی تربیت بھی فرمایا کرتے تھے۔ سید صاحب کی اہم مجالس شوریٰ
میں بہ طور رکن شریک ہوتے تھے۔ پنجتار سے شمال میں ایک میل ڈیڑھ میل پر تانم تحصیل کا ایک گاؤں ہے۔ مولوی
احمد اللہ نے وہاں گولے و بارود کا ایک کارخانہ بنایا تھا۔ مولوی خیرالدین شیرکوٹی بھی اس کام میں شریک تھے۔
ایک موقع پر سید صاحب نے مرکز سے باہر جاتے وقت انتظام ان کے حوالے کر دیا تھا۔

بالاکوٹ | مولوی سید جعفر علی نقوی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود، شیخ محمد اسحٰق گورکھپوری، حافظ
مصطفیٰ کاندھلوی جیسے لوگ مولوی احمد اللہ کی جماعت میں شریک تھے۔ چنانچہ مولوی صاحب نے جنگ بالاکوٹ
سے ایک رات پیشتر اپنی پوری جماعت کو دعوت طعام دی۔ مولوی جعفر علی سے کہا کہ میں تو امیرالمومنین کے
ساتھ رہوں گا۔ جنگ میں جماعت کی قیادت آپ کیجیے گا۔ نقوی نے عذر کیا کہ مجھے عسکری کا تجربہ نہیں۔
حافظ مصطفیٰ کو یہ منصب سونپ دیجیے۔

مولوی احمد اللہ : حافظ مصطفیٰ بھی میرے ساتھ ہوں گے۔

نقوی : تو شیخ اسحٰق کو امیر بنا دیجیے۔

مولوی احمد اللہ : وہ خود جوشیلے آدمی ہیں اور امارت کے لیے متین آدمی کی ضرورت ہے۔

نقوی : پھر شیخ حسن خان بہاری کا نام پیش کرتا ہوں۔

مولوی احمد اللہ : بھائی! کیا آپ طے کر چکے ہیں کہ میرا حکم نہ مانیں گے؟

نقوی : میں معافی مانگتا ہوں۔ محض اپنی ناتجربہ کاری، ورنہ ذاتی آپ پر واضح کر رہا تھا۔

مولوی صاحب یہ فقرہ سن کر مسکرائے اور جماعت کو حکم دیا کہ میدان جنگ میں تمام بھائی سید جعفر علی
نقوی کے احکام کی تعمیل کریں۔

یہ امر یقینی ہے کہ مولوی صاحب جنگ بالاکوٹ میں خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔ شہادت کی
تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

نیزہ بازی | مولوی احمد اللہ اگرچہ تمام فنون حرب میں حاذق تھے اور نیزہ بازی میں بھی کمال حاصل تھا لیکن
ایک بار مشق میں سید صاحب سے مقابلے کا موقع آ پڑا تو معلوم ہوا کہ نیزہ بازی میں مزید تعلیم کی ضرورت ہے۔

نواب وزیرالدولہ نے ایک نہایت عمدہ گھوڑا سید صاحب کے لیے بھیجا تھا۔ آپ نے وہ مولوی احمد اللہ کو دے دیا کہ اسے سدھا لیں۔ چند روز کے بعد اس پر سوار ہوئے تو معلوم ہوا کہ بہت اچھا ہے۔ آپ کی عادت شریفہ یہ تھی کہ کوئی شخص کسی فن کا ماہر ہوتا تو اس فن میں اپنی مہارت اس کے سامنے ظاہر نہ کرتے۔ لیکن سواری کرتے ہوئے مولوی احمد اللہ سے فرمایا کہ آپ نیزہ بازی کے ماہر ہیں ذرا نیزہ کے کچھ ہاتھ دکھائیے۔ سیکڑوں لوگ تماشا دیکھنے کے لیے جمع ہو گئے۔ ٹولی والے ڈنڈے سے کسرت شروع کی۔ سید صاحب نے مولوی صاحب سے فرمایا کہ وار میں دریغ نہ کیجیے۔ لیکن جب تک کسرت جاری رہی، مولوی صاحب کبھی پہلو میں کبھی شانے میں اور کبھی گردن میں ضربیں کھاتے رہے۔ بہت ہوشیاری کرتے لیکن بچ نہ سکتے۔ آخر مولوی صاحب نے مان لیا کہ نیزہ بازی بڑے ماہر استادوں سے سیکھی ہے لیکن جو پیچ آج دیکھے ہیں وہ تو خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ چنانچہ سید صاحب سے درخواست کی کہ یہ پیچ سکھا دیں۔ بعد ازاں سید صاحب دوسرے تیسرے دن مولوی صاحب کو نیزہ بازی کے خاص پیچ سکھاتے اور یہ سلسلہ کوئی دو مہینے تک قائم رہا۔[1]

خیرآبادی مجاہد ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں کہ کسی خاندان کے تمام افراد نے بیک وقت جہاد فی سبیل اللہ کے لیے قدم اٹھایا۔ سید صاحب کے رفیقوں میں سے خیرآباد کا ایک گھرانا اس لحاظ سے خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ یہ چھ بھائی تھے۔ تمام نے سید صاحب سے بیعت کی اور ان کے ساتھ جانے کے لیے ہجرت پر تیار ہو گئے۔ ان کے والد بھی جہاد میں شریک ہوئے۔ تفصیل ذیل میں درج ہے:

۱- **گوہر خاں**: چھ بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ سید صاحب نے جب وطن چھوڑ کر جہاد کے لیے سرحد پہنچنے کا ارادہ کر لیا تو یہ تکیہ شریف سے بدیں غرض خیرآباد آئے کہ اہل و عیال کو لے کر روانہ ہوں۔ اتفاق سے اسی اثنا میں وفات پائی۔ چونکہ جہاد کے لیے ہجرت کی پختہ نیت کیے بیٹھے تھے، اس لیے پورے ثواب کے مستحق ٹھہرے۔

۲- **امام خاں**: مختلف جنگوں میں شریک رہے۔ سید صاحب پائندہ خاں سے ملنے کے لیے عشرہ گئے تھے تو شاہ اسماعیل نے احتیاطاً مجاہدین کی ایک جماعت کو مقام ملاقات سے قریب ایک پوشیدہ جگہ

[1] تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو "وقائع احمدی"۔

سواری کا گھوڑا سمجھا جاتا تھا۔ سید محمد علی کو غازیوں کے لشکر کا سالار بنایا تو سید صاحب نے اپنی بعض دوسری چیزوں کی طرح گھوڑا بھی انھیں دے دیا تھا۔

محمد خاں نے جب دیکھا کہ سکھ اژدر کو لیے جا رہے ہیں تو پکار کر کہا: بھائیو! یہ امیر المومنین کی سواری کا گھوڑا ہے۔ اسے دشمن کے قبضے میں نہ جانے دو۔ یہ کہتے ہی بجلی کی طرح تنہا سکھوں پر جا گرے۔ کچھ اور غازی بھی ان کے ساتھ ہو گئے اور اژدر کو چھڑا لانے۔ سکھوں نے دوبارہ حملہ کر دیا۔ غازی تعداد میں بہت کم تھے، چنانچہ گھوڑا بھی مارا گیا اور بعض غازیوں کے ساتھ محمد خاں بھی شہید کر دیے گئے۔ پھولڑہ کے گنج شہیداں میں دفن ہوئے۔

۴- ابراہیم خاں | یہ جنگ بالاکوٹ کے بعد کئی سال شیخ ولی محمد پھلتی کے ساتھ رہے۔ پھر غالباً انھیں کے ساتھ ٹونک آ گئے اور وہیں اقامت اختیار کر لی۔ نواب وزیر الدولہ مرحوم والی ٹونک کی والدہ حج کے لیے گئیں تو ابراہیم خاں بھی ساتھ تھے۔ اسی سفر میں وفات پائی۔

محمد خاں اور ارادت خاں | پانچویں بھائی محمد خاں اور چھٹے بھائی ارادت خاں دوران جہاد میں طبعی موت مرے۔

غور فرمائیے کہ ان چھ بھائیوں کی زندگی اور موت کس درجہ قابل رشک تھی۔ ان کے والد کا نام معلوم نہیں، جہاد میں برابر شریک رہتے۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہوئے۔

عبدالمجید خاں آفریدی | یہ جہان آباد راستے بریلی کے باشندے تھے۔ مجاہدین کی اس جماعت میں شریک ہو کر سرحد پہنچے جو سید صاحب کے ساتھ گئی تھی اور جسے مجاہدین کا ہراول سمجھنا چاہیے۔ وہاں سب سے پہلی جنگ اکوڑہ خٹک میں پیش آئی، جہاں بدھ سنگھ سندھیوں کا بھاری لشکر لیے بیٹھا تھا، جس کی تعداد سات ہزار سے دس ہزار تک بتائی جاتی تھی۔ سید صاحب نوشہرہ میں مقیم تھے۔ اس سے مقصود نوشہرہ شہر یا پرانا نوشہرہ ہے جو دریائے لنڈے کے مشرقی کنارے پر واقع ہے۔ نوشہرہ چھاؤنی مقصود نہیں جو مغربی کنارے پر ہے اور جہاں ریلوے سٹیشن ہے۔ چونکہ سکھوں کا لشکر بہت بڑا تھا، اس لیے شبخون مارنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس غرض کے لیے ہندوستانی غازیوں میں سے ایک سو چھتیس قوی اور توانا آدمی

منتخب کیے گئے۔ سات آٹھ سو سربدی غازی ساتھ ہو گئے۔ چونکہ جانے آنے میں پندرہ سولہ میل کا فاصلہ طے کرنا لازم تھا، اس لیے انھیں لوگوں کو منتخب کیا گیا جو بے تکلف اتنا فاصلہ طے کر سکتے تھے۔ عبدالمجید خاں ان دنوں بخار میں مبتلا رہنے کے باعث بہت کمزور ہو گئے تھے، اس لیے ان کا نام اس فہرست میں شامل نہ کیا گیا۔

نیکی میں سبقت: انھیں جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو بیتاب ہو کر سید صاحب کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا:

> حضرت! میں کچھ ایسا بیمار تو ہوں نہیں کہ چلنے کی طاقت نہ ہو، اور یہ پہلا معرکہ ہے جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی بنیاد رکھی جائے گی۔ میرا نام ضرور شامل فرما لیجیے کہ سبقت کی فضیلت سے محروم نہ رہ جاؤں۔

عبدالمجید خاں کی بیتابی دیکھ کر سید صاحب نے ان کی درخواست قبول کر لی اور دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ ہمت میں برکت دے۔

شہادت: جنگ اکوڑہ کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن یہ بتا دینا چاہیے کہ عبدالمجید خاں نقاہت کی کمزوری کے باوجود جنگ میں انتہائی مردانگی دکھائی۔ چودہ آدمی ان کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ بیچ میں ان کی تلوار ٹوٹ گئی۔ مولوی امیر الدین ولایتی کے پاس دو تلواریں تھیں، انھوں نے ایک تلوار عبدالمجید خاں کے حوالے کر دی۔ اس سے بھی کئی دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ منظورہ کے الفاظ میں: "از آں ہم چند کس را کشتند۔" پھر خود بھی جامِ شہادت نوش کر کے عند ربہم یرزقون کے انعام یافتہ گروہ میں شامل ہو گئے۔

چوبیسواں باب

شہزادہ گدڑی، انور شاہ، اکبر خاں

شہزادہ گدڑی: بیعت امامت جہاد کے بعد جو مخلصین سید صاحب کی خدمت میں پہنچے، ان میں سے ایک صاحب گدڑی شہزادہ کے لقب سے مشہور تھے۔ وقائع میں، انھیں "جلیل القدر پیرزادہ" بتایا گیا ہے۔ سید محمد خاں درانی سفیر نے اپنے ایک مکتوب میں انھیں "صاحبزادہ گودڑی" لکھا ہے۔ موصوف نے بیعت کی تو کہا: میں خالصۃً لوجہ اللہ حاضر ہوا ہوں۔ آج کے بعد آپ کا ساتھ چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

درانی سردار ملاقات اور مشوروں کے لیے آئے تو سید صاحب بھی ہنڈ سے پانسو آدمیوں کے ساتھ زشہرہ پہنچے۔ ساتھیوں میں فتح خاں رئیس پنجتار، اشرف خاں رئیس زیدہ اور خادے خاں رئیس ہنڈ کے علاوہ شہزادہ گدڑی بھی شامل تھے۔ سید صاحب ہنڈ واپس چلے گئے، لیکن گدڑی شہزادہ کو سردار یار محمد خاں نے روک لیا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شہزادہ درانی سرداروں کے نزدیک بہت ہی معزز و محترم تھا۔

شہادت: وہ شیدو کی جنگ میں شریک ہوا، جس میں کم و بیش ایک لاکھ آدمی سید صاحب کے زیر علم جمع تھے اور بظاہر یقین تھا کہ غازیوں کی یہ کثیر التعداد فوج سکھوں کو شکست فاش دے کر اٹک پر پیش قدمی کرے گی اور تطہیر پنجاب کا کام احسن طریق پر شروع ہو جائے گا۔ لیکن یار محمد خاں کی خیانت و غداری کے باعث یہ خوش گوار امید پوری نہ ہو سکی۔ وہ عین کامیابی کی حالت میں اپنی فوج لے کر میدان سے بھاگ گیا۔ اس کے بھائی بھی ساتھ ہی فرار ہو گئے۔ یہ حالت دیکھ کر عام سرحدی خوانین کے پائے ثبات میں بھی لغزش پیدا ہو گئی۔ صرف چند مخلص خوانین، ہندوستانی غازی اور شہزادہ گدڑی چٹان کی طرح اپنی جگہ جمے رہے۔ شہزادہ گدڑی کا مورچہ شیدو گاؤں میں تھا۔ وہ اپنا جیش لے کر سکھ لشکر گاہ کے قریب پہنچا اور قلعہ بندی سے گزر کر اندر داخل ہو گیا۔ پیچھے فرار کا نقشہ دیکھا تو حیران رہ گیا۔ حالتِ جنگ میں

معلوم نہ ہو سکتا تھا کہ کیا صورت پیش آئی۔ سکھوں نے اس پر ہجوم کیا تو قدم بہ قدم پیچھے ہٹنے لگا۔ پہلے اپنے گاؤں والے مورچے پر پہنچا۔ سکھوں کا ہجوم بہت بڑھ گیا تو اور پیچھے ہٹ کر قبرستان میں مورچہ قائم کر لیا۔ وہیں خونِ شہادت میں تیرتا ہوا مالکِ حقیقی کے دربار میں پہنچ گیا۔

منظورہ کا بیان | یاد ہوگا، ڈیڑھ دو مہینے پیشتر سید صاحب کی بیعت کرتے ہوئے عہد کیا تھا کہ آپ کو چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ شیدو کے میدان میں اس صادق العہد نے اپنے پیمان پر خونِ شہادت سے مہر لگا دی۔ "منظورہ" کا بیان ہے کہ برستا رہا شجاعت سے کام لیتے ہوئے بہت سے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ اپنی جماعت کے ساتھ جو استقامت میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی حیثیت رکھتی تھی، قدم جما کر دادِ شجاعت دی اور جنت لے کر جان جاں آفریں کے حوالے کی۔

پرانا شیدو موجودہ آبادی سے تھوڑے فاصلے پر دریا کے عین کنارے واقع تھا۔ طغیانی میں وہ منہدم ہو گیا۔ اب صرف کھنڈر باقی ہیں۔ وہیں شہزادہ گنڈی کی قبر ہے۔ شیدو کے تمام لوگ اس غیور مجاہد کے نام سے واقف ہیں اور اسے خاص احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔

سید انور شاہ | سید انور شاہ امرتسر کے سادات کرام میں سے تھے۔ سنا جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ کے دربار میں بھی انہیں احترام کا درجہ خاص حاصل تھا۔ سکھ امراء اور عوام بھی ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ سکھوں کے کسی مذہبی پیشوا کا ایک عزیز ان کے پاس آتا جاتا تھا۔ اس نے مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی۔ سید انور شاہ نے بے تکلف اسے کلمہ پڑھا دیا۔ اس وجہ سے تمام سکھ ان کے دشمن بن گئے۔ نو مسلم کے رشتہ داروں نے ہنگامہ برپا کر دیا۔ "منظورہ" کے اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے سید انور شاہ کی ناک کاٹ دی۔ "منظورہ" کے الفاظ یہ ہیں: "کہ حسن چہرۂ زیبائش بہ نقصان مرتب تغیر ساختند"۔ اس واقعے کے بعد سکھ حکومت نے انہیں گھر ہی میں نظر بند کر دیا اور وہ اس مصیبت سے نجات پا کر سکھ حکومت کے خلاف جہاد کرانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

بلاوا | سید صاحب تکیہ شریف میں جہاد کی تیاریاں کر رہے تھے تو ہندوستان کے گوشے گوشے سے ان تمام افراد کے متعلق اطلاعیں حاصل کرنے کا انتظام کر رکھا تھا جن سے جہاد میں امداد کی امید ہو سکتی

تھی۔ اس سلسلے میں سید انور شاہ کے حالات بھی معلوم ہو گئے۔ قرینہ یہ ہے کہ سید صاحب نے ان سے
رابطہ و علاقہ بھی پیدا کر لیا تھا۔ چنانچہ راہ ہجرت میں قدم رکھا تو شیخ پورے سے حاجی یوسف کشمیری کو امرت سر
روانہ فرمایا کہ سید انور شاہ کو ہر ممکن تدبیر سے ساتھ لے کر سندھ تک پہنچا دیا جائے۔

ہجرت: حاجی یوسف امرت سر پہنچا تو سید انور شاہ کے نکلنے کا ایک نہایت سازگار سامان ہو گیا۔ جو انگریز افسر
ان کی نگرانی پر مامور تھا، وہ کسی بات پر ناراض ہو کر نگرانی کا کام چھوڑ بیٹھا۔ دوسرا آدمی اس کی جگہ مقرر نہ
ہوا تھا۔ سید انور شاہ نے فرصت کو غنیمت سمجھا۔ اپنے پندرہ خادموں کو تین گھوڑے اور بار برداری
کے اونٹ دے کر الگ الگ خفیہ بھیج دیئے۔ پھر خود چپ چاپ نکلے اور بہاولپور کی سرحد میں داخل
ہو گئے۔ وہاں ان کی ملاقات سید دین محمد قندھاری سے ہوئی۔ انھیں سید صاحب نے چند خطوط نامہ
دے کر نواب بہاول خاں کے پاس بھیجا تھا۔ سید صاحب نے پہلے شکار پور میں ان کا انتظار کیا۔ پھر انہیں
کو دس غازیوں کے ساتھ سید انور شاہ کے استقبال کے لیے شکار پور میں چھوڑا اور خود جاگن چلے گئے۔ وہیں
سید انور شاہ سید صاحب سے ملحق ہوئے۔ محمد یوسف راستے ہی میں کسی بات پر ناراض ہو کر الگ ہو گیا تھا۔

جنگ بازار: سید انور شاہ بڑے عقیل و فہیم اور تجربہ کار شخص تھے۔ اس لیے مشوروں میں برابر شریک
رہے ہوں گے، لیکن ان کی سرگرمیوں کی تفصیلات کہیں نہیں ملتیں۔ جن دنوں سید صاحب ہنڈ میں ٹھہرے
ہوئے تھے، ملکی لوگوں نے بطور خود حضرو پر شب خون مارا تھا۔ وہ مال غنیمت لے کر واپس آ رہے تھے کہ سکھوں
نے حملہ کر دیا۔ ان کے بچاؤ کے لیے سید صاحب کو بھی نکلنا پڑا۔ چنانچہ آپ نے سید انور شاہ کو پچاس ساٹھ
آدمیوں کے ساتھ دریا کے پار بھیج دیا تاکہ حملہ آوروں کا مقابلہ کریں۔

سید انور شاہ نے کشتی کے ذریعے سے دریا عبور کیا اور مناسب مقام پر مورچے بنا کر لڑنے لگے۔ آخر
سکھ بھاگ نکلے۔ ہنڈ کی طرف سے کشتیاں بھیج دی گئیں۔ تمام لوگ ان میں سوار ہو کر آ گئے۔ سید انور شاہ
صبح کے وقت گئے تھے۔ تمام ساتھیوں کو اپنے سامنے کشتیوں میں سوار کرا کے سب کے بعد خود سوار ہوئے
اور مغرب کے وقت ہنڈ پہنچے۔

مراجعت: اس واقعے کے بعد سید انور شاہ کا ذکر کہیں نہیں آیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ واپس آ گئے تھے

اس کے لیے انھوں نے کیا تدبیر کی؟ اس کا کچھ علم نہیں۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد جو غازی مسافرانہ
کے بھیس میں واپس آئے، ان میں سے بعض کے بیانات میں مرقوم ہے کہ امرت سر میں سید اولاد شاہ نے
ان کی تواضع میں کوئی دقیقہ سعی اٹھا نہ رکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ با اطمینان اپنے وطن میں مقیم ہو
گئے تھے۔

اکبر خان رائے بریلی وطن، فنونِ جنگ میں مشاق تھا۔ شہر میں غازیوں سے قواعد اور نشانہ بازی
کی مشق کرانے کا حکم جاری ہوا تھا تو اکبر خان ان لوگوں میں شریک تھا جو مختلف فنونِ جنگ سکھانے کے
ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے۔ ملیح آباد کے ایک غازی رسول خان نے اپنے نوعمر بھتیجے کو تربیت کی غرض
سے اکبر خان کے حوالے کر دیا تھا۔ وہاں مختلف لوگ سید صاحب کے لیے مٹھائیاں بطور نذرانہ لاتے تھے۔
بچے نے ان میں سے دو لڈو اجازت کے بغیر کھا لیے۔ اکبر خان نے تادیباً ایک تھپڑ مارا۔ رسول خان نے
یہ واقعہ سنا تو سخت جوش میں آ گیا اور اکبر خان کو بہت سخت سست کہا۔ سید صاحب کو یہ حالات
معلوم ہوئے تو رسول خان کو بلا کر خاطر داری سے پاس بٹھایا، مزاج پوچھا، پھر شفقت بھرے انداز میں کہا:
ہم نے سنا ہے کہ اکبر خان نے آپ کے بھتیجے کو دھول ماری، سو آپ کو اس کا بڑا رنج ہوا۔ یہ بات اچھی
نہ تھی۔ انھوں نے اپنا لڑکا سمجھ کر تعلیماً مارا ہوگا۔

رسول خان کا غصہ تو پہلے ہی فرو ہو چکا تھا۔ سید صاحب کا ارشاد سن کر عرض کیا کہ اکبر خان میرے
بھائی ہیں، بھتیجے کو مارا تو خوب کیا۔

اکوڑہ اور بالاکوٹ اکبر خان اکوڑہ کی جنگ میں شریک تھا اور اس میں تلوار کا ایک زخم کھایا تھا۔ اسی نے
مجاہدین کو یہ کہہ کر جنگ سے روکا تھا کہ آخری فیصلہ اسی میدان میں نہ ہوگا۔ اب واپس چلو، ان شاء اللہ پھر
لڑیں گے۔ سید صاحب نے اسے ایک مستقل [illegible] کی تھی۔ جب سید صاحب بالاکوٹ کے قریب موضع
بازار میں ٹھہرے ہوئے تھے اور ملکی لوگوں نے مخبری پر چھاپا مارا تھا تو سکھوں کے جوابی حملے نے غیروں کے
لیے شدید خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ اس موقع پر سید صاحب نے چند غازیوں کو دفاع کا حکم دیا۔ بعض لوگ
اشتعال پر سوار ہو کر دریا عبور کر کے دوسری جانب کنارے پر پہنچ گئے کہ سکھوں سے دست بدست جنگ

پچیسواں باب

اللہ بخش، امیر اللہ، کالے خاں

اللہ بخش مورانی: سید صاحب نے جب پہلی مرتبہ کان پور کا دورہ کیا تو چار چھیلے اور تندرست جوان بیعت کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے دیکھتے ہی فرمایا: ایسے جوان تو ہمارے کام کے ہیں، یہ پیرزادے کیا کام دیں گے؟ ان میں سے ایک کا نام اللہ بخش خاں تھا، دوسرے کا شمشیر خاں، تیسرے کا شیخ رمضان، چوتھے کا مہربان خاں۔ یہ چاروں آپس میں گہرے دوست تھے۔ اکٹھے مرید ہوئے۔ پھر سید صاحب کا ساتھ نہ چھوڑا۔

سید صاحب کی معیت: سید صاحب مجاہدین کی پہلی جماعت لے کر نکلے تو چاروں ساتھ تھے۔ مہربان خاں سے سید صاحب نے فرمایا تھا کہ آپ سے اللہ تعالیٰ ایک کام لے گا، آپ کے ان بھائیوں سے دوسرا کام لے گا۔ چنانچہ مہربان خاں کو سید صاحب نے اپنی ازواج کے ساتھ پہرے داری کے لیے مقرر کر دیا۔ ان کا وقت سندھ میں بسر ہوا۔ وہاں سے ازواج ٹونک آئیں تو وہ بھی ساتھ آئے، آخر عمر تک جب تک وقائع احمدی کی ترتیب جاری تھی، وہ زندہ تھے۔

ساقۃ الجیش کے امیر: سید صاحب نے جب مجاہدین کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا تو ہر جماعت کے لیے ایک ایک امیر مقرر فرما دیا۔ ساقۃ الجیش کے امیر اللہ بخش مقرر ہوئے۔ یہ لشکر کے سامان کی گاڑیوں اور چھکڑوں کے ساتھ چلتے تھے، جو ہمیشہ سب سے پیچھے روانہ ہوتے اور سب سے آخر میں منزل پر پہنچتے۔ ان کے دونوں دوست یعنی شمشیر خاں اور شیخ رمضان بھی انھیں کی جماعت میں شامل تھے۔

پہلے جنگی جیش کے سالار اعظم: اکوڑہ میں سکھوں پر شبخون کا فیصلہ ہوا تو اللہ بخش خاں کو غازیوں کے لشکر کا سالار مقرر فرمایا۔ یہ نہایت درجہ قابل رشک شرف تھا جو اس مجاہد کے حصے میں آیا کہ اس سرزمین

میں اسلام کی فرمانروائی بحال کرنے کے لیے مجاہدات کا جو سلسلہ شروع ہوا۔ اس میں پہلے معرکے کی سرعسکری کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا۔

سید صاحب نے فیصلہ فرماتے ہی اللہ بخش خاں کو حکم دے دیا کہ آپ دریا کے مغربی کنارے پر چلے جائیں۔ غازی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔ عشا کے وقت تک تمام مجاہدین پہنچ گئے تو اللہ بخش خاں چند رفیقوں کے ساتھ کشتی میں سوار ہو کر سید صاحب سے رخصتی ملاقات کے لیے گئے۔ آپ نے معمول کے مطابق برہنہ سر ہو کر انتہائی عجز و الحاح سے دعا کی۔

شہادت شبخون غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ اللہ بخش خاں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے تاکہ ساتھیوں کو لے کر لشکرگاہ سے نکل جائیں۔ راستے میں شیخ ہمدانی اور علی حسن خاں ایک جگہ کھڑے بندوقیں چلا رہے تھے۔ انھوں نے جوشِ تہور میں اللہ بخش خاں کو مخاطب کر کے کہا کہ امیر المومنین نے آپ کو ہمارا سردار بنا کر بھیجا ہے، دشمن کے مقابلے میں پیچھے کیوں ہٹتے جا رہے ہیں؟ یہ آوازہ حقیقت کے بھی خلاف تھا اور اسے شبخون کے مفہوم سے بھی کوئی مناسبت نہ تھی۔ اللہ بخش خاں کو گوارا نہ ہوا کہ جس جیش کا سردار بنا کر انھیں بھیجا گیا تھا، اس کے چھوٹے سے حصے کو بھی پیچھے چھوڑ کر نکل جائیں۔ چنانچہ فوراً مراجعت کا خیال چھوڑ کر باقاعدہ جنگ شروع کر دی اور اپنی جماعت سے پچاس ساٹھ کا لشکر کو مارتے مارتے بہت پیچھے ہٹا دیا۔ اسی حالت میں خود بھی شہید ہو گئے اور ان کے دو جگری دوست شمشیر خاں اور شیخ وشان بھی خلعتِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

پیر خاں اللہ بخش خاں کی شہادت کے بعد ان کے جیش کے سرعسکر پیر خاں بنائے گئے جو مشکی خاں کے بھائی تھے۔ یہ بارہا سید صاحب کے ساتھ رہے اور نہایت اہم خدمات انجام دیں۔ اہل سمہ کی سازش کے وقت یہ پکھلی میں مقیم تھے۔ حکم پہنچنے پر پکھلی سے پنجتار روانہ ہوئے۔ بیس پچیس مجاہد ساتھ تھے۔ مینی پہنچے تو رات وہیں بسر کرنے کی غرض سے مسجد میں ٹھہر گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں بدسازشیوں نے ان کا محاصرہ کر لیا اور مسجد کو آگ لگا دینے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ آخر یہ مجاہد باہر نکلے اور ان پر ہر طرف سے تیروں، نیزوں اور تلواروں کی بارش ہونے لگی۔ ان میں سے دو پہلے اس مکان میں

چلے گئے تھے، جس میں غلے کا گودام تھا۔ باقی میں سے صرف آٹھ بچے اور سب شہید ہو گئے۔ انہی میں پیر خان بھی تھے۔ راویوں نے لکھا ہے کہ وہ سپہ گری کے فن میں بڑے ہی چست و چالاک تھے۔

شیخ امیر اللہ شیخ صاحب تھانہ بھون کے باشندے تھے اور بڑے شجاع و دلیر۔ پہلی جماعت میں شریک ہو کر سرحد پہنچے۔ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن ضرورت کے وقت وعظ بھی کر لیتے تھے۔ جب مولوی محبوب علی صاحب دہلوی کی وجہ سے جماعت میں افتراق کا فتنہ پیدا ہوا اور مولوی صاحب نے مختلف غازیوں سے یہ کہنا شروع کیا کہ گھر واپس چلو، تم پر اقربا کے بھی حقوق ہیں، یہاں رہ کر ان کے اتلاف کا وبال اپنی گردن پر نہ لو تو شیخ امیر اللہ تھانوی نے سید صاحب سے درخواست کی کہ میں بھی اس موقع پر ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں۔ سید صاحب نے اجازت دے دی۔ انھوں نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا:

> مسلمانو! یہ مقام جہاد ہے۔ جو مسلمان اعلاء کلمۃ الحق کی نیت سے اس طرف قدم اٹھا کے اس کا ہر قدم جنت کی طرف ہوگا۔ جو یہاں سے جائے اس کا ہر قدم دوزخ کی جانب ہوگا۔ مولوی محبوب علی صاحب اس طرف آئے تو رو بہ جنت تھے۔ اب سنتا ہوں وہ واپس جا رہے ہیں۔ جو ان کے ساتھ جائے گا وہ رو بہ دوزخ ہوگا۔ اس دعوے کی دلیل آپ مولوی صاحبان سے پوچھ لیں۔

بیٹے کو خط ایک مرتبہ فرمایا کہ میں اپنے بیٹے کو خط لکھنا چاہتا ہوں لیکن منشی ایسا ہونا چاہیے جو میرا مطلب موزوں الفاظ میں پیش کر سکے اور عبارت آرائی نہ کرے۔ چنانچہ مولوی جعفر علی نقوی نے خط لکھا۔ مضمون یہ تھا کہ فلاں جنس بیچ ڈالو، اس کی قیمت میں سے آدھی رقم بچوں کی والدہ کے حوالے کر دو تاکہ اسے کھانے پینے کی تکلیف نہ ہو۔ باقی رقم لے کر یہاں آ جاؤ۔ اگر اس حکم کی تعمیل میں تساہل ہوا تو لشکر اسلام کی آمد کے وقت تم سے سخت مواخذہ ہوگا:

در تخلف ایں امر وقت۔ سیدان — اس حکم کی خلاف ورزی ہوئی تو لشکر
لشکر اسلام بحول اللہ و قوتہ آنچہ سزائے — اسلام کے پہنچنے پر اس کی جو سزا ہوگی وہ
ہیں تخلف برائے شما خواہد بود واں ہرگز ہرگز — نہ چھوڑی جائے گی اور اس میں کمی نہ کی جائے گی

جنگ ہوئی تو آپ کو گھوڑا دوں گا۔

مایار کی جنگ میں سید صاحب نے عبداللہ والیا کا گھوڑا کالے خاں کو دے دیا۔ خان نے رکاب میں پاؤں رکھا تو کہا: ضرورت کے وقت اپنا سر دشمن کی توپ کے منہ میں دے دوں گا۔ جنگ کے دن غازی تورو سے نکل کر چھلی پانی کو عبور کر کے مایار کی طرف بڑھے تو کالے خاں گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھے۔ درانی توپوں کے گولے پے بہ پے آ رہے تھے۔ علاقہ میدانی تھا۔ چھپنے یا مورچہ بنانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اسی اثنا میں ایک گولہ آیا اور کالے خاں سے تھوڑے فاصلے پر گرا۔ پھر اچھلا اور سیدھا اس غازی کے پہلو میں لگا۔ ان کے متعدد زخم آئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ انھیں اٹھا کر گاؤں میں پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ تیماردار انھیں مسجد کے حجرے میں لے گئے۔

گولہ لگنے کے وقت ہی سے ان پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ چپ چاپ لیٹے تھے بولتے تو صرف یہ پوچھتے: بھائیو! لڑائی کا کیا حال ہے؟ درانیوں کے پہلے اور دوسرے حملے کے دوران میں انھیں بتایا گیا کہ جنگ جاری ہے اور فریقین ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہیں۔ وہ سن کر آہستہ آہستہ اللہ اللہ کہتے رہے۔ جب درانی شکست کھا کر میدان چھوڑ گئے تو تیمارداروں نے بتایا: بھائی کالے خاں! اللہ تعالیٰ نے حضرت کو فتحیاب کیا۔ یہ بشارت سنتے ہی کالے خاں نے کہا: الحمد للہ۔ ساتھ ہی دم نکل گیا۔ کتنی قابل رشک زندگی تھی، جس میں آخری سانس تک زبان پر خدا کا ذکر تھا۔ دل میں بس اس کے سوا کوئی آرزو نہ تھی کہ راہ حق کے غازی فتح پائیں۔ کتنی قابل رشک موت تھی کہ دم رضائے خدا میں پورا ہوا۔

سید صاحب کی شان تربیت

راویوں نے بیان کیا ہے کہ شروع میں ٹھوڑی منڈاتے تھے۔ سید صاحب نے کبھی نہ ٹوکا اور عادت شریف یہی تھی کہ بار بار ٹوکتے نہ تھے۔ حد درجہ حسن تربیت سے لوگوں کو پابند شریعت بناتے تھے۔ ایک روز کالے خاں نے ٹھوڑی منڈائی۔ اتفاق سے سید صاحب آ گئے اور ٹھوڑی دست مبارک سے پکڑ کر فرمایا: "خان بھائی! آپ کی ٹھوڑی کیا چکنی چکنی ہے۔" کالے خاں چپ رہے۔ معمول کے مطابق آٹھویں دن حجام خط بنانے کے لیے آیا تو اسے لوٹا دیا کہ میری ٹھوڑی کو حضرت کا ہاتھ لگ چکا ہے، اب تیرا ہاتھ نہ لگنا چاہیے۔

چھبیسواں باب

حسن علی، احمد بیگ، نوردادخاں

شیخ حسن علی کا خاندان: شیخ حسن علی کا وطن کیما تھا جو جہان آباد (یو۔پی) سے تین کوس پر ہے۔ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن طبیعت میں دین داری کا خاص جوہر درخشاں تھا۔ نواب وزیر الدولہ نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کسی پختہ کار عالم سے نماز پنج گانہ کی کیفیت سنی اور اُس کے پابند ہو گئے۔ بعد ازاں اُس عالم کو بھی پابند نماز بنا دیا۔ شرک و بدعات کے رد میں بہت سرگرم تھے۔ لوگوں نے ان کی سرگرمی کو کیفیت جنون پر محمول کیا۔ دورۂ تبلیغ میں جب سید صاحب ایک بار تبلیغ و دعا کرتے ہوئے ان کے گاؤں پہنچے تو ان کی حالت کا شہرہ سن کر دیکھنے کے لیے گئے۔ شیخ حسن علی نے بیعت کی اور رد بدعات میں شمشیر برہنہ بن گئے۔

حج اور ہجرت: سید صاحب حج کے سفر پر نکلے تو شیخ حسن علی ان کے استقبال کے لیے گنگا پہنچ گئے اور اپنے ساتھ گاؤں لے گئے۔ اس مقام پر سید صاحب تین روز ٹھہرے رہے۔ اس اثنا میں دعوتوں کا پورا انتظام شیخ حسن علی نے کیا۔ پھر اپنے پانچوں بھائیوں اور بھتیجے کی سعادت کو لے کر حج کے لیے ساتھ ہو گئے۔ بھائیوں کے نام یہ ہیں: شیخ عبدالعزیز، شیخ عبدالرحمن، شیخ عبدالباقی، شیخ عبدالصمد اور حاجی پیر محمد۔ ایک بھتیجے کو ساتھ لیا جس کا نام عبدالقادر تھا۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کس کے فرزند تھے۔ شیخ صاحب کی ایک بیٹی بھی جو سفر حج میں بمقام مرزا پور بہ عارضۂ ہیضہ فوت ہوئی۔ حج سے واپسی کے بعد سید صاحب ہی کے ساتھ رہے۔ ساتھ ہی ہجرت کر کے سرحد گئے۔ سید صاحب ان سے عموماً بائیں خدمت کا کام لیتے تھے۔ دو بھائی حاجی پیر محمد اور شیخ عبدالصمد سید صاحب کے اہل خانہ کے ساتھ سندھ میں رہے اور وہیں فوت ہوئے۔ باقی سید صاحب کے ساتھ جہاد میں شریک رہے۔ شیخ حسن علی، وقائع زنی پر شبخون میں شریک تھے۔ رات کے وقت راستہ بھول جانے کے باعث مجاہدین کو سخت تکلیفوں سے سابقہ پڑا

پانی نہ ملا اور بعض غازی حد درجہ پریشان ہو گئے۔ بڑی مشکل سے پانی پر پہنچے۔ اس سفر میں شیخ حسن علی کا پتہ دیر تک نہ ملا اور سید صاحب نے سواروں کو تلاش کے لیے بھیجے۔ اس طرح وہ بھی خیر و عافیت لشکر میں واپس آ گئے۔

سازش کی خبر: جس زمانے میں سلطان محمد خان درانی بعض دوسرے خوانین کے ساتھ سید صاحب کے قتل کی سازش میں مصروف تھے۔ شیخ حسن علی اور ان کا پورا خاندان سید صاحب کے حکم سے دو آبہ میں مقیم تھا جو پنجتار سے قریب ایک پر فضا مقام ہے۔ وہاں سید صاحب کے بھانجے سید نور علی کے صاحبزادے سید موسیٰ بھی شیخ حسن علی کے ہمراہ تھے۔ اور سید صاحب کی اہلیہ بھی وہیں مقیم تھیں۔ سازش کی ابتدائی خبر شیخ حسن علی کو دن ڈھلے ہی سمجھ کے اور سید جعفر سے معلوم ہوئی تھی۔ اور شیخ نے اپنے بھائی کے ہاتھ یہ پیغام پنجتار بھیج دیا تھا۔ لیکن سید صاحب نے فرمایا کہ یہ خبر صحیح معلوم نہیں ہوتی۔ شیخ حسن علی نے سید جعفر کے اصرار پر دوبارہ پیغام بھیجا لیکن سید صاحب کو صحت کا یقین نہ آیا۔

سید صاحب راج دواری سے پکھلی گئے تو شیخ حسن علی اور ان کے خاندان کو بعض دوسرے اصحاب کے ساتھ بی بی صاحبہ اور دیگر خواتین کی حفاظت کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ واقعہ بالاکوٹ کے بعد شیخ حسن علی نے ہندوستان واپس آنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم تو اپنے اللہ سے عہد کر چکے ہیں باقی عمر جہاد ہی میں صرف کریں گے۔ کابل و قندھار و سندھ و عرب میں امام کی تلاش کریں گے جب ملے گا یہ فرض بجا لائیں گے۔

ٹونک میں سکونت: چند سال انھوں نے سرحد میں گزارے، پھر ٹونک آ رہے۔ دو بھائی بھی ساتھ تھے۔ نواب وزیر الدولہ نے معقول وظیفہ مقرر کرنا چاہا، یہ راضی نہ ہوئے۔ بہت قلیل ضروریات کا حساب لگایا۔ اور فرمایا کہ بس یہ تھوڑی سی رقم مل جائے تو گزارہ ہوتا رہے گا۔ علماء سے پوچھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرے کے مطابق ایک مکان بنوا لیا تھا۔ اسی پر قانع رہے۔ اس میں ایک بانس باہر نکلا ہوا تھا۔ اتفاق سے ایک مرتبہ وہ بانس ان کی آنکھ میں گھس گیا اور ڈھیلے کو گزند پہنچا۔ لوگوں نے علاج کے لیے کہا۔ بولے جس نے یہ حال کیا ہے وہی علاج بھی کرے گا۔ چنانچہ بغیر علاج کے تھوڑے دن کی تکلیف کے بعد اچھی ہو گئی۔

آدمیوں کو لے کر کاٹ لنگ پہنچ جائیں، وہاں ان کے واجبات ادا کر دیے جائیں گے۔

میاں دین محمد ہندوستان سے واپس آئے تو انھوں نے اس تجویز سے اختلاف کرتے ہوئے عرض کیا کہ ابھی کوئی علاقہ قبضے میں نہیں آیا۔ ان لوگوں کو تنخواہ کہاں سے دی جائے گی؟ پھر حقیقتاً جو روپیہ اب تک ان کا واجب الادا ہو چکا ہے، اس میں ہندوستانی غازیوں سات آٹھ مہینے گزر سکتے تھے۔ چنانچہ غور و مشورہ کے بعد قرار پایا کہ تنخواہ دار غازیوں کی تنخواہ ادا کر دی جائے اور انھیں جواب دے دیا جائے۔ سید صاحب نے منشی خواجہ محمد اور منشی محمدی کو حکم دے دیا کہ پوری تنخواہ ادا کر کے آدمیوں سے کہو ہماری بات سن کر جائیں۔

دعوت و ارشاد

وہ لوگ سید صاحب کی خدمت میں پہنچے تو آپ نے ان کے روبرو فضائل جہاد پر ایک پرتاثیر تقریر فرمائی۔ ارشاد ہوا کہ جو لوگ نوکر ہو کر جہاد کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی مارا جاتا ہے تو وہ بھی شہید ہوتا ہے مگر کم درجے کا۔ خالصاً لوجہ اللہ جہاد کرنے والوں کے درجۂ شہادت کو کوئی نہیں پہنچتا۔

ہمارے بھائی گھروں سے کھاتے پیتے اور خوش حال تھے۔ کئی منشی قرار نوکریاں ترک کر کے آئے، کسی نے جاگیر، زراعت یا تجارت چھوڑی۔ اللہ کے واسطے ہمارے ساتھ رہتے اور فقر و فاقہ سہتے ہیں۔ خوش و خرم رہتے، بھوک اور مصائب پر قناعت کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ صاحبان بھی رہیں۔ جو کچھ ہمارے لوگ کھائیں پہنیں وہ آپ بھی کھائیں پہنیں۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم کو کچھ اور کسی طرح کی فراغت دے گا، ہم آپ لوگوں کو سوا اس کے کچھ اور بھی دیں گے، ورنہ آپ کو نوکری سے زیادہ پڑے گا۔ مگر اس کا قرار نہیں کرتے کہ کل کو کوئی دعویٰ کرے۔

احمد بیگ کی بیعت

یہ سنتے ہی میرزا احمد بیگ بولے: میں حاضر ہوں اور آپ کے ساتھ رہوں گا۔ تیس چالیس اور لوگ بھی تیار ہو گئے۔ باقی چند روز کے بعد اپنے گھروں کو چلے گئے۔ اس جماعت کے امیر میرزا احمد بیگ ہی مقرر ہوئے۔

انہی میں سے ایک جماعت نے ہنڈ میں سلطان محمد خاں درانی کا مقابلہ کیا تھا۔ پھر ایک فرنگی نے انھیں بہ عزت باہر نکلنے کے وعدے پر لڑائی ختم کرائی۔ سلطان محمد خاں نے عہد شکنی کی اور انھیں قید کر لیا۔

۱؎ [illegible]

چارسدہ میں ایک مکان کو نقب لگا کر وہ باہر نکلے اور آزاد ہو کر سید صاحب کی خدمت میں پہنچ گئے۔

میرزا کی شہادت

میرزا احمد بیگ تمام لڑائیوں میں شریک رہے۔ جنگ بالاکوٹ میں وہ اس مقام پر متعین تھے جہاں سے بالاکوٹ کا پرانا پہاڑی راستہ نکلتا تھا۔ سوء اتفاق سے سکھوں نے یہی راستہ اختیار کیا اور سب سے پہلے میرزا احمد بیگ ہی کی فوج سے مڈبھیڑ ہوئی۔ میرزا بڑی مردانگی سے لڑے اور سید صاحب کو خبر بھی بھیج دی لیکن کمک پہنچنے سے پیشتر سکھ فوج کے سیل نے میرزا کی چھوٹی سی جماعت کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے مٹی کوٹ کے ٹیلے پر پہنچا دیا تھا۔ میرزا کے کچھ ساتھی چشمے کے پاس شہید ہوئے اور غالباً وہیں دفن ہوئے۔ اس مقام کو آج کل شہید گی کہتے ہیں۔

اس کے بعد میرزا کو بالاکوٹ بلا لیا گیا۔ وہ خود اور ان کے بقیۃ السیف ساتھیوں میں سے غالباً اکثر بالاکوٹ ہی میں شہید ہوئے۔ میرزا صاحب کی شہادت کی کیفیت یوں بیان کی گئی ہے: جب اثنائے جنگ میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ سید صاحب کا کچھ پتہ نہیں چلتا تو میرزا صاحب سر پیٹتے ہوئے دیوانہ وار میدان میں پھرنے لگے۔ اسی حالت میں خلعت شہادت سے سرفراز ہوئے۔

نوردادخاں

یہ ماسے ہری کا باشندہ تھا اور وہاں کے زمینداروں میں شمار ہوتا تھا۔ اس کی بیعت کا واقعہ بڑا ہی عجیب ہے۔ سید صاحب راجپوتانہ اور دہلی میں کئی سال گزار کر وطن پہنچے تو جو عزیز ان کے حصے کی جائداد سے فائدہ اٹھاتے رہے تھے، انھوں نے بطیب خاطر اپنے حصے کی زمینیں اور باغات ایک سال کے لیے سید صاحب کے حوالے کر دیے تاکہ ان کا حق ادا ہو جائے۔ سید صاحب نے خربوزے کاشت کرائے۔ اتفاق سے ایک روز ماسے ہری کے ایک پٹھان نوردادخاں کی گائے باڑے میں گھس آئی۔ نگہبانوں نے گائے کو باڑے سے ہانک کر باہر نکال دیا اور اتنا جھٹکایا کہ اس میں چلنے کی سکت نہ رہی۔ نوردادخاں نے یہ واقعہ سنا تو اس درجہ جوش میں آ گیا کہ سید صاحب کے پاس پہنچ کر شکایت کی۔ اس کا لہجہ اتنا درشت تھا کہ نیاز مند سخت غصے میں آ گئے۔ تاہم سید صاحب پیکر حلم بنے رہے اور فرمایا: نگہبانوں نے بہت برا کیا۔ میں انھیں منع کر دوں گا۔ بھائی صاحب! خفگی چھوڑیے۔ گائے کو کچھ نقصان پہنچا تو اس سے بہتر گائے معاوضے میں دلا دوں گا۔

واقعۂ بیعت — پیر داد خاں کا غصہ فرو نہ ہوا۔ سید صاحب کے پاس ایک نو برس کا [illegible]
ایک خربوزہ آیا ہوا تھا۔ آپ نے خربوزہ پیر داد خاں کو دینا چاہا۔ اس نے غصے میں انکار کر دیا۔ سید عبدالرحمٰن
(خواہر زادہ سید صاحب) کہتے ہیں: میں کوئی چیز لانے کے لیے گھر گیا ہوا تھا۔ واپس آیا تو دیکھا کہ
غلام رسول خاں جو سید صاحب کے گھوڑوں کی خبر گیری کرتا تھا، رو رہا ہے۔ میں نے پوچھا کیا ہوا؟ اس نے
سارا قصہ سنایا اور بولا کہ مجھ سے پیر داد خاں کی سخت کلامی برداشت نہ ہو سکی اور اسے تنبیہ کرنے کے لیے
آگے بڑھا۔ حضرت نے مجھے جھڑک کر پیچھے ہٹا دیا۔ رائے بریلی کے ایک صاحب شیخ امان اللہ بھی سید صاحب
کے پاس بیٹھے تھے۔ وہ کبیر السن ہونے کی وجہ سے بہت محترم مانے جاتے تھے۔ انھوں نے بھی نرمی سے پیر داد خاں کو
سمجھایا لیکن اس کی روش نہ بدلی۔ خاندان کے آدمیوں میں سے سید علم الہدیٰ اور سید محی الدین یہ حالات دیکھ کر غصے
میں آ گئے اور بولے کہ ہم پیر داد خاں سے سمجھیں گے۔ سید صاحب نے فرمایا: چپ رہیے اور کچھ نہ کہیے۔ ایسا نہ ہو
کہ پیر داد خاں جمعہ اور جماعت چھوڑ دے۔ سید عبدالرحمٰن نے کہ پیر داد خاں جا چکا تھا۔ وہ جوش میں بولے کہ
پیر داد خاں بے ادبی کر کے سلامت چلا گیا۔ میں ہوتا تو دیکھتا۔ سید صاحب نے فرمایا: تو بچہ ہے۔ تجھے کیا
معلوم؟ ایسا نہ ہو کہ تیری کسی حرکت کے باعث پیر داد خاں کا جمعہ اور جماعت فوت ہو جائے۔

سید صاحب تکیہ شریف سے روزانہ اپنی ہمشیرہ کی ملاقات کے لیے شہر جایا کرتے تھے۔ دوسرے
دن گئے تو ہمشیرہ سے ملنے کے بعد پیر داد خاں کے دروازے پر جا کھڑے ہوئے۔ وہ سید صاحب کو دیکھتے ہی ننگے
سر چلا آیا۔ آپ گھوڑے سے اتر کر دروازے پر بیٹھ گئے اور فرمایا: خاں صاحب! آج تو خطا معاف کرائے بغیر واپس نہ
جاؤں گا۔ اس اثنا میں چند آدمی جمع ہو گئے۔ وہ پیر داد خاں کو ملامت کرتے ہوئے سید صاحب کے پاس لائے۔ آپ نے معانقہ
کیا اور کہا: خاں صاحب! خطا معاف کر دیجیے۔ آپ کی گائے مر جاتی تو اس سے بہتر گائے خدمت میں پیش کر دیتا۔

شہادت — پیر داد خاں کا معاملہ تو ختم ہو گیا۔ اس کے بھائی نور داد خاں نے سید صاحب کا حلم و انکسار اور
پیر داد خاں کا کبر دیکھا تو اسی وقت یہ کہتے ہوئے بھائی سے علیحدگی اختیار کر لی: ایسے فرشتہ سیرت بزرگ
سے تکبر غضب الٰہی کا موجب ہے۔ اسی وقت سید صاحب سے بیعت کر لی۔ بعد میں برابر ساتھ رہا۔
بالاکوٹ کے معرکے میں داد شجاعت دے کر مرتبۂ شہادت پر فائز ہوا۔

ستائیسواں باب

فیض علی، امجد علی، مصطفیٰ، شاہ سعید

میر فیض علی: میر صاحب گورکھپور کے رئیس اعظم ذوالفقار علی خاں کے فرزند ارجمند تھے۔ سید صاحب سے بیعت کے بعد اپنی زندگی خدمت دین کے لیے وقف کر دی۔ آپ کے ساتھ ہجرت کی۔ چونکہ عالم تھے اس لیے مفتی خانے سے وابستہ ہو گئے۔ دوران جہاد میں اتنی مشقتیں اٹھائیں کہ وضع و ہیئت بدل گئی۔ چنانچہ سید جعفر علی نقوی جہاد کے لیے سرحد پہنچے اور اسب بیلہ میں میر فیض علی سے ملاقات ہوئی تو سابقہ معرفت کے باوجود انھیں پہچان نہ سکے۔ ان کی جفاکشی کا یہ حال تھا کہ اسب میں فصل کاٹنے کے بعد مجاہدین غلہ لانے لگے تو میر فیض علی نے زیادہ بوجھ اٹھا لیا اور انھیں بڑی تکلیف ہوئی۔ سید صاحب نے حکم دے دیا کہ جو لوگ مفتی خانے سے وابستہ ہیں، وہ غلہ نہ ڈھوئیں۔ میر فیض علی اس کے بعد بھی اپنے کام میں لگے رہے۔ ان سے کہا گیا کہ معافی کے بعد آپ کو مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ فرمایا: فضیلت تو ساقط ہو گئی مگر میں بہ نظر استحباب یہ کام انجام دے رہا ہوں۔

پھولڑہ پہ یورش: شوال ۱۲۴۵ھ کے آخر یا ذی قعدہ کے اوائل میں پھولڑہ پر یورش کا فیصلہ ہوا تو سید احمد علی رائے بریلوی لشکر کے امیر مقرر ہوئے۔ انھوں نے چاہا کہ سید جعفر علی نقوی کو بطور منشی اپنے ساتھ لے جائیں جو نئے نئے سرحد پہنچے تھے۔ میر فیض علی کو اس لیے ساتھ نہ لے جانا چاہتے تھے کہ پرانے منشی ہیں اور خط و کتابت کے طور طریقوں سے واقف ہونے کی بنا پر مرکز میں ان کی زیادہ ضرورت ہے۔ یہ معاملہ سید صاحب کے پاس پہنچا تو انھوں نے سید جعفر علی نقوی اور میر فیض علی دونوں کو بلا کر پوچھا کہ کون لشکر کے ساتھ جانا پسند کرتا ہے؟ دونوں نے عرض کیا: جو حکم ہو۔ سید صاحب نے میر فیض علی سے فرمایا کہ آپ کا یہ بھائی لمبی مسافت طے کر کے یہاں پہنچا ہے۔ تکان ابھی دور نہیں ہوئی

بہتر یہی ہے کہ آپ چلے جائیں۔ مخدوم نے عرض کیا: بسر و چشم۔ اس طرح میر فیض علی، سید احمد علی کے ساتھ پھولڑہ گئے۔ وہاں میر لشکر نے پیشتر پیش قدمی کر دی۔ اس گروہ سے فاصلے پر میدان میں ڈیرے ڈال دیئے۔ سید احمد علی نے پھولڑہ پہنچ کر فرمایا: میدان سے ہٹ کر اس گروہ میں ٹھہرنا چاہیے۔ میر فیض علی نے جواب دیا کہ ہم جہاں ٹھہرے ہیں، وہاں مورچے بنا لیے ہیں۔ اب اس جگہ کو چھوڑنا مناسب نہ ہوگا۔

شہادت: اس لڑائی کی مفصل کیفیت "سید احمد شہید" میں بیان ہو چکی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مخالفوں نے ناگہاں صبح کی نماز کے وقت حملہ کیا۔ وہ سب سوار تھے۔ میدان میں ادھر ادھر پھیل گئے۔ مجاہدین نے مختلف ٹولیوں میں بٹ کر ان کا مقابلہ کیا۔ وہ ایک دم گھٹ گئے اور مجاہدین متحدہ حیثیت سے ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ باون شہید ہو گئے۔ ان میں میر لشکر اور بہت سے دوسرے اکابر بھی تھے۔ میر فیض علی نے اسی جنگ میں شہادت پائی اور پھولڑہ کی خاک میں آسودۂ آرام ہیں۔ وہ بہت بڑے رئیس کے فرزند تھے اور کوئی دنیوی غرض انھیں مرشد برحق کی خدمت میں نہ لائی تھی۔ صرف ایک آرزو تھی کہ کلمۂ حق بلند ہو اور دین کی خدمت انجام پائے۔

محمد علی: یہ غازی پور کے رئیس شیخ فرزند علی کے بیٹے تھے۔ شیخ صاحب سفر حج سے پیشتر بیعت کر چکے تھے۔ سفر حج میں ان کے بھتیجے میرزا محی الدین بیگ نے غازی پور میں سید صاحب کے قافلے کے لیے قیام و طعام کا بندوبست کیا۔ آگے بڑھے تو شیخ موصوف کے فرزند محمد علی نے مہمان داری کا فرض انجام دیا، جو بڑا نام مقام میں مقیم تھا۔ سید صاحب ہجرت کے لیے تیار ہوئے تو شیخ فرزند علی نقد کے علاوہ وہ وردی کے بہت سے کپڑے، دو خوب صورت گھوڑے اور ایک نہایت خوب صورت قرآن لے کر آئے۔ خود ساتھ جانا چاہتے تھے۔ سید صاحب نے روک دیا اور فرمایا کہ اپنے فرزند محمد علی کو جانے دیں تو بہتر ہیں۔ شیخ نے جگر بند کا ہاتھ پکڑ کر سید صاحب کے حوالے کرتے ہوئے عرض کیا: خادم حاضر ہے۔

مجروحیت: جنگ اکوڑہ سے مجاہدین کے جہاد کا آغاز ہوا۔ شیخ محمد علی ان خوش نصیبوں میں سے تھے جنھیں اس جنگ کے لیے بھیجا گیا۔ وہ اس میں زخمی ہوئے اور جنگ شیدو تک مسلسل علاج میں رہے۔ جنگ شیدو میں اس لیے شریک نہ ہو سکے کہ تندرست نہ تھے۔ پھر دوسرے

زخمیوں کے ساتھ نوشہرہ سے چنگلئی خود زخمی پہنچ گئے۔ سید صاحب کے دورۂ سوات میں بھی ساتھ تھے۔

زندہ شہید: جب پشاور کے فیصلے کے بعد سید صاحب نے خہر کو مرکز بنایا تو شیخ امجد علی بھی ساتھ تھے۔ جنگ اتمان زئی میں شریک ہوئے۔ عالم خان رئیس اتمان زئی خود سید صاحب کو ساتھ لے گیا تھا۔ فتح قریب تھی تو عالم خان کی نیت میں فتور پیدا ہو گیا۔ سید صاحب کو وہاں سے واپس ہونا پڑا۔ تمام مورچوں میں پیغام بھیج دیا گیا تھا کہ مجاہدین بستر باندھ کر درختوں کے اس جھنڈ میں پہنچ جائیں جو اتمان زئی سے نصف میل کے فاصلے پر تھا۔ سب واپس چلے گئے۔ صرف چند مجاہد مورچوں میں رہ گئے جن میں سے شیخ امجد علی، حافظ رحیم بخش الہ آبادی اور ایک ہندو نو مسلم راجا رام (ساکن جیوا ٹھہ) بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ انھیں خبر نہ ہو سکی۔ صبح کے وقت بستی میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مجاہدوں میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔ چنانچہ یہ لوگ بعد میں سید صاحب کے پاس پہنچے۔ آپ نے شیخ امجد علی کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے فرمایا: شیخ بھائی ہمارے "زندہ شہید" آ گئے۔ جس نے شہید زندہ دیکھنا ہو انھیں دیکھ لے۔ چنانچہ اسی وقت سے شیخ امجد علی کو تمام مجاہدین زندہ شہید کہنے لگے۔

شہادت: بعد کے مجاہدات میں شریک رہے اگرچہ ان کی تفصیل معلوم نہیں۔ بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ شہادت پائی۔

حافظ مصطفیٰ: یہ مولوی الٰہی بخش کاندھلوی کے پوتے اور شیخ محمد حسن کے صاحبزادے تھے۔ مولوی الٰہی بخش صاحب نے شاہ عبدالعزیز سے تعلیم پائی تھی۔ آخری عمر میں سید صاحب سے بیعت کی۔ اس بیعت کے اثرات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ پہلے ہم جو کچھ کرتے رہے تھے وہ ایسا تھا اسے آنکھ سے ملاحظہ کیا ہم نے بجا لایا۔ مولانا روم کی مثنوی کے تکملے کے لئے جسے عام طور پر ساتواں دفتر کہا جاتا ہے، مولوی صاحب موصوف بہت مشہور ہیں۔

شان استقامت: حافظ مصطفیٰ مولوی احمد اللہ ناگپوری کی جماعت میں شریک تھے جب سید صاحب نے شاہ اسمٰعیل کو دیہ پکھلی سے مولوی خیر الدین شیرکوٹی کو اپنے پاس ستھانہ میں بلا لیا تو شاہ صاحب

رام پوری اس اقدام کے سلسلے میں شاہ اسمٰعیل کے شریک کار تھے۔ اس لیے مختلف مراسلے تینوں کی طرف سے لکھے گئے۔ ایک مراسلے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ اسمٰعیل سید محمد مقیم کو لشکرگاہ میں چھوڑ کر ملا اسمٰعیل اخوند زادہ اور ملا شاہ سید کے ساتھ عبدالغفور خاں والئی اگرور کے پاس گئے۔ اسی میں مذکور ہے:

سید شاہ را ابتدائے دعوت مسلمین آں قرب و جوار کہ برادری عبدالغفور اند، لاکن تا ہنوز تبیتند فرستادہ خود بہ معسکر مراجعت نمودم۔ از آں روز تا ایں روز کہ روز چہارم است، کسے از ایشاں نرسیدہ[1]

سید شاہ (ملا شاہ سید) کو قرب و جوار کے مسلمانوں میں تبلیغ کے لیے بھیج دیا۔ یہ لوگ عبدالغفور خاں کی برادری کے ہیں۔ لیکن اس کے آنے سے پہلے نہیں۔ خود میں (شاہ اسمٰعیل) لشکرگاہ میں واپس آگیا۔ آج تک چوتھا دن ہے ان کی طرف سے کوئی آدمی نہیں آیا۔

شہادت ملا شاہ سید یورش ہنڈ میں شاہ اسمٰعیل کے ساتھ تھے۔ ہنڈ فتح ہوگیا اور خادے خاں رئیس ہنڈ کے اقربا اس کے قتل کی بنا پر لوگوں کو برانگیختہ کرنے لگے۔ یہ حالت دیکھ کر شاہ صاحب نے ملا شاہ سید کو خط دے کر پنجتار بھیج دیا تاکہ سید صاحب حقیقی حالات سے آگاہ ہوجائیں۔ ساتھ ہی پنجتار سے شاہینیں طلب کرلیں۔ پنجتار سے دو شاہینیں ۱۷۔ صفر سنہ ۱۲۴۵ھ (۱۸۔ اگست سنہ ۱۸۲۹ء) کو خچروں پر لاد کر بھیج دی گئیں۔ دس بارہ مجاہدین بھی ساتھ تھے۔ جن میں سے ایک کالے خاں شاہینچی تھا اور دوسرے ملا شاہ سید۔ انھوں نے رات شاہ منصور میں گزاری جو ہنڈ سے چار کوس پر ہے۔ خادے خاں مقتول کے اقربا کو خبر مل گئی۔ وہ پچیس تیس سوار لے کر ہنڈ سے آدھ کوس پر گھات میں بیٹھ گئے اور اچانک مجاہدین کی چھوٹی سی جماعت پر حملہ بول دیا۔ بارہ برس کے ایک لڑکے نے دوڑ کر ہنڈ میں خبر پہنچائی وہاں سے مجاہدین موقع پر پہنچے۔ اس سے پیشتر زیادہ تر مجاہدین شہید ہوچکے تھے۔ کالے خاں سے کہا جاتا ہے اس نے بتایا کہ شاہینوں کو بچانے کی کوئی صورت نہ رہی تو میں نے انھیں پاس کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ پہلے بندوقیں چلتی رہیں، پھر تلواروں کی نوبت آگئی۔ ملا شاہ سید نے کئی آدمیوں کو مارا اور زخمی کیا۔ ان پر

---

[1] مکاتیب شاہ اسمٰعیل صفحہ ۱۰۸

ہو رہے تو وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کنوئیں میں جا گرے۔ دشمنوں نے اوپر سے دو تین پتھر ڈال دیے۔
یوں اس نیک دل مجاہد نے شہادت پائی۔ شاہ صاحب نے ان کی میت کنوئیں سے نکلوائی
باقی شہداء کی میتوں کے ساتھ چارپائیوں پر ڈال کر جنازے پڑھے اور وہیں انھیں سپردِ خاک کیا۔

اٹھائیسواں باب

امام الدین، اولاد حسن، غلام علی

مولوی امام الدین بنگالی: آپ موضع حاجی پور ضلع نواکھالی، بنگال کے باشندہ تھے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے کسب علوم کیا۔ سید صاحب راجپوتانہ سے دہلی پہنچے تو بہت سے لوگ بیعت ہونے لگے۔ مولوی امام الدین بھی آپ کی مجلس میں بیٹھتے اور باتیں کرتے لیکن بیعت کی طرف رغبت نہ ہوئی۔ کچھ مدت بعد سید صاحب ایک مرتبہ دہلی سے پھلت گئے۔ وہاں چند روز قیام کیا۔ اتفاق سے مولوی امام الدین بھی پہنچ گئے۔ سید صاحب بیعت لینے میں مصروف تھے۔ خدا جانے کیا بات ہوئی کہ مولوی امام الدین یہ کیفیت دیکھتے ہی بیعت کے لیے تیار ہو گئے۔ اور کم و بیش تین روز آپ پر استغراق کی حالت طاری رہی۔ صرف نماز کے اوقات میں افاقہ ہوتا۔ اسی وقت سے سید صاحب کا دامن تھام لیا۔ پھر ان کی شہادت تک ساتھ نہ چھوڑا۔ ان کا ذکر "توجہ دینے" کے سلسلے میں آتا ہے۔ یعنی سید صاحب سے جو بیعت ہو رہا تھا اسے "توجہ دینے" کا حکم مولوی صاحب کو ملتا تھا۔ مثلاً چار صد میں سید میر خاں قندھاری کو۔

نواب وزیرالدولہ نے "وصایا" میں لکھا ہے کہ مولوی صاحب نے صراط مستقیم کئی مرتبہ خود سید صاحب سے پڑھی۔ آپ عجیب و غریب حقائق بیان فرماتے۔ مولوی امام الدین نے تمام حقائق محفوظ کر لیے تھے اور اس کتاب کی شرح میں موصوف کو خاص دستگاہ حاصل تھی۔

سفر حج میں راستے ہی سے سید صاحب کے ساتھ تھے۔ کلکتہ پہنچے تو اجازت لے کر والدہ سے ملنے کے لیے وطن گئے۔ سید صاحب نے فرمایا کہ انھیں بھی حج کے لیے ساتھ لے آؤ۔ وہ تو نہ آئیں لیکن ان کے ساتھ تیس چالیس آدمی زیارت و بیعت کی غرض سے آ گئے۔ تھا جس نے تھوڑا [illegible]

نہانے لگے تو لوگ انھیں پکڑ کر قاضی کے پاس لے گئے۔ اس لیے کہ ان لوگوں میں کپڑا باندھ کر نہانے کا دستور نہ تھا۔ آخر قاضی کو حکم دینا پڑا کہ جب تک ہندوستانی حاجی وہاں موجود رہیں کوئی عرب کپڑا باندھے بغیر حوض میں نہ نہائے۔

مراجعت: بالاکوٹ کے بعد مولوی صاحب وطن چلے آئے۔ پھر ٹونک میں سکونت اختیار کر لی۔ نواب وزیر الدولہ نے "صراط مستقیم" ان سے پڑھی۔ جس زمانے میں نواب موصوف اپنی اہم کتاب "وصایا" مرتب کر رہے تھے۔ مولوی صاحب زندہ تھے۔ نواب صاحب لکھتے ہیں کہ وہ مسند ارشاد پر فائز ہیں اور بے شمار خلقت ان کے خوان ہدایت سے مستفید ہو رہی ہے۔ میں نے بارہا دیکھا کہ ذکر جہر کی تعلیم کے وقت جونہی اللہ کا نام پاک ان کی زبان پر آتا، سامعین جوش وجد اس کی قید سے نکل کر باطنی انوار میں ڈوب جاتے۔

آپ کے بھائی عظیم الدین بھی جہاد میں شریک تھے اور بالاکوٹ کی جنگ میں شہید ہوئے۔

سید اولاد حسن قنوجی: آپ کا سلسلہ نسب امام علی نقی سے ملتا ہے۔ اوچ کے مشہور شیخ سید جلال الدین گل سرخ بخاری اور حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت بھی آپ کے اجداد میں سے تھے۔ آپ کے والد سید اولاد علی خاں حیدرآباد میں امیر کبیر نواب شمس الامرا کی سرکار سے وابستہ ہو گئے تھے اور ان سے دور کی عزیزداری بھی تھی۔ انھیں کی سفارش سے نظام علی خاں والیٔ دولت آصفیہ نے نور جنگ بہادر کا خطاب عطا کیا اور گولکنڈہ کا قلعہ دار بنایا۔ پانچ لاکھ روپے سالانہ کی جاگیر ملی۔ ایک ہزار سوار و پیادہ کے وہ سالار تھے۔ انھوں نے پہلا نکاح وطن میں کیا تھا، دوسرا حیدرآباد میں۔ نواب سکندر جاہ آصف ثالث کے عہد میں فوت ہوئے۔ حیدرآبادی بیگم سے کوئی اولاد نہ تھی۔ سید اولاد حسن پہلی بیگم کے بطن سے تھے۔

جہاد اور دعوت و ارشاد: سنہ ۱۲۱۰ھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم وطن میں پائی۔ لکھنؤ میں مولوی محمد نور اور مرزا حسن علی محدث سے بھی اکتساب علم کیا۔ پھر دہلی میں شاہ رفیع الدین محدث، شاہ عبدالقادر محدث اور شاہ عبدالعزیز محدث سے حدیث، فقہ، تفسیر اور دوسرے اسلامی علوم پڑھے۔ چند پشتوں سے ان کا خاندان شیعیت کا پابند چلا آتا تھا۔ خود انھوں نے طریق اہل سنت اختیار کیا۔ سید صاحب سے

بیعت کی اور جماعت مجاہدین میں شامل ہو گئے۔ ان سابقین اوّلین میں شریک تھے جو سیّد صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے گئے۔ کچھ مدت بعد سیّد صاحب نے انھیں دعوت و تبلیغ کی غرض سے واپس بھیج دیا۔ ان کی عمر عزیز کے باقی اوقات اسی پاک شغلے میں صرف ہوئے۔ خود سیّد صاحب ایک مکتوب میں انھیں لکھتے ہیں:

آنچہ از مصروفیت خود در تبلیغ احکام رب العالمین ترقیم قلم اخلاص رقم نمودہ بودند ازیں جہت فرحت بسیار گردید جزاکم اللہ خیرالجزاء۔ ہر یکے از مومنین مخلصین خصوصاً علمائے اعلام و مشائخ ذوی الاحترام را لازم است کہ احکام حضرت جواد را بر بندگان وے شائع و ذائع گردانند۔[1]

آپ نے خدا کے حکموں کی تبلیغ کے سلسلے میں اپنی مصروفیت کے متعلق جو کچھ لکھا اس سے بہت خوشی حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نیک جزا دے۔ تمام مخلص مسلمانوں خصوصاً بڑے بڑے عالموں اور محترم پیروں کے لیے لازم ہے کہ خدا کے احکام اس کے بندوں میں پھیلائیں۔

وفات سیّد صاحب کی شہادت سے سات سال بعد ۱۲۵۳ھ (۱۸۳۸ء) میں وفات پائی اور قنوج میں دفن ہوئے۔ متعدد کتابیں لکھیں۔ ان کے دو فرزند تھے: ایک سیّد احمد حسن عرشی جو عربی، فارسی اور اردو کے بلند پایہ شاعر تھے۔ انھیں مرزا غالب سے تلمذ حاصل تھا۔ تیس برس کی عمر میں حج کے لیے روانہ ہوئے۔ بڑودہ پہنچ کر سخت بیمار ہو گئے اور وہیں ۲۵۔ نومبر ۱۸۶۰ء کو وفات پائی۔

دوسرے فرزند سیّد صدیق حسن تھے جنھوں نے بھوپال پہنچ کر بڑا عروج پایا۔ نواب شاہ جہاں بیگم والیۂ بھوپال سے ان کا عقد ہوا۔ نواب امیر الملک والاجاہ کا خطاب ملا۔ عربی، فارسی اور اردو میں اپنی دینی، علمی اور ادبی تصانیف کے باعث مشہور خواص و عوام ہیں۔

والد کے ترکے کا معاملہ سیّد اولاد حسن بڑے ہی نیک طبع اور خوش سیرت بزرگ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ والد کی وفات کے بعد انھیں حیدر آباد بلایا گیا تھا لیکن وہ نہ گئے اور والد کا ترکہ چھوڑ دیا۔ میرے

[1] سیرت سید احمد شہید حصہ اوّل۔

نزدیک واقعے کی صحیح صورت یہ ہے کہ حیدرآباد کے نظام جاگیرداری میں بھی اسی طریقے پر عمل ہوتا تھا، جو مغلوں کے زمانے میں رائج تھا۔ یعنی امراء کی وفات پر ان کا پورا مال اسباب سرکاری خزانے میں جمع ہو جاتا تھا۔ البتہ اولاد کے لیے حسب استعداد ملازمت کا انتظام کر دیا جاتا تھا۔ فخر جنگ کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ سید اولاد حسن ملازمت کے لیے تیار نہ ہوئے، لہٰذا انھیں حیدرآباد سے کچھ ملنے کی امید نہ ہو سکتی تھی ۔

ایک غلط روایت | سیرت والاجاہی میں مرقوم ہے کہ سید صاحب نے ایک موقع پر پدری میراث کے ترک کا سبب پوچھا اور کہا کہ آج وہ روپیہ موجود ہوتا تو مسلمانوں کے کام آتا۔ سید اولاد حسن نے جواب دیا کہ میرے والد شیعہ تھے۔ معلوم نہیں ان کا مال میرے لیے حلال ہے یا حرام۔ اگر حرام ہے تو اس لائق نہیں کہ اسے حاصل کروں۔ اگر حلال ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے عوض مجھے علم کی دولت عطا کر دی[1] ۔

ممکن ہے سید صاحب نے مزاحاً کبھی ایسی بات کہی ہو، ورنہ مشتبہ اموال کے متعلق ان کا طریق عمل روز روشن کی طرح آشکارا ہے۔ انھوں نے اگنس بروک کی بیوی حیات النساء بیگم اور ایسی ہی کانپور کی ایک خاتون کے اموال بے تکلف ٹھکرا دیے تھے۔ پھر وہ سید اولاد حسن کے پدری ترکے کی نسبت ایسی کوئی بات کیوں کر فرما سکتے تھے؟ اس قسم کے بعض واقعات لوگوں نے ارادت مندوں کی حیثیت بلند کرنے کی غرض سے لکھ دیے اور یہ نہ سوچا کہ خود پیر و مرشد کی حیثیت پر ان سے کیسی زد پڑتی ہے ۔

شیخ غلام علی الہ آبادی | ان کا اصل وطن بھرونڈہ (ضلع الہ آباد) تھا۔ بہت بڑے امیر تھے۔ وطن میں جو مکان بنوایا تھا، وہ قلعے کی طرح مضبوط تھا اور اسے کوٹ گڑھی کہتے تھے۔ اب وہ بالکل مسمار ہو چکا ہے ۔

شیخ صاحب بالکل ابتدائی دور میں سید صاحب سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اسی وقت سے پوری

---

[1] سیرت والاجاہی حصہ اوّل ۳۶۵ ۔

زندگی اسلامی سانچے میں ڈھل گئی۔ ان کے پاس بیسیوں شہری اور دیہی تختے تھے۔ سب توڑ کر دریا میں بہا دیے۔ ایک راوی کا بیان ہے کہ ایسا مخلص بے ریا اور محب باصفا آج تک نہیں دیکھا۔

سید صاحب سے عقیدت! شیخ صاحب مہاراجہ بنارس کی طرف سے تمن دار تھے۔ سید صاحب حج کے لیے نکلے تو الٰہ آباد میں قیام و طعام کا پورا بندوبست شیخ صاحب ہی نے کیا۔ سید صاحب کو ایک کوٹھی میں ٹھہرایا۔ قافلے کے لیے مہاراج کی بارہ دری خالی کرا دی۔ ایک ایک وقت میں متعدد کھانے پکتے تھے۔ صحن پر روزانہ کم از کم ایک ہزار روپیہ خرچ ہوتا۔ یہ اس زمانے کا خرچ ہے جب جنسیں ارزاں تھیں۔ دو مرتبہ سید صاحب سے ملنے کے لیے آتے اور اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ نذر ضرور لاتے۔ دوران قیام میں کم از کم بیس ہزار روپے کی چیزیں اس طرح سید صاحب کی خدمت میں پہنچائیں۔ رخصت کے وقت ایک بڑا خیمہ اور بارہ چھوٹے خیمے پیش کیے۔ سید صاحب کے تمام رفیقوں کو ایک ایک جوڑا جوتا، مردوں کو دو دو پاجامے، دو دو انگرکھے، دو دو ٹوپیاں اور ایک ایک چادر۔ عورتوں کو دو دو پاجامے، دو دو کرتے اور دو دو دوپٹے دیے۔ سب کو فی کس ایک روپیہ۔ سید صاحب کے اقربا کو دس دس روپے دیے۔ رفقا کی خدمت میں ان کی حیثیت کے مطابق نذریں پیش کیں۔ ایک روز سید صاحب کی بیویوں کو دس دس جوڑے دیے گئے۔ ہر کھانے کے ساتھ ایک سو چالیس روپے نقد پیش کرتے۔ تمام اہل قافلہ کو احرام کی چادریں دیں۔ سید صاحب کی خدمت میں مشروع، کمخواب، پشمینے، نینو، ڈھاکہ کی ململ، محمودی بنارسی، جھنس وغیرہ کے تھان پیش کیے۔ ان کے علاوہ ساڑھے چار ہزار روپے نقد اور کشمیری شال دی۔ دو نہایت عمدہ مطلا قرآن مجید پیش کیے۔ حج سے واپسی پر بھی اسی فداکاری سے حق خدمت ادا کیا۔

خدمت! سید صاحب جہاد کے لیے نکلے تو شیخ صاحب قسم قسم کے اسلحہ، خیمے، کپڑوں کے تھان، کتابیں، برتن، سید صاحب کے لیے پوشاکیں اور نقد روپیہ لائے۔ ایک خیمہ مسجد کی شکل کا خاص سید صاحب کے لیے تیار کرایا اور مع فرش نذر کیا۔ جب سنا کہ سید صاحب راجپوتانہ کے راستے جائیں گے تو بیسیوں چھوٹے چھوٹے ڈولچے بنوائے اور ان کے لیے لمبی لمبی رسیوں کا انتظام کیا۔ یہ سب چیزیں بابت مجاہدین میں تقسیم کر دیں۔ سید صاحب فتح پور پہنچے تو شیخ صاحب دوبارہ زیارت کے لیے آ گئے اور

پورے قافلے کی مہمان داری اپنے ذمے لے لی۔ مزید برآں سید صاحب کے لیے عمدہ سے عمدہ پوشاکیں تیار کرا کے سرحد بھیجتے رہتے تھے اور جو قافلہ سرحد جاتا تھا اس کے لیے اسلحہ، سواری یا دوسری ضروری چیزوں کا سامان کر دیتے تھے۔ چنانچہ سید جعفر علی نقوی ان سے ملتے ہوئے گئے تو شمشیر، کٹار، سپر، جامہ، دیگچے، طباق، پیالے وغیرہ انھیں دیے۔

شہادت کچھ مدت کے بعد شیخ صاحب مالی مشکلات کا شکار ہو گئے۔ راجا نے تاوان کی بھاری رقم ان کے ذمے ڈال دی۔ اس سلسلے میں ان کی گڑھی پر ایک لاکھ روپیہ قرض ہو گیا۔ ان کا بڑا لڑکا ان غیر شرعی مشاغل کا عادی ہو گیا تھا جو اس عہد کے امرا کی اولاد میں عام تھے۔ اس وجہ سے شیخ صاحب بہت دل گرفتہ رہتے تھے۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد غالباً راجا کے آدمیوں نے ان پر چڑھائی کر دی۔ الٰہ آباد اور بناس کے درمیان لڑائی ہوئی۔ اسی معرکے میں شیخ صاحب نے شہادت پائی۔ آپ کی میت ہاتھی پر واپس آئی، گڑھی کے قریب دفن ہوئے۔ قبر خام ہے۔ نہ اس پر کوئی عمارت ہے نہ احاطہ۔

آخری دور میں انتہائی سادگی اختیار کر لی تھی۔ موٹے کپڑے کا لباس پہنتے۔ چھوٹی سی چارپائی پر سوتے، جس پر کوئی بستر نہ ہوتا تاکہ پاؤں نہ پھیلا سکیں، جلد آنکھ کھل جائے اور رات کا زیادہ حصہ عبادت میں صرف ہو۔

اب تمام بھائی ان کی منت سماجت کرنے لگے۔ وہ غصے میں تھے نہ مانے۔ سید صاحب باہر تشریف لائے تو معاملہ ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آپ نے پوچھا: شیخ بھائی! چارپائی زحمت پر کیوں بچھائی؟ انھوں نے عرض کیا۔ حضرت! اب میرے لیے زمین پر جگہ نہیں رہی۔ آج آسمان کی طرف پہلی منزل ہے۔ کل جو کچھ پیش آئے گا، دیکھ لوں گا۔

یہ سن کر سب بے اختیار ہنس پڑے۔ سید صاحب نے فرمایا: شیخ بھائی! اتر آئیے۔ آپ کے لیے زمین ہی پر جگہ نکل آئے گی۔ چنانچہ چارپائی ایک اچھی جگہ بچھوا دی۔ مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

اخوند فیض محمد یہ غالباً سرحد ہی کے باشندے تھے۔ وطن کا صحیح علم نہ ہو سکا۔ جب خواجہ خیل (سوات) میں سلیمان شاہ والی چترال (کاشکار) کے پاس سفیر بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا تو اخوند صاحب ہی اس منصب کے لیے تجویز ہوئے۔ "وقائع" کا بیان ہے کہ آپ نماز عشا سے فارغ ہوئے تو خواجہ خیل کے مختلف لوگ آپ کے پاس آکر والیٔ چترال کی باتیں کرنے لگے اور عرض کیا کہ آپ اس ملک میں تشریف لے جاتے تو بہت اچھا ہوتا۔ آپ نے فرمایا کہ یہاں بھی جہاد موجود ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی ملک میں ہم سے اپنی رضامندی کا کام لے۔ البتہ ہم دعوت جہاد اور ترغیب غزا کی غرض سے چند لوگ وہاں ضرور بھیجیں گے۔[1] چنانچہ دوسرے دن اپنے خاص آدمیوں سے مشورے کے بعد اخوند فیض محمد کو اس کام کے لیے تجویز کیا۔ سلیمان شاہ کے لیے ایک قلمی قرآن مجید، ایک جوڑی پستول اور ایک پیش قبض بطور تحفہ بھیجی۔ اخوند صاحب چند آدمیوں کے ساتھ چترال گئے اور سید صاحب پنجتار پہنچ چکے تھے جب یہ واپس آئے۔ سلیمان شاہ نے بھی چند چیزیں بطور تحفہ بھیجیں۔ مثلاً ایک قرآن مجید خوشخط اور مطلا، ایک پیش قبض فولادی، شیر ماہی کے دستے کا جس کی نشان اور حمائل نقرئی تھی۔ تسمے کے بجائے اس میں کلابتون اور ریشم کے گوندھے ہوئے ڈورے تھے اور دستے کے حلقے میں کلابتون اور ابریشم کا پھندنا تھا۔[2] اخوند صاحب اس کے بعد بھی دو تین بار چترال گئے اور ان سے مزید معلوم ہوا کہ ان کا اصل وطن غزنی (شہر) کے آس پاس کا علاقہ تھا، اسی لیے کہ بعض روزنامچوں میں انھیں اخوند فیض محمد غزنوی لکھا ہے۔ نیز وہ واقعہ بالاکوٹ کے بعد اس جماعت میں شامل تھے جو شیخ ولی محمد کی سرکردگی

[1] "وقائع" صـ۱۳۸۴ ؛ [2] "ایضاً" "وقائع" صـ۴۲۳

شیخ صاحب نے پانی پلایا اور پٹی باندھ دی۔ پھر پوچھا: جانی! چوٹ تو نہیں لگی؟ شیخ نے عرض کیا
کہ آپ کی دعا سے محفوظ رہا۔

غریب اللہ کا ذکر جنگ بالاکوٹ کے بعد آیا۔ وہ یوں کہ سید جعفر علی نقوی کے بیان کے مطابق غریب اللہ
نے مراجعت کا ارادہ کر لیا اور نقوی سے کہا کہ کوئی خط اپنے وطن کو دینا ہو تو لے جاؤں۔ چنانچہ نقوی کے
وطن کو سید صاحب کی شہادت کی پہلی خبر غریب اللہ ہی کے ذریعے سے ملی۔

تیسواں باب

مختلف اصحاب

(۲)

حاجی بہادر شاہ خاں سیّد صاحب کے قدیم مخلصین میں سے تھے۔ ایک مرتبہ انھیں ہندوستان بھی بھیجا گیا تھا۔ سکھوں سے مصالحت کی گفتگو میں یہ مولوی خیر الدین شیرکوٹی کے رفیق تھے۔ انتظامِ عشر کے بعد انھیں تحصیل کے لیے گڑھی امان زئی میں مقرر کر دیا گیا تھا۔ جس زمانے میں اہلِ سمہ نے مجاہدین کے قتل کی سازش مکمل کر لی تھی۔ حاجی بہادر شاہ خاں سیّد صاحب سے ملنے کے لیے پنجتار آئے ہوئے تھے۔ وہ گڑھی امان زئی واپس جا رہے تھے۔ اسمٰعیلہ پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے بہ اصرار روک لیا۔ وہ لوگ حاجی صاحب کے بڑے عقیدت مند تھے۔ پُرتکلف کھانا کھلایا۔ عشا کی نماز میں انھیں امام بنایا۔ جب وہ پہلی رکعت کے سجدے میں گئے تو موضع کے خان اسمٰعیل خاں نے تلوار سے ان کا سر قلم کر ڈالا۔ مولانا مظہر علی اور ان کے ساتھیوں کی شہادت کے بعد اہلِ سمہ کے قاتلانہ حملوں کا آغاز حاجی بہادر شاہ خاں ہی سے ہوا۔

سدم کے شہدا گڑھی امان زئی علاقہ سدم کی تحصیل پر مامور تھی۔ بہادر شاہ خاں کے علاوہ حاجی محمود خاں بھی مقرر تھے اور وہ پندرہ مجاہدوں کے ساتھ سدم میں مقیم تھے۔ بلوے کے آثار نمودار ہوئے تو محمود خاں اپنی جماعت کو لے کر جو ان کے بیٹے اور بھائی کے شمول سے ستر پچھتر تک پہنچ چکی تھی، باہر ندی پر جا ٹھہرے۔ میاں خاں رئیس سدم نے پاس جا کر اپنے تئیں اظہار اخلاص کیا۔ مجاہدین فریب میں آ گئے۔ وہاں سے بہ لطائف الحیل ہتھیار لے لیے گئے۔ پھر یکدم ان پر حملہ بول دیا گیا۔ سیّد جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ سب کو نہایت بے رحمی سے قتل کیا۔ بعض کو زمین پر گرا کر بھیڑ بکری کی طرح ذبح کر ڈالا۔ ان میں سے صرف دو بچ سکے۔ شہدا میں سے مندرجہ ذیل کے سوا کسی کا نام معلوم نہ ہو سکا:

حاجی محمود خان، ان کا بیٹا یوسف خان، بھائی عظیم اللہ خان۔ دو بھتیجے برہان الدین اور عبداللہ نواب کریم بخش جراح استاد خدا بخش پھلکیت ساکن سنجھاوں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ محمود خان اہل ستم کے ہم قوم تھے۔ ان کے بھائی عظیم اللہ خان کو خود ان کے خسر نے ذبح کیا اور اپنی بیٹی کو بیوہ بنایا۔

شیلوہ کے شہدا | موضع شیلوہ میں جو مجاہدین مامور تھے، ان میں سے سید امیر علی بلوے کے ابتدائی آثار دیکھتے ہی گھوڑے پر سوار ہو کر پنجتار چلے گئے، اس لیے کہ ان کے پاس بیت المال کے پانچ ہزار روپے جمع تھے اور بیت المال کے روپے کی حفاظت ان کے نزدیک جان پر مقدم تھی۔ حافظ عبدالغنی پھلتی انھیں گاؤں سے باہر پہنچا گئے اور خود یہ کہتے ہوئے واپس چلے گئے کہ اس نازک وقت میں اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ راتوں رات گاؤں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ تمام مجاہدین میں سے صرف ایک شیخ گلاب بچ کر پنجتار پہنچے۔ شہداء میں سے صرف حافظ عبدالغنی، حافظ عبداللہ، شیخ ناصر الدین اور مولوی محمد رمضان کے نام معلوم ہو سکے۔ حافظ عبدالغنی پھولڑہ کی جنگ میں بھی شریک تھے۔ وہاں سے سلامت واپس پہنچے تو خاص رفیقوں کی مجلس میں بار بار حسرت سے کہا کرتے تھے کہ شہادت نصیب نہ ہوئی۔ کیا معلوم تھا کہ ان کی شہادت غیروں کے ہاتھ سے نہیں اپنوں کے ہاتھ سے مقدر تھی۔

ترلانڈی اور ترکئی کے شہدا | ترکئی اور یار حسین کے شہداء میں سے محمد حسین، مولوی امیرالدین اور ریاست علی مولائی کے نام معلوم ہیں۔ ریاست علی نہایت خوش گلو تھے، اور جنگ کے موقع پر جہادیہ خوش آہنگی سے پڑھا کرتے تھے۔ ترلانڈی میں کم از کم پانچ سوار رہتے تھے، ان میں سے صرف ایک کمیر خان سلامت بچے۔

مینئی کے شہدا | مینئی میں میر حامد علی جھنجھانوی پن چکیوں کے انتظام پر مامور تھے۔ ان کے ساتھ بیس پچیس آدمی رہتے تھے۔ وہ سید صاحب کا حکم پاتے ہی اثاثے کو پنجتار چلے گئے، صرف تین آدمیوں کو غلے کی حفاظت کے لیے چھوڑ گئے۔ عین اسی وقت پیر خان مولائی پینتیس مجاہدوں کے ساتھ کھبل سے مینئی پہنچ گئے انھیں غضب کی اطلاع مل چکی تھی لیکن لمبی منزل طے کر کے آئے تھے، اس لیے ستانے کی غرض سے ٹھہر گئے اور مسجد میں رات گزاری۔ راتوں رات مسجد کا محاصرہ کر لیا گیا۔ پینتیس مجاہدوں میں سے دو غلے کے گودام میں بچ

گئے تھے۔ ایک یوسف علی خاں اور دوسرے حبیب خاں نمبردار۔ جن مجاہدوں کو میر حامد علی خاں چھوڑ گئے تھے ان میں سے صرف دو کے نام معلوم ہیں: ایک خدا بخش رام پوری، دوسرے داؤد خاں خورجوی۔ غرض یہ چار (خدا بخش، داؤد خاں، یوسف علی خاں اور حبیب خاں) ایک خدا کی خیر خواہی کے باعث بچ گئے۔ مسجد کے تینتیس مجاہدوں میں سے صرف تین سلامت رہے، باقی سب نے مسجد ہی میں جام شہادت نوش کیا۔

سید چراغ علی شاہ یہ پٹیالہ کے باشندے تھے۔ اکثر مہموں میں شریک رہے۔ اتمان زئی پر پیش قدمی کے دوران میں بیت المال کی بہت بڑی رقم بمقام کوٹلی دفن کر دی گئی تھی۔ اتمان زئی سے مراجعت پر جس جماعت کو یہ رقم لانے کے لیے بھیجا گیا، ان میں سید چراغ علی شاہ بھی شامل تھے۔ گویا یہ معتمد علیہ مجاہدوں میں شمار ہوتے تھے۔ یوم بالاکوٹ کی صبح کو سکھ فوج مٹی کوٹ کے ٹیلے پر نمودار ہوئی تو اکثر مجاہدین کھانا کھا چکے تھے۔ سید چراغ علی شاہ نے کھیر چولھے پر چڑھا رکھی تھی۔ کفگیر ہلاتے جاتے اور وقتاً فوقتاً نظر اٹھا کر سکھوں کو دیکھ لیتے۔ اچانک ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو گئی۔ کفگیر اٹھا کر دیگچی پر مارتے ہوئے کہا: بس اب حوروں کے ہاتھ سے کھانا کھائیں گے۔ پھر تیزی سے مٹی کوٹ کے ٹیلے کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہوا اور کسی کو انھیں روکنے کا موقع نہ مل سکا۔ تھوڑی دیر میں اتنی دور جا چکے تھے کہ انھیں روکنا بے سود معلوم ہوا۔ اسی حالت میں گولی لگی اور شہید ہو گئے۔ یوم بالاکوٹ کے یہ پہلے شہید تھے۔

باقر علی عظیم آبادی یہ مولانا ولایت علی اور مولانا عنایت علی کے چچیرے بھائی تھے۔ سفر ہجرت کے دوران میں کلکتہ اور بعض دوسرے مقامات پر لوگ غلط فہمی میں جماعت مجاہدین کو قزاقوں اور رہزنوں کا قافلہ سمجھ بیٹھے اور مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ دونوں جگہ سید صاحب نے شیخ باقر علی ہی کو ترجمان کے ساتھ بھیجا کہ لوگوں کی غلط فہمی دور کر دیں۔ انھیں رسد کی تقسیم میں مولانا محمد یوسف پھلتی کا معاون بنا دیا گیا تھا، اس لیے ناظم غلہ کے لقب سے مشہور رہے۔ جنگ اکوڑہ سے جہاد کا آغاز ہوا۔ مولوی باقر علی اس میں شریک تھے۔ سکھ لشکرگاہ سے جو پہلی گولی آئی وہ انھیں کے لگی۔ زخم کاری تھا۔ بیٹھ گئے اور بولے: بھائیو! میرا کام تمام ہوا۔ اب مجھ سے ہتھیار لے لو، یہ اللہ کا مال ہے۔ ساتھ ہی ان کی روح اعلیٰ علیین میں پہنچ گئی۔ سید صاحب کی جماعت کے وہ پہلے فرد تھے، جنھیں خلعت شہادت نصیب ہوا۔ ان کے پاس ایک تلوار تھی، دو پستول اور ایک

شعر یہ تھے :

کروں حمد اس ذات بے عیب کی — صمد اور غنی عالم الغیب کی
جو محتاج ہرگز کسی کا نہیں — اسی کے ہیں محتاج سب ہر کہیں

جتنا حصہ نظم کر لیتے تھے، وہ شاہ اسماعیل کو سنا دیا کرتے تھے۔ تاکہ کوئی غلطی یا خامی حتی الامکان باقی نہ رہے۔ بالاکوٹ میں شہادت پائی اور رسالہ مکمل نہ ہو سکا۔

مایار کے شہدا : جنگِ مایار کے بعض ممتاز شہدا کے حالات الگ لکھے جا چکے ہیں۔ باقی اصحاب میں سے بعض کی کیفیت یہ ہے :

۱۔ مولوی عبدالرحمن ساکن قورو : یہ ابتدا ہی سے سید صاحب کے ساتھ ہو گئے۔ سفارت و مصاحبت کا کام زیادہ تر انھیں سے لیے جاتے تھے۔ مایار میں ان کا سر تن سے الگ ہو چکا تھا۔

۲۔ شیخ عبدالحکیم پھلتی : ان کا سر بھی تن سے الگ ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے ڈھونڈ کر لائے اور اسے تن سے ملا کر دفن کیا۔

۳۔ لعل محمد : وطن معلوم نہ ہو سکا۔ یہ سید صاحب کے باورچی خانہ سے متعلق تھے۔

۴۔ شیخ عبدالرحمن رائے بریلوی : جنگ میں سخت زخمی ہوئے۔ تو دلا کر ان کے زخم سیے گئے۔ کچھ باتیں بھی کیں۔ پانی بھی پیا، پھر جاں بحق ہو گئے۔ شہدائے مایار میں سے یہی تھے جنھیں غسل بھی دیا گیا اور کفن بھی پہنایا گیا۔

کنیر ڈھیری کے شہدا : ان میں سے نامور اشخاص کے حالات الگ لکھے جا چکے ہیں۔ باقی شہدا کے نام یہ ہیں :

۱۔ سید ظہور اللہ بنگالی
۲۔ فیض اللہ بنگالی
۳۔ حاجی عبداللہ رامپوری
۴۔ سید مدد علی

د۔ سید دلاور علی: ان کے گولی لگی تو یہ گر پڑے۔ رفیقوں نے وقت پر اٹھا لیے، پیچھے سے پائندہ خان تنولی کے آدمی ان کے پاؤں پکڑ کر کھینچنے لگے۔ رحم خان نے ذرا آگے بڑھ کر بندوق سر کی تو ان کی کھوپڑی میں گولی لگی اور وہ بھی شہید ہو گئے۔

چھتر بائی کے شہداء: چھتر بائی کی محافظ فوج کے سر لشکر شاہ اسمٰعیل شہید تھے۔ حافظ عبداللطیف تیونوی نے ایک مرتبہ بطور خود مجاہدین سے کہہ دیا کہ نماز عصر کے بعد گڑھی پر حملہ ہوگا۔ مجاہدین سمجھے کہ شاہ صاحب کا حکم ہوگا، حالانکہ وہ اس سے بالکل بے خبر تھے۔ حملہ ناکام رہا اور اس میں چند مجاہدین شہید ہوئے جن میں شیخ علی محمد کے حالات اوپر لکھے جا چکے ہیں۔ اخوند زعفران کے سینے میں آگ لگ گئی اور جسم جگہ جگہ سے جل گیا۔ کچھ مجاہدین زخمی بھی ہوئے، مثلاً نہال خاں، ذاکر اللہ قندھاری، حکیم بخش بنارسی۔

سید مردان علی شاہ: یہ رضوی سید تھے۔ جد اعلیٰ میر عبدالغفور کا تعلق مشہد سے تھا، ملتان آئے، پھر دہلی [illegible] جھجر میں مقیم ہو گئے۔ سید مردان علی شاہ تلاش حق میں شہروں شہروں پھرتے رہے۔ لکھنؤ میں سید صاحب سے بیعت کی تھی اور باقاعدہ خلافت نامہ حاصل کیا۔ یہ بھی ان اصحاب میں سے تھے جنھیں سید صاحب نے تبلیغ جہاد کے لیے مقرر فرما دیا تھا۔ گرد و نواح کے علاقوں میں دورہ کرتے پھرتے، ریواڑی اور ہارہ کے مسلمان ان کے وعظ و تبلیغ سے بہت متاثر ہوئے۔ یہ جماعت مجاہدین کے لیے رقمیں اور سامان بھی فراہم کرتے تھے۔ ریواڑی اور اطراف کے سیدوں، قصبوں اور دوسرے افراد نے ایک مرتبہ اجتماع منعقد کر کے فیصلہ کیا تھا کہ مسلمانوں میں جو غیر اسلامی رسمیں رائج ہو چکی ہیں، انھیں حتمی طور پر ترک کر دیا جائے۔ یہ سید مردان علی شاہ ہی کی تبلیغی کوششوں کا ایک کرشمہ تھا۔

سید مردان علی شاہ کے پاس ایک خاص بیاض تھی، جس میں سید صاحب کا خلافت نامہ درج تھا، نیز ان کے سفر حج اور مجاہدانہ سرگرمیوں کی تفصیلات مرقوم تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جھجر بری طرح تباہ ہوا۔ اسی میں یہ بیاض بھی ضائع ہو گئی۔ سید مردان علی شاہ کے فرزند ارجمند سید قاسم علی شاہ نے بڑی محنت و کوشش سے بیاض تیار کر لی تھی۔ وہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامۂ انقلاب میں وطن میں ضائع ہو گئی۔ سید قاسم علی شاہ کے پوتے سید صادق علی شاہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے اور آج کل سندھ میں مقیم ہیں۔[1]

[1] سید مردان علی شاہ کے متعلق یہ حالات مجھے پروفیسر محمد سلیم صاحب لیکچرر گورنمنٹ کالج میرپور خاص سے معلوم ہوئے۔

اکتیسواں باب

مختلف اصحاب

(۳)

مولوی محمد حسن | مولوی صاحب موصوف رام پور منہاران کے تھے۔ شاہ اسمٰعیل شہید اور مفتی الٰہی بخش کاندھلوی سے علم کی تکمیل کی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ابتدا میں بہت نازک طبع اور نفاست پسند تھے۔[1] اگرچہ "ارواح ثلاثہ" میں ان کی نازک مزاجی کے متعلق کا جو قصہ بیان کیا گیا ہے، وہ کسی لحاظ سے بھی قابلِ قبول نہیں۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ دورانِ جہاد میں نہایت سادگی سے زندگی گزاری، یہاں تک کہ اپنے خیمے سونے کی بھی کوئی خاص جگہ مقرر نہ کی۔ سید صاحب کی باتیں سننے کے شوق میں پاس بیٹھے بیٹھے، نیند آتی تو وہیں زمین پر سو جاتے۔

مولوی محبوب علی دہلوی قافلے کے سرحد پہنچے تو راستے کی تکلیفوں سے اس قدر پریشان ہوئے کہ واپسی کا قصد کر لیا اور مجاہدین سے بھی کہنا شروع کر دیا کہ گھر واپس چلو اور قرض کے جو حقوق تمہارے ذمے ہیں، انھیں ادا کرو۔ دوسرے مجاہدین کے علاوہ مولوی محمد حسن نے بھی اس موقع پر مولوی محبوب علی سے گفتگو کی تھی:

محمد حسن: حضرت! آپ کس دلیل سے مجاہدین کے قیام کو لغو ٹھہراتے ہیں؟

محبوب علی: آخر یہاں کس کافر سے جنگ درپیش ہے؟

محمد حسن: جنگ کو قتال کہتے ہیں اور اس کا موقع گاہے گاہے آتا ہے۔ جہاد یہ ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے سعی کی جائے۔ یہاں سب لوگ اسی کام میں مصروف ہیں۔ آپ ان کے فعل کو عبث قرار دیتے ہیں، اگر

---

[1] ارواح ثلاثہ۔

تھیں۔ ہندو کافروں سے متاثر تھیں۔ جب یہ دونوں پیدا نہیں ہوں تو کون سی کرامت سے دور دراز کا راستہ طے کرتے ہوئے اس جگہ شریک ہونے پہنچ گئے؟

مولوی محبوب علی یہ دلیل سن کر لاجواب ہو گئے۔

شہادت | فتح سب کے بعد پائندہ خاں تنولی سے مصالحت کی گفتگو شروع ہو گئی تو ایک مرتبہ شیخ ولی محمد پھلتی اور مولوی نصیر الدین شیرکوٹی کے علاوہ مولوی محمد حسن کو بھی سید صاحب نے پائندہ خاں کے پاس بھیجا تھا۔ وہ سید صاحب کی مجلس شوریٰ کے بھی مستقل رکن تھے۔ یعنی تمام اہم مشوروں میں شریک ہوتے تھے۔

سید احمد علی رائے بریلوی کو سالار اعلیٰ بنا کر پھولڑہ بھیجا گیا تو مولوی محمد حسن کو ان کا مشیر خاص مقرر کر دیا گیا۔ یہ اور رحیم بخش جراح جنگ کے وقت پاس پاس کھڑے تھے۔ جب سید احمد علی کی شہادت کا علم ہوا تو یک دم گھمسان کے رن میں گھس گئے اور مردانگی سے لڑتے ہوئے شہادت پائی۔ پھولڑہ ہی کے گنج شہیداں میں سید احمد علی اور دوسرے رفقا کے ساتھ دفن ہوئے۔ "منظورہ" کا بیان ہے شاہ اسمٰعیل کے بعد لشکر اسلام میں عجز، حلم، خاکساری اور قابلیت کے لحاظ سے مولوی محمد حسن جیسا کوئی نہ تھا۔

میرزا عبدالقدوس کشمیری | یہ جنگ پھولڑہ میں شریک تھے۔ اگرچہ پیدل تھے، لیکن دیر تک سکھ سواروں کا مقابلہ کرتے رہے۔ جب کوئی سکھ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا ان کی طرف آتا تو دسترس میں آتے ہی بجلی کی سرعت سے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لیتے اور چشم زدن میں تلوار سے اس کا سر اڑا دیتے۔ کوئی سوار نیزہ تان کر آتا تو اس کا مقابلہ بھی خوب کرتے۔ اگر نیزہ دائیں جانب ہوتا تو اس کے قریب پہنچتے ہی یہ اچھل کر بائیں جانب ہو جاتے۔ نیزے کا رخ بائیں جانب ہوتا تو یہ دائیں جانب چلے جاتے۔ پہلے نیزہ کاٹتے پھر سوار کا سر قلم کرتے۔ کئی سواروں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آخر خود بھی جام شہادت پی کر زندہ جاوید گروہ میں شامل ہو گئے۔

میر احمد علی بہاری | بڑے خوش رو اور سرو قامت جوان تھے اور حد درجہ دلیر و جواں مرد۔ تیر اور بندوق چلانے میں یکساں مہارت تامہ حاصل تھی۔ بہت سے سکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا۔ آخر دشمن سواروں کے ایک گروہ نے انھیں نرغے میں لے لیا۔ میر صاحب بولے: ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں بھاگ نہ جاؤں گا۔ مجھ پر گولی نہ چلاؤ میری شمشیر زنی کے جوہر دیکھ لو۔ پھر خاصی دیر تک تمام سواروں سے تنہا لڑتے رہے۔ بس یہ ان کی تلوار ٹوٹی

یا تو سر قلم ہو جاتا یا بازو کٹ جاتا یا پاؤں۔ تڑپتا تھا۔ آخر ایک سکھ نے گولی مار کر انھیں شہید کر دیا۔

امام خان سہسرامی اور شیخ برکت اللہ بھی جھنڈے ہی میں شہید ہوئے۔ آخر الذکر کے سینگ سے ٹکرا کے گئی جس سے سارا جسم ہو گیا۔ اسی حالت میں انھیں شہید کر دیا گیا۔

شہیدان ڈمگلہ ڈمگلہ کی جنگ میں صرف دو مجاہدوں کی شہادت کا علم ہو سکا: ایک عبدالحق محمد آبادی، دوسرے سید لطف علی۔ یہ دونوں سخت زخمی ہو گئے تھے۔ مجاہدین نے واپس جانے سے پیشتر تمام زخمیوں کو اٹھانے کا بندوبست کر لیا، لیکن ان دونوں نے کہہ دیا کہ ہمارے ہتھیار رکھ لو اور اٹھانے کی تکلیف گوارا نہ کرو۔ ہمیں اسی میدان میں جان دے دینا پسند ہے۔

قاضی مدنی سید صاحب کے خاص معتقدوں میں سے تھے۔ ایک مرتبہ شاہزادہ خان درانی کے نائب جلال الدین نے ایک کتے کے سر میں تیر مارا۔ تیر اس کے سر میں گھس گیا اور وہ پریشان حال ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ سید صاحب بہت آزردہ ہوئے کہ ایک بے ضرر جانور کو خواہ مخواہ اذیت پہنچائی۔ قاضی مدنی کتے کے پیچھے بھاگ گئے اور اس کے سر سے تیر نکال کر دم لیا۔

لاہوری قاضی صاحب ہی کا سائیس تھا، جسے ایک مرتبہ عنایت اللہ خاں نے جو قناعت خاں کا آدمی تھا، تھپڑ مارا اور مقدمہ قاضی حبان کے سامنے پیش ہوا۔ آخر قاضی حبان نے فیصلہ لاہوری کے حق میں صادر کر دیا۔ اس وقت لاہوری نے عنایت اللہ خاں کو معاف کر دیا۔

ملا اسمٰعیل اخوندزادہ ملا صاحب اہل سرحد میں سے تھے۔ جب شاہ اسمٰعیل کو ابتدا میں ہزارے بھیجا گیا تو یہ بھی شاہ صاحب کے ساتھ تھے۔ انھوں نے اپنے خطوں میں اخوندزادہ کے علم و فضل، شرافت و تقویٰ، عقل و دانش، حسن تدبیر اور اصابت رائے کی بار بار ستائش فرمائی۔ ایک موقع پر لکھا:

> ملا اسمٰعیل اخوندزادہ نہایت ہوشیار و دیانت دار ہیں اور مشاورت و مصالحت میں پختہ کار۔ وہاں اطراف ہزارہ کے تمام فضلا کے پیش کار ہیں اور جملہ خوانین کے معتمد۔ دین کے کاموں میں بجان مصروف ہیں اور تالیف و ترغیب میں بدل مشغول۔

ارباب فیض اللہ خاں مہمند یہ ہزار خانی (نزد پشاور) کے رئیس تھے۔ سلطان محمد خاں نے انھیں کے

ذریعے سے سید صاحب کے پاس مصالحت کا پیغام بھیجا تھا اور انھیں کے ذریعے سے صلح کی گفتگو پایۂ تکمیل پر پہنچی تھی۔ ارباب نے بات چیت کے دوران میں عرض کر دیا تھا کہ اگر سلطان محمد خاں اور اس کے بھائی مصالحت کے بعد بھی پرانی روش پر قائم رہیں گے تو میں ان کا ساتھ چھوڑ کر سید صاحب کی رفاقت اختیار کر لوں گا۔

سید صاحب کی طرف سے شاہ اسمٰعیل نے دو مرتبہ سلطان محمد خاں سے ارباب کے وطن ہزار خانی ہی میں بات چیت کی۔ پھر سید صاحب سے سلطان محمد خاں کی ملاقات قرار پا گئی تو جس طرح سید صاحب کے ساتھ شاہ صاحب اور ارباب بہرام خاں اس ملاقات کے لیے گئے، اسی طرح سلطان محمد خاں کے ساتھ ارباب فیض اللہ خاں اور مردان علی آئے۔ سید صاحب پشاور سے واپس پنجتار جانے کے لیے تیار ہوئے تو ارباب فیض اللہ خاں نے ہزار خانی میں پورے لشکر کے لیے پر تکلف دعوت کا انتظام کیا۔

کچھ مدت بعد ارباب کو یقین ہو گیا کہ سلطان محمد خاں کے طور طریقوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اغلب ہے انھیں اس سازش کے متعلق بھی سرسری اطلاعات مل چکی ہوں جو مجاہدین کے بے خبرانہ قتل کے متعلق کی جا رہی تھی، لہٰذا انھوں نے ایک مخلص دوست کی حیثیت میں مولانا مظہر علی قاضی پشاور کو آگاہ کر دیا کہ ان لوگوں کی نیت میں فتور ہے اور یہ بغاوت کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں۔ بہتر یہ ہوگا کہ آپ سید صاحب کو اطلاع دے کر مناسب ہدایات حاصل کر لیں۔ سلطان محمد خاں نے سازش مکمل ہو جانے کے بعد جہاں مولانا مظہر علی اور ان کے رفیقوں کو خاک و خون میں تڑپایا وہاں ارباب فیض اللہ خاں کو بھی شہید کرا دیا، اس لیے کہ اسے یقین تھا ارباب بہر حال سید صاحب کا ساتھ دے گا۔

ناصر خاں بھٹ گرامی یہ بھٹ گرام (علاقہ تندصیاڑ) کے رئیس تھے۔ ابتدائی دور ہی میں سید صاحب سے وابستگی پیدا کر لی تھی اور راہ وفا پر برابر قائم و استوار رہے۔ بالاکوٹ میں سید صاحب کے ساتھ تھے اور جنگ کے متعلق مختلف مشوروں میں شریک رہے۔ ان کا مورچہ ست بنے کے کنارے شیخ ولی محمد کی جماعت کے بائیں ہاتھ تھا۔ اس جنگ میں ان کا ہاتھ زخمی ہوا۔ پھر جب میدان میں یہ افواہ پھیلی کہ سید صاحب کو گوجر اٹھا کر لے گئے ہیں تو دوسرے مجاہدین کے ساتھ یہ بھی روانہ ہو کر بالاکوٹ کے عقبی پہاڑ پر پہنچے۔ مجاہدین نے پہلی رات انھیں کے گاؤں میں گزاری تھی۔ یہ بعد از آں بھی سید صاحب کے رفیقوں کی مدارات و اعانت میں

شہادت پائی۔ شاہ صاحب نے حافظ عبداللطیف کو سید صاحب کے پاس بھیج دیا اور آپ نے بہت ڈانٹا۔ یہ واقعہ بھی بدنیتی نہیں صرف سوءِ تدبیر کا نتیجہ تھا۔

مراجعت جنگِ بالاکوٹ کے بعد حافظ صاحب واپس آگئے۔ سید جعفر علی نقوی نے لکھا ہے کہ میرٹھ کی ایک مسجد میں تشریف فرما ہوئے تھے۔ کسی نے کہا کہ یہ سید کے پاس سے بھاگ کر آئے ہیں۔ پس یہ سنتے ہی حافظ صاحب کو غصہ آگیا۔ جست منبر پر کھڑے ہو کر وعظ کہنے لگے اور فرمایا:

> جہاد مخصوص ان لوگوں ہی پر فرض نہ تھا جو لشکرِ اسلام میں شامل ہوئے۔ تمام مسلمانوں پر فرض تھا۔ پس وہ لوگ طاغی ہیں جو مجھے گریزندہ (بھگوڑا) کہتے ہیں۔ اگر وہ مخلصوں میں سے تھے تو ادائے فرض میں متقاعد کیوں رہے؟ اگر فرض ادا نہ کیا تو ان کی حیثیت یہود و نصاریٰ کی سی ہے اور ایسے لوگوں سے مجھے کوئی غرض نہیں۔

یہ سن کر سب لوگ معذرت کے لیے بڑھے لیکن حافظ صاحب یہ کہتے ہی مسجد سے نکل گئے اور کسی کی معذرت قبول نہ کی۔

مزید حالات معلوم نہ ہو سکے۔

خضر خاں قندھاری یہ یقیناً قندھار یا اس علاقے کے باشندے تھے۔ سید صاحب نے پچوں سے بالاکوٹ کا قصد فرمایا تو ضیاء الدین پھلتی اور خضر خاں کو تھوڑے آدمیوں کے ساتھ درہ بھوگڑمنگ کی حفاظت کے لیے بھیج دیا۔ مولوی نصیر الدین منگلوری پہلے سے وہاں موجود تھے۔ خضر خاں نے بڑے ادب سے عذر کیا کہ جنگ درپیش ہے۔ اس موقع پر ہم حضرت کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتے۔ اجازت دیجیے کہ ہم ہم رکاب ہوں اور بھوگڑمنگ میں کسی دوسرے آدمی کو بھیج دیجیے۔ سید صاحب نے سمجھایا کہ جہاں بھی آپ کو رکھا جائے گا آپ جہاد ہی کا فرض انجام دے رہے ہوں گے۔ آخر امتثالِ امر میں خضر خاں کو بھوگڑمنگ جانا پڑا۔

عبدالرحیم یہ مسلم منشی محمدی انصاری کا رفیق تھا۔ منشی صاحب نے اپنی بندوق اسے دے رکھی تھی لیکن تاکید کر دی تھی کہ اگر جنگ چھڑ جائے تو بندوق فوراً میرے پاس پہنچا دینا۔ فتح ہنڈ کے بعد مخالفوں کی یورشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ منشی صاحب اور عبدالرحیم ہنڈ ہی میں تھے۔ ایک روز عبدالرحیم اونٹ چرانے

سید صاحب کے پاس پہنچانے کے لیے پانچ روپے اُجرت طے ہوئی۔ موقع پا کر اس کی رہنمائی میں چھپ چھپا کر نکلا، راج دواری میں سید صاحب کے پاس پہنچ گیا اور اپنی اسیری کی کہانی سنائی ۔

سر کا زخم بدستور تھا۔ نور بخش جراح نے زخم دیکھا تو کہا کہ پہلے معالج نے بدخواہی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ سر کی ہڈی کا ایک حصہ خراب ہو چکا ہے، اور اسے کاٹے بغیر زخم اچھا نہیں ہو سکتا۔ حافظ الٰہی بخش نے صبر و سکون سے ہڈی کٹوا کر پٹی بندھوائی۔ مجاہدین نے چاہا کہ اسے اٹھا کر بستر پر پہنچا دیں۔ اس نے انکار کر دیا اور کہا کہ میرے پاؤں زخمی نہیں ہوئے جو اٹھانے کی ضرورت ہو۔ تھوڑی دیر بستر پر لیٹا رہا۔ پھر خود اٹھ کر ایک ایک ڈیرے پر گیا۔ تمام مجاہدین سے ملا۔ سب اس کی جرأت اور تحمل و تشدد پر حیران تھے ۔

سید عبداللہ سرام پوری | سید عبداللہ کے والد ماجد کا نام سید بہادر علی شاہ تھا۔ معلوم نہیں انھوں نے کس زمانے میں سید صاحب سے ارادت کا رشتہ قائم کیا۔ اتنا معلوم ہے کہ آپ نے انھیں خلافت دے دی تھی۔ سید عبداللہ نے سرام پور میں ایک مطبع قائم کر دیا تھا، جس میں بہت سی دینی کتابیں چھپیں۔ سید صاحب کے خواہرزادے سید احمد علی سفرِ حج میں ساتھ نہ آئے تھے بلکہ بعد میں لکھنؤ سے کلکتہ پہنچے تھے اور آتے وقت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی کے ترجمہ قرآن کا ایک قلمی نسخہ بھی ستر روپے میں خرید لائے تھے۔ سید صاحب نے یہ نسخہ طباعت کی غرض سے سید عبداللہ کے حوالے کر دیا تھا ۔

شیخ عبداللطیف تاجر | یہ مرزاپور میں رہتے تھے اور وقت کے بہت بڑے تاجر مانے جاتے تھے۔ سید صاحب سفرِ حج کے لیے نکلے تو شیخ عبداللطیف نے چار ہزار روپے آپ کی خدمت میں پیش کیے اور خود بھی والدہ کو ساتھ لے کر حج کے لیے تیار ہو گئے۔ سید صاحب کلکتہ میں ٹھہرے رہے۔ شیخ عبداللطیف کسی جہاز میں سوار ہو کر آپ سے پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے اور سید صاحب کے ورود پر پہلے دن پورے قافلے کی دعوت کی۔ مدینہ منورہ کے سفر میں غالباً سید صاحب کے ساتھ تھے۔ وہاں سردی زیادہ محسوس ہونے لگی تو شیخ عبداللطیف نے کمل خرید کر سید صاحب کے تمام ہمراہیوں کو ۔ ۔ ۔ دے دیے تھے۔ سفرِ مراجعت میں سید صاحب کا قافلہ مرزاپور پہنچا تو شیخ عبداللطیف پہلے واپس آ چکے تھے۔ انھوں نے قافلے کی دعوت کی ۔

قاضی امین الدین احمد | یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے وکیل تھے۔ مرکزی عدالت میں تمام مقدمے ان کی وساطت

سے پیش ہوتے تھے اور حق وکالت کی تنی قسم پو جاتی تھی کہ سر نیچنے کے اختتام پر تیس چالیس ہزار کی تھیلیاں ہاتھی پر لد کر ان کے گھر پہنچتی تھیں۔

سید صاحب کے ساتھ خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ جب معلوم ہوا کہ آپ بڑے قافلے کے ساتھ حج کے لیے آ رہے ہیں تو منشی صاحب نے ایک وسیع کوٹھی خریدی جس کے ساتھ باغ تھا اور اس میں تین تالاب تھے۔ مردانہ کرے الگ تھے اور زنانہ الگ۔ ہگلی پہنچ کر سب سے پہلے سید صاحب کو مع قافلہ اپنا مہمان بنا لیا۔ آپ کے کلکتہ پہنچنے کے دن پینس، ڈولیاں، بگھیاں، کرانچیاں، ہوادار وغیرہ سواری کے لیے اور چھکڑے بار برداری کے لیے لے کر کنارہ دریا پر پہنچے ہوئے تھے۔ پھر دونوں وقت پورے قافلے کے لیے نہایت پرتکلف کھانا پہنچاتے رہے۔ مثلاً ماہی پلاؤ، بکرے کا پلاؤ، قورما، شیرمال، باقرخانیاں، کئی قسم کے مربے اور اچار کئی قسم کے میٹھے۔ پہنچتے ہی دو ان قافلے میں سے ضرورت مندوں کے لیے تین سو روپے کے جوتے اور ایک ہزار کے کپڑے خرید دیے۔ قیام کلکتہ کے دوران میں قافلے کا خرچ منشی صاحب ہی نے برداشت کیا۔ رخصت کے وقت پانچ ہزار روپے، خوبصورت گٹھڑیاں، رفیقوں کے لیے جوتے اور کپڑے پیش کیے۔ پانچ ہزار دیگر نقد کر دیے کہ ممکن ہے بعض اوقات کسی کو کھانا مزاج کے مطابق نہ ملا ہو اور اس نے پیسے خرچ کر کے بازار سے کھایا ہو۔ غرض سرسری اندازے کے مطابق منشی صاحب کا خرچ چالیس پچاس ہزار سے کم نہ ہوا ہوگا۔ منشی صاحب خود بھی مرید ہوئے اور سید صاحب نے اپنی سر کی دستار ان کے سر پر رکھ دی۔

شیخ علی جان | یہ دانا پور میں رہتے تھے۔ اصل وطن ونگیا تھا۔ اس زمانے میں سفر کا سب سے اچھا اور عمدہ ذریعہ کشتیاں تھیں اور ہزاروں لوگ کشتی رانی میں مصروف تھے۔ شیخ علی جان ان کشتی بانوں کے چودھری تھے۔ سید صاحب حج کے لیے گئے تھے تو اس زمانے میں بھی شیخ علی جان کے مہمان ہوئے تھے۔ مراجعت میں بھی ان کے مکان پر ٹھہرے۔ یہیں ایک شخص بارادۂ قتل آیا تھا لیکن سید صاحب کا چہرہ مبارک دیکھتے ہی ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ پاؤں پر گر کر معافی مانگ لی۔

سید صاحب کے ساتھ ملاقات سے پیشتر شیخ صاحب کی وضع قطع اس درجہ ہندوانہ تھی کہ نام بتائے بغیر کوئی جان ہی نہ سکتا تھا کہ آپ مسلمان ہیں۔

سید صاحب سرحد چلے گئے تو آپ کے دو ساتھی میاں دین محمد ایک مرتبہ دانا پور بھی پہنچ گئے۔ شیخ علی جان نے محبت سے اپنے پاس ٹھہرایا۔ اپنی طرف سے چند اشرفیاں اور عیال کی طرف سے چھ سو روپے پیش کیے۔ میاں صاحب فرماتے ہیں کہ شیخ صاحب کی حالت بالکل بدل چکی تھی۔ وہ پکے خدا پرست مسلمان بن چکے تھے۔ مسافروں کی امداد و اعانت کا انھیں بہت خیال تھا۔ ضرورت مندوں کو ان کی ضرورت کے مطابق پانسو روپے تک امداد دینے کے لیے مستعد رہتے تھے۔ ایک باغ انھوں نے صرف اس غرض سے وقف کر دیا تھا کہ آتے جاتے مسافر اس میں آرام سے ٹھہریں۔ قیام کے علاوہ ان کے طعام کا بھی بخوبی بندوبست ہوتا تھا۔

دوران جہاد میں اطراف بہار کے ارادت مندوں کی اعانتی رقوم شیخ علی جان ہی کے پاس جمع ہوتی تھیں۔

صدر الدین قصاب | یہ بھی دانا پور ہی کے تھے۔ سید صاحب سے انتہائی اخلاص رکھتے تھے۔ عام مسلمانوں خصوصاً مسافروں کی خدمت میں ہر لحظہ سرگرم رہتے تھے۔ سو پچاس آدمی روزانہ ان کے ہاں کھانا کھاتے تھے۔ اولاد نہ تھی۔ عبدالرحیم نام ایک یتیم بچے کو بیٹا بنا لیا تھا۔ ایک وسیع باغ لگوایا جس میں آم، بیر، نارنگی اور جامن کے درخت تھے اور اسے صرف مسافروں کی مہمان داری کے لیے وقف کر دیا۔ عبدالرحیم کو تاکید کر دی تھی کہ خود دونوں وقت مسافروں کے ساتھ کھانا کھائے۔

میاں دین محمد (سید صاحب کے خاص) ایک مرتبہ دانا پور گئے تو صدر الدین نے چار سو روپے مستورات کی طرف سے اور تین سو اپنی طرف سے بطور نذر پیش کیے۔

بابا بہرام خاں تنولی | یہ علاقہ تنول کے رؤسا میں سے تھے۔ نوجوانی ہی میں سید صاحب سے وابستہ ہو گئے تھے۔ حملۂ اٹک اور جنگ پنجتار میں بھی شریک تھے۔ بالاکوٹ میں بھی ان کی شرکت مسلّم ہے اور سید صاحب کی شہادت کے متعلق ایک روایت ان کی بھی "سید احمد شہید" میں درج ہو چکی ہے۔ واقعۂ بالاکوٹ کے بعد غالباً کسی تحریک میں شریک نہ ہوئے۔ لمبی عمر پا کر ۱۹۲۱ء میں فوت ہوئے۔ میرے عزیز دوست اور بھائی سید مبارک شاہ مرحوم گنڈی بابا صاحب کے نواسے تھے۔ سید عبدالجبار شاہ صاحب ستھانوی نے ان کی بہت سی روایات محفوظ کر لی تھیں جو ان کی کتاب "عبرۃ لاولی الابصار" میں درج ہیں۔

محمود خاں لکھنوی : بالاکوٹ کے شہدا میں سے بعض اکابر کے حالات الگ لکھے جا چکے ہیں۔ اکثر کے متعلق

ن کے سوا کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ انھوں نے شہادت پائی۔ جن اصحاب کے متعلق مختصر سی معلومات مل سکیں ان کا

ذکر ذیل میں درج ہے:

جب سکھ شکست کھا کر پہاڑ پر چڑھنے لگے مجاہدین نے ان کا تعاقب کیا تو تلوار دانتوں میں لی اور ایک سکھ کی ٹانگیں پکڑ کر نیچے کھینچنے لگے۔ سکھ کا ایک ساتھی اسے اوپر کھینچ رہا تھا۔ آخر محمود خاں نے ایسا زور مارا کہ سکھ نیچے کھنچ آئے۔ دونوں لوٹتے پوٹتے نالے میں گرے اور ختم ہو گئے۔

مہربان خاں: یہ بانگر مئو کے تھے۔ میاں نجم الدین نے دیکھا کہ زخموں سے نڈھال ہو کر چت پڑے ہیں۔ انھوں نے پانی مانگا۔ میاں صاحب نے کہا کہ میاں پانی کہاں سے لاؤں۔ بولے اگر پانی نہیں لا سکتے تو میری گردن میں ہمیانی کی حمائل ہے اسے کھول کر لے جاؤ۔ میاں صاحب عجلت میں یہ کام بھی انجام نہ دے سکتے تھے۔ مہربان خاں نے خود کہا کہ آپ جلد نکل جائیں۔ یہ میدان ہی میں جاں بحق ہوئے۔ یہ خاص سواروں کی جماعت میں شامل تھے۔ شہادت کے وقت چالیس سال کی عمر ہوگی۔

حسن خاں بنارسی: یہ زخموں سے چور ہو گئے تو میدان جنگ سے آہستہ آہستہ بالاکوٹ پہنچ گئے۔ وہاں پہنچتے ہی خون بہنے سے غنودگی طاری ہو گئی۔ ایک سکھ نے ان کا لنگوٹ اتارنا چاہا تو یہ ہوشیار ہو گئے۔ بیٹھے بیٹھے تلوار اٹھا کر سکھ کو قتل کر دیا۔ دوسرے سکھ نے انھیں شہید کر ڈالا۔

باقی اصحاب: باقی شہدا کی کیفیت یہ ہے:

۱۔ عبدالغفور غازی پوری کے سر میں گولی لگی۔

۲۔ غازی الدین جن کا وطن معلوم نہ ہو سکا۔

۳۔ اللہ بخش باغپتی نے گھمسان کے رن میں گھس کر شہادت پائی۔

۴۔ مولوی محمد قاسم پانی پتی کے چھوٹے بھائی محمد حسن۔

شادل خاں گنج پوری: یہ سید صاحب کے قدیم رفیقوں میں سے تھے۔ ان اصحاب میں شامل تھے جو دہلی سے مرادآباد کا دورہ شروع ہونے کے وقت سید صاحب کے ہم رکاب تھے۔ جنگ شیدو میں سید صاحب زہر کے باعث سخت بیمار ہو گئے تو شاہ اسمٰعیل نے انھیں ہاتھی پر سوار کرایا۔ خود سید صاحب نے فرمایا کہ

جو سفید گھوڑا ہمیں فتح خاں پنجتاری نے دیا ہے اس پر شادی خاں گنج پوری سوار ہو اور فتح خاں کے سواروں میں شامل رہے۔

سید صاحب نے اپنے بھانجے سید حمید الدین کو ہندوستان بھیجا تو وہ شادی خاں کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ غالباً یہ دوبارہ میدانِ جہاد میں نہ پہنچ سکے اور سید حمید الدین ہی کے ساتھ ٹونک رہے۔

فقیر محمد خاں آفریدی شعر و ادب میں یہ نام کے بجائے تخلص یعنی گویا ہی سے زیادہ مشہور ہیں۔ یہ ابتدا میں نواب امیر خاں کے رفیق تھے۔ وہیں سید صاحب سے گہرا تعلق پیدا ہوا۔ پھر لکھنؤ میں ملازم ہو گئے اور بڑا عروج حاصل کیا۔ حسام الدولہ خطاب پایا۔ سلطنت اودھ کے ممتاز سالارانِ فوج میں سے تھے۔ سید صاحب سے ان کی عقیدت مدت العمر قائم رہی۔ معتمد الدولہ آغا میر نے انھیں کی وساطت سے فقیر آباد کے معاملے میں سید صاحب کے طرزِ عمل کی حمایت کی تھی اور لکھنؤ بلایا تھا۔ رخصت کے وقت پانچ ہزار روپے بطور نذر پیش کیے تھے جو سید صاحب نے فقیر محمد خاں ہی کے پاس چھوڑ دیے۔ آپ حج کے لیے روانہ ہوئے تو سید احمد علی یہ رقم لے کر کلکتہ پہنچے۔ ان کی اولاد ملیح آباد میں رہتی ہے۔ شبیر حسن خاں جوش ان کے پوتے ہیں۔

استاد یوسف آہن گر ان کے حالات کہیں سے معلوم نہ ہو سکے۔ روایتوں میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان کا ذکر آیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں اسلحہ سازی میں خاصی مہارت حاصل تھی۔ غالب ہے کہ ان سے بندوقوں اور تلواروں کی اصلاح و درستی کا کام لیا جاتا ہو، یا نئی بندوقیں بناتے ہوں، جو سید صاحب کے لشکریوں کا ایک خاص ہتھیار تھا۔ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ یہ واپس ہو گئے یا سرحد ہی میں فوت ہوئے۔

تیسواں باب

مختلف اصحاب

(۴)

مولانا حیدر علی رام پوری یہ مولانا سید محمد علی رام پوری کے بھائی تھے۔ دہلی میں پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت معلوم نہ ہو سکی۔ ابتدائے عمری میں رام پور چلے گئے۔ نوعمری میں مولانا سید غلام جیلانی رام پوری، مولانا عبدالرحمٰن کوہستانی اور شیخ رستم علی رام پوری کے شاگرد تھے۔ لکھنؤ میں ملا مبین سے تعلیم حاصل کی، پھر دہلی میں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالعزیز سے استفادہ کیا۔ نیز حکیم شریف خاں صاحب سے طب پڑھی۔ "تذکرۂ علمائے ہند" میں مرقوم ہے کہ علم طب میں انھیں ید طولیٰ حاصل تھا۔ سید ابوالحسن علی فرماتے ہیں کہ "ذکاوت، سرعت ادراک، جامعیت معقول و منقول، کتاب و سنت اور اختلاف ائمہ سے واقف، تبحر علمی میں سرآمد روزگار اور علوم حکمیہ میں بحر زخار تھے"[1]۔ مولانا سید غلام جیلانی کی صاحبزادی سے شادی کی۔ کلکتہ بھی گئے۔ نواب احمد علی خاں فرمانروائے رام پور کے آخری زمانے میں ٹونک پہنچ گئے۔ نواب موصوف نے انھیں کے ہاتھ پر نیابتاً بیعت جہاد کی تھی۔ اس سلسلے میں نواب کا مکتوب ان کے حالات میں درج ہو چکا ہے۔ نواب وزیر الدولہ نے ربیع الاول ۱۲۶۳ھ (مارچ ۱۸۴۷ء) میں انھیں عہدۂ دیوانی پر مامور فرما دیا[2]۔ اس عہدے کے فرائض انجام دینے کے علاوہ درس بھی دیتے تھے اور طبابت بھی کرتے تھے۔ ۱۴۔ ذی حجہ ۱۲۷۳ھ (۱۰۔ اگست ۱۸۵۷ء) کو ٹونک میں وفات پائی[3]۔ سید صاحب کے خلفائے خاص میں سے تھے۔ "تذکرۂ علمائے ہند" میں ان کی دو کتابوں کا ذکر ہے (۱) "صیانت الناس عن وسوسۃ الخناس" بہ زبان اردو۔ (۲) "رسالہ رفع الیدین" بہ زبان فارسی[4]۔

---

[1] "سیرت سید احمد شہید" طبع دوم صفحہ ۳۹۳۔ [2] "حدیقۂ راجستان ٹونک" صفحہ ۲۲۔

[3] "حدیقۂ راجستان ٹونک" صفحہ ۱۶۲۔ [4] "تذکرۂ علمائے ہند" صفحہ ۵۵۔

مولانا غلام جیلانی رامپوری | یہ وقت کے اکابر علماء میں سے تھے۔ ابتداء ہی میں سید صاحب سے گہرا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔ حسن عقیدت کا یہ عالم تھا کہ سید صاحب رامپور سے روانہ ہونے لگے تو مولوی غلام جیلانی باوجود علم وفضل اور باوصف کبرسن رکاب میں پیادہ پا دوڑا کیے۔ سید صاحب نے منع فرمایا تو آپ تعمیل حکم میں ٹھہر گئے اور روتے ہوئے بولے: "اے کاش! جوانی کی قوت ہوتی تو رکاب خالی میں برابر دوڑتا رہتا۔"

سید صاحب کے مجموعۂ مکاتیب میں ان کے نام ایک خط بھی ہے جو ۶ - ذی حجہ ۱۲۴۳ھ کو تختہ بند علاقہ بنیر سے بھیجا گیا تھا۔ مولوی صاحب نے لکھا تھا کہ بہت سے مخلص لوگ جہاد کے لیے تیار ہیں۔ لیکن ان کے پاس سامان سفر موجود نہیں۔ سید صاحب نے فرمایا کہ یہ امر باعث حیرت ہے۔ توکل اور ایمان باللہ کو مدارکار بنائیں۔ تمام مومنوں میں نفیر عام کی صدا بلند کریں اور خدا پر بھروسا کرتے ہوئے چلے آئیں۔

مولوی کرامت علی جون پوری | مولوی صاحب موصوف جون پور کے محلہ ملا ٹولہ میں ۱۸ - محرم الحرام ۱۲۱۵ھ (۱۱ - جون ۱۸۰۰ء) کو پیدا ہوئے۔ سلسلۂ نسب پینتیس واسطوں سے حضرت صدیق اکبرؓ تک پہنچتا ہے۔ علوم دینیہ مولانا قدرت اللہ ردولوی سے، فن حدیث مولانا احمد اللہ انامی سے اور معقول مولانا احمد اللہ چریا کوٹی سے حاصل کیے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں سید صاحب سے بیعت کی اور آپ نے مولوی صاحب کو دعوت و تبلیغ پر مقرر فرما دیا۔ پہلے جون پور میں تبلیغ دین اور رد بدعات کا کام انجام دیتے رہے۔ پھر بنگال چلے گئے اور زندگی کے باقی ایام وہیں دعوت و تبلیغ میں بسر کیے۔ کم و بیش اکاون سال خدمت دین کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ جا بجا درسگاہیں قائم کیں۔ عموماً کشتی پر سفر کرتے تھے۔ اس میں بھی درس و تدریس برابر جاری رہتی۔ ۳ - ربیع الثانی ۱۲۹۰ھ (۳۱ - مئی ۱۸۷۳ء) کو رنگ پور میں وفات پائی۔ وہیں دفن ہوئے۔ ان کے دو فرزند تھے: مولانا حافظ احمد اور مولانا حافظ عبدالاول۔ دونوں علم وفضل میں ممتاز مانے جاتے تھے۔ ان کا بھتیجا مولوی محمد محسن بھی وقت کا بہت بڑا عالم تھا۔ مولوی کرامت علی صاحب نے بے شمار کتابیں لکھیں۔ چوالیس کتابوں کی فہرست "تذکرۂ علمائے ہند" میں درج ہے۔

مولانا عبدالقیوم بڑھانوی | یہ مولانا عبدالحی کے اکلوتے فرزند تھے۔ عہد طفلی میں سید صاحب کے ساتھ سرحد گئے۔ مولانا عبدالحی نے ٹھہر میں وفات پائی تو مولانا عبدالقیوم کو ان کے ماموؤں کے ساتھ ہندوستان

بھیج دیا تا کہ والدہ ماجدہ کے لیے تسلی کا سامان بن سکیں۔ مولانا عبدالحی نے اسی زمانے میں بیعت کرا دی تھی جب سید صاحب دوآبے کا دورہ کرتے ہوئے بڑھانہ پہنچے تھے۔

مصر سے ہندوستان آکر شاہ محمد اسحٰق اور شاہ محمد یعقوب سے علم حاصل کیا۔ اس کے بعد غالباً مکہ معظمہ چلے گئے۔ شاہ محمد اسحٰق کی صاحبزادی سے ان کی شادی ہوئی۔

نواب سکندر جہاں بیگم والیہ بھوپال حج کے لیے مکہ معظمہ گئیں تو مولانا کے زہد و تقویٰ اور علم و فضل کو دیکھ کر بھوپال تشریف لانے کی زحمت دی۔ آپ آئے اور خاصی مدت تک وہاں مقیم رہے۔ ایک مرتبہ بیگم صاحبہ نے فرمایا کہ وہ اپنی اہلیہ کو محل میں بھیجیں۔ آپ نے انکار کر دیا۔ موصوفہ نے پیغام بھیجا کہ میں خود ان سے ملاقات کے لیے آنا چاہتی ہوں تو کہا: آپ پردہ نہیں کرتیں، اس لیے اجازت نہیں دے سکتا۔ برقع اوڑھ کر آئیں تو ملاقات کر سکتی ہیں۔

جس حد تک مجھے علم ہے، خرابی صحت کی بنا پر بڑھانہ آ گئے تھے اور وہیں ۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء) میں فوت ہوئے۔ غالباً اسی سال کی عمر پائی۔

مولوی خرم علی بلہوری | بلہور کانپور کے مضافات میں سے ہے۔ مولوی صاحب موصوف نے لکھنؤ میں سید صاحب سے بیعت کی تھی۔ اس کے بعد خدمت دین میں مشغول ہو گئے۔ مشہور ہے کہ سید صاحب کے ساتھ جہاد کے لیے سرحد گئے تھے، وہاں سے واپس آ گئے۔ غالباً سید صاحب نے انھیں دعوت و تبلیغ کے لیے مقرر کر دیا۔ رد بدعت اور احیائے سنت میں بہت سرگرم تھے۔ ۱۲۵۰ھ میں نواب ذوالفقار بہادر رئیس باندہ کے حکم سے "در مختار" شرح "تنویر الابصار" کا ترجمہ شروع کیا۔ محرم ۱۲۷۱ھ میں کتاب الحج تک ترجمہ مکمل کر چکے تھے۔ اسی سال وفات پائی۔ مولوی محمد احسن نانوتوی نے مولوی خرم علی صاحب کے وارثوں سے اس کتاب کا حق تالیف خرید لیا اور "غایۃ الاوطار" کے نام سے اسے شائع کر دیا۔ یہ ترجمہ نا تمام رہا۔ "مشارق الانوار" کا بھی ترجمہ کیا۔ "نصیحۃ المسلمین" ان کی مشہور کتاب ہے۔ "جہادیہ" منظوم ہے جس میں جہاد کے فضائل بیان کیے ہیں۔ سید صاحب کے لشکر میں "جہادیہ" جنگ کے وقت پڑھی جاتی تھی۔

مولوی سخاوت علی جونپوری | جونپور سے گیارہ میل جنوب میں مونڈیہو نام ایک قصبہ ہے جہاں

مولوی صاحب موصوف سنہ [illegible]ھ میں پیدا ہوئے۔ وقت کے مشاہیر علماء سے علم حاصل کیا۔ سید صاحب سے بیعت کی۔ ساری عمر حسبۃً للہ درس و تدریس میں گزار دی۔ جون پور کی مسجد شاہی میں ایک مدرسہ قرآنیہ بھی قائم کیا تھا، جس نے بکثرت حفاظ پیدا کیے۔

نواب ذوالفقار بہادر والی باندہ نے اپنے ہاں دو سو روپیہ ماہانہ پر بلایا تھا۔ کچھ مدت بعد والدہ کی پیری کا خیال کرتے ہوئے وطن واپس آگئے۔ آخر عمر میں ہجرت کر کے مکۂ معظمہ چلے گئے تھے۔ وہیں بہ عمر سنہ ۱۲۷۱ھ (۲۰۔ مئی ۱۸۵۵ء) کو انتقال کیا اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔ ان کے دو فرزند پہلی شادی سے تھے اور دو دوسری شادی سے۔ مولانا ابوبکر محمد شیث مرحوم ناظم شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی مولوی سخاوت علی کے پوتے اور مولوی ابوالخیر محمد مکی کے صاحبزادے تھے۔ مولوی فتح علی جون پوری جو جہاد میں سید صاحب کے ساتھ تھے، مولوی سخاوت علی کے اقربا میں سے تھے۔

مولوی حبیب اللہ قندھاری افغانستان کے علماء میں یہ پہلے شخص ہیں جن میں حدیث کا صحیح ذوق پیدا ہوا۔ ایران سے یہ ذوق افغانستان بھر میں پھیلا۔ موصوف نے اس زمانے میں سید صاحب سے استفادہ کیا تھا، جب آپ بسلسلۂ ہجرت قندھار پہنچے تھے۔ مولانا سید عبداللہ غزنوی نے بھی مولوی حبیب اللہ قندھاری ہی سے مختلف مسائل حل کیے اور غالباً انھیں کے ذریعے سے تقویۃ الایمان کا فارسی ترجمہ مولانا عبداللہ کی نظر سے گزرا۔

مولانا عبداللہ علوی یہ مئو قائم گنج ضلع فرخ آباد کے باشندے تھے۔ مدت تک دہلی میں رہے۔ شاہ اسمٰعیل شہید سے علم حاصل کیا۔ اور سید صاحب کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کر لی تھی۔ نظم و نثر میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ مولوی امام بخش صہبائی انھیں کے شاگرد ہیں۔ طبابت میں بھی یدِطولیٰ حاصل تھا۔ آخر عمر میں نواب سید محمد علی خاں بہادر شمس آبادی کے ہاں ملازم ہو گئے تھے۔ وہیں سنہ ۱۲۶۲ھ میں عارضۂ تپ محرقہ سے وفات پائی۔[1] اصلاً فارسی کے شاعر تھے، کبھی کبھی اردو میں بھی کہہ لیتے تھے۔

---

[1] تذکرۂ شمع انجمن [illegible]۔ نساخ نے تاریخ وفات سنہ ۱۲۶۳ھ لکھی ہے (سخن شعراء صفحہ ۳۲۲) لیکن نواب صدیق حسن خاں کی روایت زیادہ مستند ہے۔

حکیم مومن خاں مومن حکیم غلام نبی خاں کے فرزند تھے۔ ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ء) میں پیدا ہوئے۔ شاہ عبد القادر سے عربی کی کتابیں پڑھیں۔ والد اور چچا سے طب کی تعلیم پائی۔ نجوم میں بھی کمال حاصل کیا۔ لیکن شہرت کی بنیاد ان کی شاعری ہے۔ فارسی کلام بھی بہت پختہ تھا۔ افسوس کہ فارسی دیوان صرف ایک مرتبہ چھپا۔ اب ناپید ہے۔ اردو کلیات میں غزلیں، قصیدے، مثنویاں، رباعیاں اور قطعات سب کچھ موجود ہے۔

سید صاحب سے بیعت کی۔ آپ کی مدح میں مومن نے جو کچھ کہا، وہ اس کتاب میں دوسری جگہ درج ہو چکا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا دل سید صاحب کے عشق سے لبریز تھا۔ ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ء) میں وفات پائی۔ مہدی پورہ میں شاہ ولی اللہ کے خاندانی مقبرے کے پاس دفن ہوئے۔

میاں دین محمد یہ سید صاحب کے خادم خاص تھے۔ جس حد تک میں اندازہ کر سکا ہوں، یہ اصلاً غیر مسلم تھے۔ سید صاحب نے انھیں اپنی تربیت میں لے لیا اور اس زمانے میں مسلمان کیا، جب آپ نواب امیر خاں کے ساتھ تھے۔ اس وقت سے میاں دین محمد سید صاحب کے ساتھ رہے۔ سید صاحب کے ساتھ جہاد پر گئے اور وہاں سے کئی مرتبہ انھیں ہندوستان بھیجا گیا۔ سید صاحب کے تمام نیازمند ان کی بہت عزت کرتے تھے۔ بڑی بڑی رقمیں انھیں کے ذریعے سے سید صاحب کی خدمت میں پہنچیں۔ آخری عمر میں ٹونک آ گئے تھے۔ غالباً وہیں وفات پائی۔ نواب وزیر الدولہ نے ان کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

میاں جی نظام الدین چشتی یہ بڑھانہ کے باشندے اور سید صاحب کے خاص رفیق تھے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔ جنگ بالاکوٹ سے ایک دن پہلے سید صاحب نے کنہار کا پل تڑوا دیا تھا۔ اس موقع پر میاں جی نظام الدین بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا کہ جب لڑائی کی نوبت آئی اور میں نے جناب الٰہی میں دعا کی تو اک گونہ تسکین پیدا ہو گئی۔ میں سمجھ لیتا کہ انجام بخیر ہوگا۔ موجودہ جنگ کے سلسلے میں کئی مرتبہ مراقبہ بھی کیا اور دعا بھی، لیکن تسکین کی کوئی صورت نہ نکلی۔ خدا جانے کیا پیش آنے والا ہے۔

یہ امر یقینی ہے کہ میاں جی نظام الدین چشتی بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ جو لوگ سید صاحب کے غائب ہو جانے کا عقیدہ رکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ میاں جی نظام الدین چشتی بھی ساتھ ہی غائب ہوئے اور ساتھ ہی ظاہر ہوں گے۔

شیخ محمد تقی | یہ انگریزی فوج میں گوشت کے ٹھیکیدار تھے۔ اسی زمانے میں سید صاحب سے بیعت کی جب آپ نے نواب امیر خاں سے الگ ہو کر جہاد کی مستقل تنظیم کی تھی اور تبلیغی و اصلاحی دوروں کا آغاز ہوا تھا۔ بعد میں انھوں نے کمسریٹ کے ٹھیکے بھی لیے اور بہت دولت پیدا کی۔ ۲۔ دسمبر ۱۸۵۵ء کو شیخ صاحب نے اپنی غیر منقولہ جائداد کا ایک حصہ جس کی قیمت کا اندازہ اس زمانے میں سوا لاکھ سے کم نہ تھا، دینی اور خیری امور کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اسی جائداد کا ایک حصہ انارکلی لاہور کی وہ عمارت بھی تھی جو سرے محمد شفیع کے نام سے مشہور رہی اور اب عالی شان ہوٹل کی صورت میں منتقل ہو چکی ہے۔ محمد شفیع، شیخ محمد تقی کا بڑا بیٹا تھا، وہ ۱۸۶۴ء کے مقدمہ سازش مجاہدین میں ماخوذ ہوا تھا۔ اس کے حالات کتاب کی آئندہ جلد میں بیان ہوں گے۔

شیخ محمد تقی نے ۸۔ اکتوبر ۱۸۶۲ء کو وفات پائی۔ آپ سید صاحب کے بڑے ہی مخلص ارادت مند تھے۔

متفرق اصحاب | بعض اصحاب کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ سرسری کیفیت ذیل میں درج ہے:

۱۔ آخوند ظہور اللہ: جہانگیرہ صوبہ سرحد کے باشندے تھے۔ ابتدا سے سید صاحب کے ساتھ رہے۔ تنخواہ دار فوج انھیں نے بھرتی کی تھی۔

۲۔ عبد القیوم اور امانت علی: مجروحین اکوڑہ کی تیمارداری کے لیے نوشہرہ میں ٹھہرے رہے۔

۳۔ حیات خاں اور برکت اللہ: یہ دونوں واقعہ حضرو کے بعد جنگ مایار میں شہید ہوئے۔

۴۔ شیخ نظام الدین، محمد صالح، ورتن: شیخ فیض الدین ملتان کے اور باقی دو سندھ کے تھے۔ یہ جنگ [illegible] میں مجروح ہوئے۔

۵۔ حاجی عبد اللہ رام پوری: یہ جہاد میں ساتھ رہے۔ واقعہ بالاکوٹ کے بعد ٹونک میں چلے گئے تھے۔ نواب وزیر الدولہ نے انھیں غالباً رسالدار بنا دیا تھا۔ ٹونک ہی میں وفات پائی۔

خاتمہ: یہ سید صاحب کے ان رفیقوں کی سرسری سرگزشت تھی جو آپ کی زندگی میں شہید یا فوت ہوئے یا ان کے ساتھ شہادت پائی یا جنھوں نے سید صاحب کے بعد تحریک کے کسی شعبے میں حصہ نہ لیا یا بہ درجۂ آخر سمجھے گئے کہ روایات و بیانات کا جو ذخیرہ ہمارے سامنے آیا اس میں سید صاحب کی شہادت کے بعد ان کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ ہم نے صرف ان مجاہدین کا ذکر کیا، جن کے متعلق کم یا زیادہ حالات معلوم

ہو سکے۔ ممکن ہے بعض اہم اصحاب نظر انداز ہو گئے ہوں۔ نہ تو مقصود استقصا تھا، بلکہ صرف یہ اندازہ دہی کہ سید صاحب کی تربیت کے کچھ نمونے سامنے آجائیں تاکہ اندازہ ہو سکے اس پاک نفس وجود نے کیسی جماعت تیار کردی تھی جس کی مثال ہندوستان کی اسلامی تاریخ میں بہت ہی کم ملے گی۔

اب صرف ایک مرحلہ باقی رہ گیا اور وہ یہ کہ اس جماعت نے سید صاحب کی شہادت کے بعد ہندوستان کے اندر اور باہر اسلام و مسلمانیت کے احیاء کی خاطر کیسی کیسی قربانیاں کیں۔ یہ سرگزشت آپ اس کتاب کی آئندہ جلد میں ملاحظہ فرمائیں گے جو ۱۸۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک کے حالات پر مشتمل ہے۔

گرد بر پائے کسے براہِ جہاد — گر نشست او راست شد ز نار آزاد

ہر مسلماں کہ او براہِ خدا — کرد یک لحظہ جنگ را برپا

ق

روضۂ خلد شد مکانِ او — عیش و آرام یافت جانِ او

اے برادر بشنو حدیث رسول — از سخن خستہ مباش ملول

زیرِ سایۂ سیوف جنت داں — کہ درآں نیست شک و ریب و گماں

ہر کہ در راہِ حق ز مال و زر — از دل و جاں کند نثار اگر

ثوابش ہست صد بہ حشر اندر — بہرِ او ہست ہفتصد زاں بہتر

ور اگر خرچ کرد و زد شمشیر — ہمچو مردانِ دراں جنگ دلیر

ثوابش ہست ہفتصد ہزار — بے کم و کاست داں و بے تکرار

ہر کہ از مالِ خویش و از اسباب — بہرِ غازی تہیہ کرد شتاب

ہم چو غازی ور او دہند ثواب — در قیامت برائے آں دریاب

ہر کہ نے مال خرچ کرد و نہ جنگ — می شود وقتِ موت دلش تنگ

ہر کہ در راہِ حق شدہ مقتول — ہست او زندہ ہم شدہ او مقبول

شادماں ہست در میانِ جناں — رزقِ او می رسد بہ او ہر آں

ذنبِ عمر ہر چہ شد ز انساں — غیرِ حقِ عباد از عصیاں

محو گردید جملہ بر شہید
کہ برائے خدا سرش ببرید

فتنۂ قبر و صور و ہم محشر — از چنیں صدمہ ہائے پُر خطر

نیست خوفے شہید را زیں ہا — بہرِ او ہست جنت الماویٰ

دوست دارد خدا مجاہد را — کہ چو دیوار کرد صف برپا

ہمچو دیوار محکم و مضبوط
جملہ با ہم بہ یک دگر مربوط

چوں شنیدید اے مسلماناں — از بیانِ جہاد و خوبیِ آں

سوئے میدان راہ را گیرید — خان و ماں را بہ یادِ خود نارید

مال و اولاد و خانمان و زن — حُبِّ ایں جملہ را بروں افگن

در رہِ حق بہ شادی و خنداں — بہ شتابی بروں روید دواں

مال و اولاد ہم بہشت اے جاں — زود در میانِ گور بداں

از مصیبات دوزخ اے دلدار — زود بستاں ایں رہائیے بشمار

گر بمانی تو زندہ جان آئی — بہ سوئے خانہ شادماں آئی

در بمیری تو جنت الماوی

جائے تو ہست ہست خوش آنجا

دینِ اسلام سست گشت ببیں — غلبۂ کفر شد عیاں بہ زمیں

پیشوایانِ دیں کہ بگذشتند — کافراں را بہ امرِ حق کشتند

غلبۂ دیں بہ زورِ شمشیر است — ہر کہ گیرد بدست آں شیر است

سستی اند پیشوا ہمی کردند — گوئے سبقت دریں نمی بردند

ہند آباد کے شدے از اسلام — دینِ اسلام می شدے گمنام

تا بہ کے درمیانِ خانہ چو زن — می نشینی بہ صحبتِ اہل و وطن

غیرِ افسوس ثمرۂ سستی — نیست حاصل ترا بجز چستی

غیرتے کن کن تو نامردی

زود خیز و بیا اگر مردی

زود سوئے امامِ خود بروید — کافراں را کشید و خوش بزیید

بے امام ایں نمی شود حاصل — شرطِ اول امام دان غافل

جملہ بیعت بدستِ او بکنید — بعد ازاں در جہاد خوش بروید

سر زدہ پا زدہ بر خانۂ خویش — مردنت بہتر است اے دل ریش

ق

یا براہ خدا دہی جاں را — بہتر از بہر تست اے خوش راے

گر ندادی تو جاں براہ خدا — پس پشیماں شوی بروز جزا

باز زیں روئے خود چہ پنہانی

پیش پیغمبر بروز رسوائی

لیک شرط است زیر حکم امام — کہ بمانی تو دائماً خوش کام

ورنہ جنگیدن و زدن شمشیر — ہیچ سودے نمی دہد بہ زلیسر

ہر کہ خود بہر جنگ کرد و بمرد — خون زد ناحق است حسرت ببرد

آں کہ دانند خوب مولا را — ہم پیغمبر شفیع روز جزا

از دل و جاں قبول قول امام — می نمایند خوش روند بہ کام

اہل اسلام را بود کافی — اے حسن ایں پیام بس وافی

بر مناجات کن تو ختم کلام

بہر تو بہتر است اے خوش نام

اے خداوند خالق ثقلین — اے خداوند مالک کونین

اے خداوند آسماں و زمین — اے خداوند انس و عرش بریں

دہ تو توفیق اہل ایماں را — تا بہ راحت روند خوش جاں را

قوت خود بدہ و زور آور — اہل اسلام را بکن یاور

وعدۂ فتح خویش کن تمام — آنچہ کردی بہ فضل خود انعام

بندہا مدعا تو از اسلام — اے شہنشاہ مالک انعام

کز نیاید ندا بجز اللہ

کن قبول ایں دعا تو یا اللہ

ضمیمہ ۲

سید عبداللہ سیرام پوری

سید عبداللہ ابن سید بہادر علی کے حالات اختصاراً اوپر درج ہو چکے ہیں۔

کتاب حوالۂ مطبع ہو چکی تھی کہ صدیق مکرم جناب محمد یونس صاحب نے کان پور سے اس قرآن مجید کے آخر کی عبارت نقل کر کے بھیج دی جو سید عبداللہ نے سیرام پور میں چھاپا تھا پھر اصل قرآن مجید ارسال فرما دیا۔ اس سے جو نئے حالات معلوم ہوئے، وہ درج ذیل ہیں:

۱۔ سید عبداللہ کے اجداد مدینہ شریف سے نکل کر ترمذ میں آباد ہوئے۔ پھر لاہور میں آئے۔ وہاں سے سوانا میں مقیم ہو گئے۔

۲۔ سید موصوف نے کلکتہ میں سید صاحب سے بیعت کی تھی اور حج کے لیے ساتھ گئے تھے۔

۳۔ سید احمد علی شاہ عبدالقادر کے ترجمہ قرآن پاک کا جو نسخہ خرید کر لائے تھے، سید عبداللہ نے مکہ معظمہ میں اس کی نقل حاصل کی تھی۔

۴۔ اس میں ترجمہ بطور تفسیر لکھا ہوا تھا یعنی متن کے ٹکڑے نقل کر کے ان کی تفسیر کی گئی تھی۔ سید عبداللہ نے پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے اسے بین السطور لکھوایا۔

۵۔ جہاں جہاں کسی مقام پر شبہ ہوا، تفسیر عزیزی وغیرہ سے مدد لے کر سمجھا اور ایک اور ترجمے سے بھی مدد لی جو سید عبداللہ کے والد سید بہادر علی نیز بعض دوسرے علما نے مل کر کیا تھا۔

۶۔ ترجمے کے چھاپنے میں جو اہتمام کیا گیا، وہ محتاج بیان نہیں۔

۷۔ کاتب نے ۴۔ ربیع الاول ۱۲۵۱ھ (یکم اگست ۱۸۳۵ء) کو کتابت متن و ترجمہ سے فراغت پائی اور قرآن مجید کی طباعت ۲۷۔ جمادی الاولیٰ ۱۲۵۴ھ (۱۸۔ اگست ۱۸۳۸ء) کو مکمل ہوئی۔

ذیل میں وہ عبارت تبرکاً نقل کی جاتی ہے جو سید عبداللہ نے قرآن مجید مترجم کے ساتھ چھاپی تھی۔ اس کے بعض الفاظ مشتبہ ہیں، لیکن میرے پاس ان کی تصحیح و توضیح کا کوئی ذریعہ نہ تھا

مولوی محمد یونس اس عنایت یگانہ کے لیے یقیناً دلی شکریہ کے مستحق ہیں۔ اس مضمون میں ذیلی عنوان میں نے لگائے ہیں تاکہ پڑھنے میں سہولت رہے:

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

بعد حمد حق جل وعلا ونعت خاتم الانبیاء سرور اصفیا کے احقر اعباد سید عبداللہ بن سید بہادر علی بن سید حسن پوتا سید جعفر مدنی پیچھے اس کے ترمذی پیچھے اس کے لاہوری پیچھے اس کے سوانی سب مومنوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے جب اس وقت میں خاکسار نے دیکھا کہ اکثر مسلمان اس سبب سے کہ احتساب اس ملک سے موقوف ہوگیا، ور صحبت اور آمیزش میں غیر قوم کے پھنس گئے اور خطوط اللہ اور رسول اور حاکم کا دل سے جاتا رہا، اسلام کی مستقیم سڑک چھوڑ کر بدعت کے طریق میں آگرے اور بے مزاحمت غیر جو چاہا من مانتا کرنے لگے اور جن کو بڑے مسلمان مرد سے آدمی عرف میں کہتے ہیں اور وہ اپنے تئیں پڑھا عالم جانتے ہیں، انھوں نے بھی طریق وعظ و نصیحت اور سکھانا پڑھانا دینداری کے احکام کا ان کو دنیا کی عزت اور دولت اور جاہ طلبی کے سبب موقوف کیا، اس باعث سے نہایت غم اور غصہ اس خاکسار کی خاطر میں گزرتا تھا۔

ترجمے کی نقل | بعد چند روز کے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ایسا اتفاق ہوا کہ جناب پیر و مرشد برحق امیر المومنین امام المسلمین حضرت سید احمد صاحب دام اقبالہ و برکاتہ حج کے ارادے سے یہاں تشریف لائے۔ یہ خاکسار اور سیکڑوں مسلمان اس جناب پاک کی بیعت کی نعمت حاصل کر کے ان کے ہم رکاب حج حرمین شریفین کی زیارت سے کامیاب ہوئے۔ اور یہ ترجمہ ہندی قرآن شریف کا جو مولانا شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی مرحوم نے کیا ہے، سید احمد علی صاحب جو حضرت پیر و مرشد کے بھانجے ہیں، ان کے پاس دیکھ کر کمال شوق سے اس کی نقل اسی مکان مشرف میں لی اور خیال کیا کہ اگر یہ قرآن شریف مع ترجمہ ہندی اس وقت کے مسلمانوں کو ہاتھ لگے، شاید اپنے پروردگار کا کلام سمجھ کر اس کو دیکھیں اور اس کلام کی برکت سے جو خود خالق کی زبان سے ہے، ان کے دل میں کچھ ہدایت آوے تو آوے، مگر کثرت اس کی بغیر اس کے کہ چھاپا جاوے نہیں ہو سکتی۔

عزم طباعت | تب اس قلیل البضاعت نے بعد مراجعت اس سفر کے مولانا عبدالحی صاحب اور

مولانا محمد اسحٰق صاحب دہلوی اور مولوی حسن علی صاحب لکھنوی کے ایما اور استصلاح سے کمر ہمت اپنی مستحکم باندھی اور ارادہ مصمم کیا کہ جس طرح ہو اس کو چھپوانا چاہیے اور قیمت ایسی مقرر کیجیے کہ اپنا خرچ نکل آوے اور کسی مسلمان بھائی پر جس کو اللہ تعالیٰ نے قرآن سمجھنے کا کچھ بھی ذوق و شوق ادا ہو لے لینے میں بوجھ نہ پڑے اس میں اکثر کچھ مسلمان جو نافہم اور اس کے فوائد دینی سے آگاہ نہ تھے باوجود اس کے کہ آپ دنیا کی دولت اور حیات کی زندگی کے آرام اور نام کے واسطے کیا کیا فکریں اور تدبیریں خلاف شرع کرتے ہیں اور رات دن اعانت اور استعانت میں گمراہوں کے گلے ملے رہتے ہیں، بعضی ادنیٰ باتوں کا عذر درپیش کر کر اس کے انجام ہونے میں خلل انداز ہوے بلکہ اس بات پر طعن کرنے لگے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی مرضی جو اس خاکسار کے ارادے کے موافق ہوئی تو اسی نے اس کو بخوبی انجام کو پہنچایا اور طعن اور حسد کو انھیں پر پھینکا اور خاکسار کو اس کے ضرر سے بچا رکھا بفضلہ وکرمہ۔ آخر اس فقیر نے اپنے پروردگار ہی پر بھروسا کر کے جان و دل سے ہمت باندھی اور نیت اپنی مسلمان بھائیوں کے نفع دینی پہنچانے پر مضبوط اور خالص کی۔ پھر قریب دو برس کے عرصے میں بہت سے روپے خرچ کر کے بڑی محنت اور جانفشانی سے بے معاونت غیر اس کو انجام کیا۔

اہتمام طباعت اور چھاپنے کے وقت خوب اہتمام رکھا کہ کاریگر اس کام کے سب طاہر اور نمازی ہوں اور کسی طرح کی بے احتیاطی اور بے ادبی واقع نہ ہو۔ اس کریم برحق کے فضل سے حسب خواہش دلی جس طرح ارادہ کیا تھا اُسی طرح اتمام کو پہنچا اور چھاپنے کے وقت جہاں شبہ گزرتا تھا کئی قرآن صحیح اور تفسیر عزیزیہ مولانا عبدالعزیز قدس سرہٗ اور تفسیر حسینی اور ایک ترجمہ ہندی اردو کی زبان میں جو اس خاکسار کے والد منشی سید بہادر علی مرحوم اور کئی فاضلوں نے مل کر کلکتے میں کیا تھا موجود تھے۔ اُن نسخوں کی مدد سے وہ عقدہ حل ہو جاتا تھا اور اس قرآن شریف کے اشتہار نامے کے جاری ہونے کے وقت سے بھی یہ التزام کیا ہے کہ سواے اہل اسلام اور کسی قوم کے پاس باوجود فائدہ زاید ہدیہ اس کا نہ ہووے اور اگر کوئی دوسرا دنیا کی طمع سے اپنا دین بیچے اور ایسا کام کرے وہ جانے اور اس کا ایمان اور اس کا کام۔

کیفیت وطن واجداد سوانا ایک بستی کا نام ہے شہر تھانیسر کے تیرہ کوس دکھن دلّی سے پانچ منزل مغرب[1] جس کو اس خاکسار کے اجداد میں سے حضرت شاہ زید شہید سالار لشکر نے لاہور سے مع اپنی برادری

[1] یعنی سوانا تھانیسر سے تیرہ کوس جنوب میں اور دہلی سے پانچ منزل مغرب میں ہے۔ تیرہ کوس کا مطلب تقریباً بیس ہونا چاہیے: اور پانچ منزل کا ستر اسی میل ہے

سیپارے میں سو اس کی پہچان کو کتاب کا نام وہاں ذکر کر دیا اور احوال چھاپے کی کتاب کا خصوصاً جس
میں اعراب ہوں اور چھاپے کے وقت جو نقص اس میں واقع ہوتا ہے اس چھاپے کے قرآن شریف کی پہلی
جلد کے آخیر میں لکھ دیا۔ مگر ضرور نہیں منصفوں اور دانشمندوں کی سمجھ کو اس قدر بس ہے ؀

شکر و سپاس ہزار شکر اس پاک پروردگار کا جس نے محض اپنے فضل و کرم سے شہر جمادی الاولیٰ کی
ستائیسویں تاریخ اور ہجری کی بارہ سو سینتالیس میں اس مطبوعہ قرآن شریف کو مطبع احمدی میں اتمام کو پہنچایا۔ وہ اب اس کی جناب پاک
سے امیدوار ہوں کہ اگر جبلت انسانی کے سبب سے کہیں کچھ بھول چوک یا کسی طرح کی بے ادبی اس نسخہ
سے ہوئی ہو تو یا اللہ یا کریم تو اپنے وصف کریمی اور رحیمی پر نظر کر کے اور صفت ستاری اور غفاری کے صدقہ
سے اور اپنے رسول مقبول اور ان کی آل اور اصحاب کی عزت اور حرمت کے طفیل اس قصور سے بچائیو
اور بخشیو اور میری اس محنت کے کام کو دنیا میں یادگار اور باقیات صالحات ٹھہرائیو اور آخرت میں اس
گنہگار کے ماں باپ کی اور اولاد کی اور بھائی بندوں کی اور رشتہ داروں کی اور دینی دوستوں کی چھوٹے
بڑے جیتے موئے سب کی مغفرت کا وسیلہ کیجیو اور ان میں سے جو اب زندہ ہیں ان کو اور اس کے پڑھنے
والوں کو اور اس کے حکموں پر چلنے والوں کو اور اس چھاپے کے اہلکاروں کو اپنی رضامندی کی راہ پر لا اور
ہدایت نصیب کر۔ آمین ثم آمین یا رب العالمین ؀

الٰہی اس قرآن شریف کے کاتب کو اور اس کے ترجمہ اور فائدے لکھنے والوں کو بھی ان دونوں کے
ماں باپ الیٰ علیہم السلام آدم و حوا جو مسلمان ہوں اور ان کی اولاد اور اقربا اور دوستوں سمیت بلا حساب
اور بے عذاب بہشت میں داخل کر۔ آمین ؀

مترجم کا ترجمہ اس کاتب نے اس قرآن شریف پر لکھنا ہم ۱۲ ماہ ربیع الاول کی چوتھی تاریخ بارہ سو اڑتالیس
ہجری نبوی صلی اللہ علیہ وسلم تیسرا کے دن تمام کو پہنچایا محمد عبد اللہ علی عنہ الحمد رب السموات والارض رب العرش
الکریم وسلام علی المرسلین والحمد للہ رب العالمین ؀

ضمیمہ ۳

سیّد جعفر علی نقوی

سیّد جعفر علی نقوی کے متعلق ان کے خاندان کے ایک فرد سیّد عبدالسلام

(محلہ بشیر گنج کان پور) سے مزید حالات معلوم ہوئے جو خلاصۃً ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

۱- آٹھویں صدی ہجری میں اس خاندان کا پہلا فرد جس کا نام سیّد جلال الدین تھا، ہندوستان آیا اور اس کے افراد اجودھیا کے محلہ سیّد واڑہ میں مقیم رہے۔

۲- غالباً گیارھویں صدی ہجری میں اس کی ایک شاخ مجھوا میر میں مقیم ہوئی، جو پہلے گورکھپور میں شامل تھا۔ آج کل ضلع بستی میں ہے۔

۳- سیّد جعفر علی کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی خاندان میں کی تھی۔ یہ بی بی عمر میں سیّد جعفر علی سے بڑی تھیں۔ دوسری شادی سیّد احمد علی رام پوری کی صاحبزادی سے کی، جن کا نام غالباً فاطمہ بی بی تھا۔ سیّد جعفر علی نے اپنے ایک گاؤں کی آمدنی میں سے ایک چوتھائی حصہ اس بی بی کے مہر میں لکھ دیا تھا۔ ان کے بھتیجے سیّد محمد زکریا نے اس کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔ خاندان کے لوگوں نے مصالحت کرا دی اور طے ہو گیا کہ سیّد جعفر علی کے حصّے میں سے ½ بی بی صاحبہ کے پاس رہے اور ½ سیّد محمد زکریا کو دے دیا جائے۔

۴- سیّد جعفر علی کی صاحبزادی سیّدہ زینب کی شادی محلہ قافلہ ٹونک کے سیّد شریف حسن بن سیّد مہدی حسن سے ہوئی تھی۔ وہی سیّد جعفر علی کے خلیفہ مقرر ہوئے۔ لاولد رہے اور انھیں سیّدہ زینب کے ذریعے سے جو جائداد ملی تھی، وہ اپنے بھائی سیّد لطیف حسن کے نام ہبہ کر دی۔

۵- سیّد جعفر علی کی دونوں بیویاں موجودہ عیسوی صدی کے اوائل تک زندہ رہیں۔ سیّد عبدالسلام لکھتے ہیں کہ میں نے بچپن میں انھیں دیکھا تھا۔ ان کا دستور یہ تھا کہ نماز فجر کے بعد چار پائی پر بیٹھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرتیں۔ روٹیوں کے ٹکڑے کُتر کر پاس رکھتیں اور چڑیوں کو ڈالتی جاتیں۔ چڑیاں ان سے اس قدر مانوس ہو گئی تھیں کہ چار پائی اور بدن پر آ بیٹھتیں۔ ان کے انتقال سے دس بارہ برس بعد سیّدہ زینب نے وفات پائی۔

۶۔ سید جعفر علی کا حلیہ یہ تھا: دُہرا بدن، خوب قد آور، ڈاڑھی گھنی۔ گھوڑے کی سواری کے شائق تھے۔ ان کی کچی قبر اب تک محفوظ ہے۔

۷۔ سید عبد السلام فرماتے ہیں کہ خاندانی روایتوں میں شاہ عبد العزیز سے تعلیم پانے کا بھی ذکر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اجازت لیے بغیر چپ چاپ گھر سے نکل کر دہلی پہنچ گئے تھے۔ گھر سے جتنے خط ان کے پاس گئے، وہ سب بند کے بند پڑے رہے۔ تعلیم مکمل کر چکنے کے بعد انھیں کھول کر پڑھا۔

میری معلومات کے مطابق یہ روایت صحیح نہیں۔ سید جعفر علی نے تعلیم کی تکمیل لکھنؤ میں کی۔ وہ پہلے پہل جب پہنچے (رمضان ۱۲۴۴ھ) تو پہلی مرتبہ سید صاحب کو دیکھا۔ البتہ ان کے والد سید قطب علی اور بھائی سید حسن علی تکیہ پہنچ کر سید صاحب سے بیعت کر چکے تھے۔

۸۔ سید جعفر علی کے والد سید قطب علی کے بھائی سید احمد علی تھے۔ ان کے دو فرزند ہوئے: سید اصغر علی اور سید اکبر علی۔ موخر الذکر کے فرزند کا نام سید فرزند علی تھا۔ سید اصغر علی کے اخلاف کی کیفیت یہ ہے:

سید اصغر علی
- سید محمد حاجی
  - سید ریاضت حسین
    - سید عبد السلام
    - سید محمد اکرام
  - سید ہدایت حسین
  - سید ولایت حسین
    - سید محمد میاں
    - سید محمد ابراہیم
- سید محمد یحییٰ
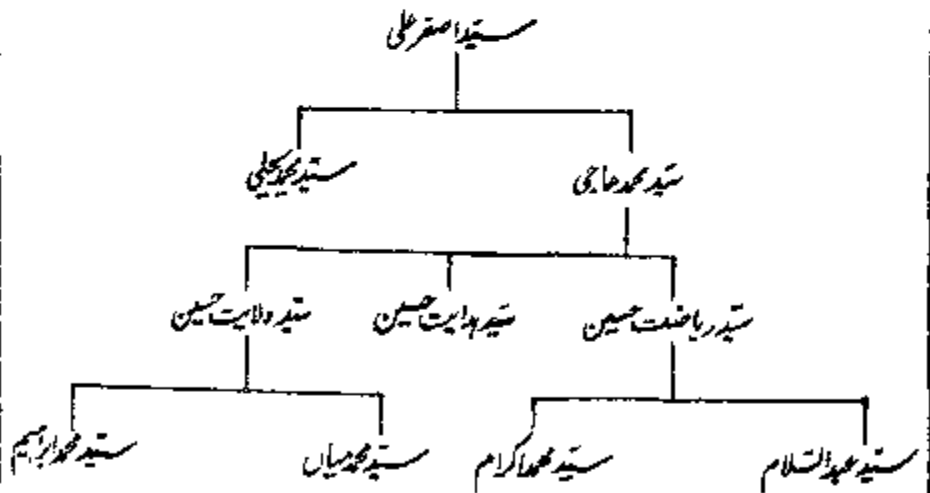
ضمیمہ ۳

شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب

افسوس کہ سید صاحب کے ارادت مندوں میں سے دو ایسی شخصیتوں کے حالات

آنکھ سے اوجھل ہو گئے جو دوران جہاد میں روپے کی فراہمی اور ارسال کے سب سے بڑے

مرکز کے مہتمم تھے، یعنی شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب۔ اس فروگذاشت کی تلافی

ضمیمہ میں کی جاتی ہے۔

شاہ محمد اسحاق: شاہ محمد اسحاق کو سرسید احمد خاں نے "زبدۃ المحدثین" لکھا ہے۔ لاریب وہ آخری دور میں علوم دین کا بہت بڑا سرچشمہ تھے۔ شاہ عبدالعزیز فرمایا کرتے تھے کہ میری تقریر اسماعیل (شاہ شہید) نے لے لی، تحریر رشید الدین نے اور تقویٰ اسحاق نے۔

والد بزرگوار کا نام شاہ محمد افضل تھا، جن کا نسب چند پشت اوپر جا کر شاہ عبدالعزیز سے مل جاتا تھا۔ شاہ محمد افضل کے علم و فضل کے علاوہ غالباً ہم نسبی ہی کی بنا پر شاہ عبدالعزیز نے اپنی ایک صاحبزادی کا نکاح ان سے کیا۔ جن کے بطن سے شاہ محمد اسحاق اور شاہ محمد یعقوب پیدا ہوئے۔ شاہ اسحاق کی تاریخ ولادت ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۳ء) ہے اور شاہ یعقوب ان سے دو برس چھوٹے تھے۔

شاہ عبدالعزیز نے دونوں نواسوں کی تربیت خود فرمائی اور تعلیم بھی خود ہی دی۔ پھر شاہ اسحاق کامل بیس برس تک جلیل القدر نانا کے سامنے حدیث کا درس دیتے رہے۔ شاہ عبدالعزیز کا انتقال ۱۲۳۹ھ میں ہوا تو خاندان میں سے مولانا عبدالحی اور مولانا شاہ اسماعیل علم و فضل کے علاوہ عمر میں بڑے ہونے کے باعث مسند درس پر بیٹھنے کے حقدار تھے، لیکن وہ دونوں اپنی زندگیاں سید صاحب کی معیت میں جہاد فی سبیل اللہ کے لیے وقف کر چکے تھے، لہٰذا بالاتفاق شاہ اسحاق کا فرق مبارک دستار خلافت سے مزین ہوا۔

روزانہ زندگی: مولوی نجف علی نے "فیض روح قدسی" کے نام سے ایک رسالہ عربی میں سید صاحب، شاہ اسماعیل، مولانا عبدالحی اور شاہ اسحاق کے حالات میں لکھا تھا۔ اس میں شاہ اسحاق کی روزانہ زندگی

کی کیفیت یوں بیان کی ہے:

تہجد پڑھ کر تھوڑی دیر کے لیے سو جاتے، صبح کی نماز مسجد میں با جماعت ادا کرتے۔ پھر گھر چلے جاتے اور لڑکیوں کو تعلیم دیتے۔ سورج روشن سے بلند ہوتا تو درسگاہ میں تشریف لاتے اور دوپہر تک تفسیر حدیث اور فقہ کا درس دیتے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر کے لیے قیلولہ فرماتے۔ نماز ظہر مسجد میں ادا کر چکنے کے بعد پھر درس کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ جو نماز مغرب تک جاری رہتا۔ بیچ میں صرف نماز عصر کے لیے تھوڑی دیر ملتوی ہوتا۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر جاتے لیکن جلد واپس آجاتے۔ نماز عشا تک طلبہ کو مختلف کتابیں پڑھاتے نماز عشا کے بعد استراحت فرماتے۔

کتنی پاکیزہ زندگی تھی جس کا ایک ایک لمحہ کتاب و سنت کی خدمت کے لیے وقف تھا۔ شاہ عبدالعزیز کے معمول کے مطابق ہفتے میں دو دن وعظ بھی فرماتے۔ تراجم علمائے حدیث میں سر سید احمد خاں کا ایک بیان بروایت نواب مصطفیٰ خاں درج ہوا ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ بقول سرسید، شاہ اسحاق کے وعظ میں حاضر ہوتا۔ باہر مردوں کا ہجوم ہوتا اور قنات کے پیچھے عورتوں کا۔ نہ ڈولیوں کا شمار ہوتا نہ پالکیوں کا۔ شاہی محلات تک کی بیگمات آتیں۔ امرا کے ہاں سے کھانے کی دیگیں پک کر آتیں جو طلبہ اور عوام میں تقسیم ہو جاتیں۔ خود شاہ صاحب معمولی چپاتی اور شوربہ گاڑھے کے دستر خوان پر رکھ کر تناول فرماتے۔[1]

جہاد میں اعانت سید صاحب جہاد کے لیے سرحد تشریف لے گئے تو انھوں نے فراہمی اموال کے لیے جا بجا مرکز قائم کر دیے تھے۔ اور اپنے خاص رفیق بھی مختلف حصوں میں مقرر فرما دیے تھے، جن کی کیفیت بیان ہو چکی ہے۔ مال کی فراہمی کا سب سے بڑا مرکز شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب ہی کی تحویل میں تھا اور دونوں بھائیوں کے نام سید صاحب کے مکاتیب کا ذکر کتاب کے ابتدائی حصے میں آچکا ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ اس مرکز سے کس طرح پابندی کے ساتھ ہنڈیاں سرحد بھیجی جاتی تھیں۔ سید صاحب کی شہادت کے بعد بقیۃ السیف مجاہدین کی جو جماعت سرحد میں ٹھہر گئی تھی، اس کے لیے بھی زر اعانت کا سلسلہ شاہ اسحاق نے جاری رکھا۔ چنانچہ شاہ صاحب کے داماد مولوی سید نصیر الدین فرماتے ہیں کہ جب شاہ صاحب وعظ فرما چکتے تو میں مدرسے کے دروازے پر لوگوں سے چندہ وصول کرتا۔

[1] تراجم علمائے حدیث ہند صفحہ ۱۰۴

سنہ ۱۲۴۰ھ (۱۸۲۵ء) میں اہل وعیال کے ساتھ لے کر حج کیا۔ واپس آکر پھر درس وتدریس
میں مشغول ہو گئے۔

ہجرت اور وفات سید صاحب نے ہجرت وجہاد کے ذریعے سے ایمانی زندگی کا بہترین
طریقہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ شاہ اسحاق نے جب دیکھا کہ ہندوستان کو دار الاسلام بنانے کی
بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تو مسلمانوں کے سامنے ایمانی زندگی کا دوسرا طریقہ پیش کر دیا یعنی وہ
اہل وعیال کے ساتھ ہجرت کر کے ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں بھی درس جاری کر دیا۔
رجب ۱۲۶۲ھ (جولائی ۱۸۴۶ء) میں وفات پائی اور جنت المعلیٰ میں دفن ہوئے۔ غسل کے وقت مکہ معظمہ
کے مشہور عالم شیخ عبداللہ سراج نے فرمایا: قسم بخدا اگر یہ بزرگ کچھ مدت اور زندہ رہتے اور میں ان کو حدیث سناتا
رہتا جب بھی ان کے مرتبے کو نہ پہنچتا۔

شاگردوں کا شمار نہیں ہو سکتا۔ چونکہ سارا وقت درس میں گزرتا تھا اس لیے تصنیف وتالیف کی
فرصت نہ مل سکی۔ بعض سوالات کے جواب میں رسالے لکھے جن میں سے "مسائل اربعین" اور "مائۃ مسائل"
مشہور ہیں۔ "تذکرۃ الصباح" بھی انھیں سے منسوب ہے۔

اولاد اولاد میں ایک صاحبزادہ تھا اور تین صاحبزادیاں۔ صاحبزادے کا نام سلیمان تھا، جس کی وجہ سے
شاہ اسحاق کی کنیت ابوسلیمان پڑی، لیکن وہ غالباً جلد فوت ہو گیا۔ صاحبزادیوں میں سے ایک مولانا عبدالحی کے
فرزند ارجمند مولانا عبدالقیوم سے بیاہی گئی۔ دوسری کی شادی شاہ محمد بن شاہ معظم بن مقرب اللہ بن شاہ اہل اللہ
برادر شاہ ولی اللہ سے ہوئی۔ تیسری مولوی سید نصیر الدین کے گھر کی زینت بنی، جو شاہ رفیع الدین کے نواسے
تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ مولوی سید نصیر الدین کی والدہ ابتدا ہی سے اس رشتے کی خواہاں تھیں، لیکن چونکہ مولوی صاحب
موصوف کو تحصیل علم کا شوق نہ تھا اس لیے شاہ صاحب نے رشتے سے انکار کر دیا۔ مولوی صاحب کے لیے یہ انکار تازیانۂ تنبیہ
بنا۔ تھوڑی ہی مدت میں محنت وریاضت سے وقت کے بہت بڑے عالم بن گئے۔ اس وقت شاہ اسحاق نے رشتہ
منظور کر لیا۔ مولوی صاحب نے ۱۲۴۱ھ میں سید صاحب کی تحریک جہاد میں زندگی کی نئی روح پھونکی۔ کئی برس تک
سندھ، بلوچستان اور افغانستان میں مصروف تنظیم جہاد رہے۔ پھر ستھانہ چلے گئے اور وہیں وفات پائی۔ ان کے

دو فرزند تھے: عبداللہ اور عبدالحکیم۔ ان کے حالات معلوم نہ ہو سکے۔

شاہ یعقوب: جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، شاہ محمد یعقوب شاہ اسحاق سے دو برس چھوٹے تھے۔ علم و فضل اور تقویٰ میں بھائی کا نمونہ تھے۔ ۲۰۔ ذی قعدہ ۱۲۸۲ھ مطابق ۱۲۔ اپریل ۱۸۶۶ء کو مکہ معظمہ میں وفات پائی۔

شاہ ولی اللہ کی پیشگوئی: نواب صدیق حسن خان نے "اتحاف النبلاء" میں "قول جلی" کے حوالے سے شاہ ولی اللہ کی ایک پیشگوئی درج کی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چار فرزند عطا کیے ہیں یعنی شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر اور شاہ عبدالغنی، وہ سب سعید ہیں۔ ان میں طبیعت کی ایک قسم کا ظہور ہوگا۔ تدبیر غیب کا تقاضا یہ ہے کہ دو اور شخص پیدا ہوں گے جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں علوم دین کے احیا کا اہتمام کریں گے۔ ان کا نسب والدہ کے ذریعے سے مجھ سے وابستہ ہوگا۔[1]

یہ پیشگوئی بظاہر شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کے ذریعے سے پوری ہوئی۔

ارواح ثلاثہ کی روایات: "ارواح ثلاثہ" میں شاہ اسحاق اور شاہ یعقوب کے متعلق بہت سی روایات درج ہیں۔ جن میں سے بعض بہت دلچسپ ہیں۔ مثلاً:

۱۔ شاہ صاحبان حرم شریف میں جاتے تو جوتے بے تکلف باہر چھوڑ جاتے۔ ان کے جوتے کبھی گم نہ ہوتے۔ شیخ الہند مولانا محمود حسن مرحوم نے فرمایا کہ یہ در اصل شاہ عبدالقادر کی تعلیم تھی۔ اکبری مسجد میں جوتے چوری ہونے لگے تو شاہ صاحب نے لوگوں سے فرمایا کہ اپنے جوتے چوروں کے لیے حلال کر دیا کرو۔ پھر وہ انھیں نہ لینے لگے۔

۲۔ شاہ صاحبان بہت سخی تھے اور اکثر تنگی کی وجہ سے مقروض رہتے تھے۔ ایک روز انھیں بہت خوش دیکھا اور کسی نے پوچھا تو معلوم ہوا کہ سکندر آباد کی تحصیل میں حسن پور نام ان کا ایک گاؤں تھا جسے سرکار نے ضبط کر لیا تھا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ معاش کا ایک ظاہری ذریعہ ختم ہو گیا اور صرف خدا پر بھروسہ رہ گیا۔

۳۔ شیخ فیض تقی کا بیان ہے کہ شاہ عبدالعزیز نے شاہ ولی اللہ کے مزار کے پاس جو مسجد بنوائی تھی شاہ اسحاق اسے اچھا نہ جانتے تھے۔ فرماتے تھے کہ قبرستان میں مسجد نہ ہونا چاہیے۔

---

[1] اتحاف النبلاء صفحہ ۴۲۱   [2] ملفوظ ۲۰۰ ارواح ثلاثہ صفحہ ۹۰، ۹۱

ضمیمہ نمبر ۵

متفرق واقعات

بعض احوال و واقعات کتاب کی ترتیب مکمل ہو جانے کے بعد معلوم ہوئے تھے یہاں درج کیے جاتے ہیں

مولانا عبدالحی: ایک روایت سے معلوم ہوا کہ حرم پاک میں پہنچے تو سید صاحب نے مولانا عبدالحی اور شاہ اسمٰعیل سے فرمایا کہ یہ متبرک مقام ہے۔ وقت فرصت غنیمت ہے۔ کوئی درس شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ مولانا عبدالحی نے مشکوٰۃ کا درس شروع کر دیا اور شاہ اسمٰعیل نے حجۃ اللہ البالغہ کا۔ حج کے بعد بھی یہ درس ہوتا رہا اور جاری رہا۔

سید صاحب کا معمول تھا کہ اکثر نماز عصر کے بعد رکن یمانی کے قریب بیٹھ کر مراقبہ و دعا کرتے۔

سامان تلقین: سفر منیٰ و عرفات میں مولانا عبدالحی نے اپنے اہل تمام کو اونٹ پر سوار کرایا خود پیدل روانہ ہوئے۔ کچھ رفقا بھی ساتھ تھے۔ مغرب کی نماز کا وقت آیا تو مولانا نے اونٹوں کے مالک کو آواز دی کہ ذرا رو ہم نماز ادا کر لیں۔ اس شخص نے عجلت کے خیال سے ٹھہرنا پسند نہ کیا اور بے احتیاطی سے کہا تم ہندی لوگ ہو نماز پڑھو ورنہ خدا نصیب نہ کرے۔ مولانا نے بطیب خاطر نماز ادا کی پھر اونٹوں کے مالک کو سمجھایا کہ بھائی ہم لوگ ہندوستان سے حج و عبادت کے لیے آئے ہیں تم ہم سے نفرت کرتے ہو اور بد دعا دیتے ہو معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ایمان سے بہرہ نصیب نہیں ہوا۔ دعا کرو کہ تمہیں ایمان نصیب کرے۔ اس نے بہت معذرت کی اور مولانا سے عرض کیا کہ آپ میرے لیے دعا فرمائیں۔

سفر ہجرت: مولانا عبدالحی کو سفر ہجرت میں بڑی مشکلات پیش آئی تھیں۔ خاصا وقت بہاولپور میں گزارا۔ ربیع الاول ۱۲۴۲ھ میں بھاگ (بلوچستان) پہنچے، تیرہ دن وہاں ٹھہرے رہے۔ بیس روز حاجی میں گزارے۔ مہینہ شکار پور میں قیام کیا۔ ۸ رجب کو قندھار گئے۔ ۱۶ رمضان کو وہاں سے چلے تو ۵ شوال کو کابل پہنچے۔ پھر جلال آباد کے راستے سوات میں سید صاحب سے ملاقی ہوئے۔

مولانا محمد یوسف: مولانا محمد یوسف پھلتی کی والدہ حج کے لیے ساتھ نہ گئی تھیں۔ عین حج کے دنوں میں ان کے انتقال کی خبر مکہ معظمہ پہنچی۔ سید صاحب نے حرم پاک میں ان کی مغفرت کے لیے دعا کی۔

ضمیمہ ۶

قصیدہ

در فضائل حبرِ نبیل مولانا محمد اسماعیل

یہ قصیدہ مولوی محمد حسین صاحب متخلص بہ فقیر نے لکھا تھا اور میرے علم کے مطابق صرف ایک مرتبہ ایک مختصر سے رسالے کے ساتھ چھپا جس کا نام "فضائل عالم با عمل" تھا۔ اس رسالے کے حاشیے پر شاہ محمد فخر الہ آبادی کا "تحفہ زوار" شائع ہوا اور آخر میں یہ قصیدہ۔ قصیدہ بہت لمبا تھا۔ میں نے بہت سے شعر حذف کر دیے اور صرف وہ شعر چنے جو شاہ شہید کے فضائل سے متعلق تھے۔ یہ قصیدہ اب نایاب ہے۔ امید ہے کہ اس کے مندرجہ ذیل اشعار محفوظ ہو جائیں گے۔

پوچھیے نام تو ہم نام ذبیح اللہ تھے ۔۔۔ بو عمر[1] تھے وہ اگر پوچھیے ان کی کنیت

دیکھنے والے ابھی ان کے بہت تابعیں موجود ۔۔۔ کیجیے تصدیق جو اس عرض میں شک ہو تحقیق

عالم ایسے تھے کہ کیا علم کا ان کے ہو بیاں ۔۔۔ علما کو بھی رہی علم سے ان کے حیرت

صرف میں نحو میں وہ تھے سب ہی قائل اُن کا ۔۔۔ ابن حاجب کی تو تھی عہد میں ان کی حاجت

ایک جملہ بھی سنے ان کے بیاں سے تو مدام ۔۔۔ محو نحوی رہے صرفی کو ہو مستغرقیت

اہل معقول بنے ان کے بیاں سے منقول ۔۔۔ اہل ہیئت پہ رہی ان کی ہمیشہ ہیبت

---

[1] یعنی شاہ صاحب کا نام اسماعیل، اور ان کے فرزند ارجمند کا نام عمر تھا، لہٰذا "ابو عمر" ان کی کنیت ہوئی، لیکن شاہ شہید کے سلسلے میں اس کنیت کا ذکر کبھی نہیں سنا۔

یعنی وہ شوق دلایا کہ سفر ہائے حجاز	قطع کرنے میں سبھی ہو گئے عالی ہمت
واعظ ایسے تھے کہ کیا ان کے بیاں کا ہو بیاں	سننے والوں کو عجب ہوتی تھی رغبت نہایت
جب حدیثِ نبوی کا وہ بیاں کرتے تھے	ہوتا تھا خلق سے معدوم حدوثِ بدعت
ذکر دوزخ کا جو آتا تو جلا دیتی تھی	آتشِ خوفِ خدا پنبۂ خوابِ غفلت
اور جنت کا بھی کچھ ذکر جو آ جاتا تھا	سن کے کفار بھی اسلام کی کرتے رغبت
اور جو کرتے تھے کبھی ہولِ قیامت کا بیاں	مجلسِ وعظ کی ہو جاتی تھی ایسی صورت
ایک کو دوسرے کی کچھ نہ خبر رہتی تھی	ق اس قدر ہوتی تھی ہر ایک کے دل کو دہشت
سر کے نزدیک جو وہ شمس بدی ہوتا تھا	شرم افعال سے ہوتی تھی عرق کی شدت

توبہ توبہ مری یا رب یہ ہر اک کہتا تھا

اس قدر ہوتی تھی واں ہیبت ربُّ العزت

سر کو سجدے میں جھکا دیتے ہیں جب پڑتی تھی	بے نمازوں کی بدل جاتی تھی ایسی حالت
فرض جن سے نہ ادا ہوتا تھا وہ صورتِ فرض	کرتے نفلیں بھی ادا کرنے میں پکی نیت
اکل و شرب اپنا فراموش وہ کر دیتے تھے	روزہ خوروں کو تھی اس وعظ کی اتنی ہیبت
پھر تو عیدین سے تشریق سے لاچار تھے وہ	سال بھر روزے کی تھی ان کو ہرگز رغبت
جو نہ دیتے تھے زکوٰۃ ان کا یہ ہوتا تھا حال	صرفِ کل مال میں کرتے تھے وہ صرفِ ہمت

عیش میں گھر سے بھی تھا جن کو نکلنا مشکل

سفر حج کی بھی پیدا وہ ہوئی ان کو رغبت

ہو گئے سیکڑوں زانی بھی زنا سے تائب	اور مے خوار بھی توبہ سے ہوئے پاک صفت
زانیہ عورتیں بھی اُن کی نصیحت سن کر	باندھتی تھیں کسو دیندار سے عقدِ خلت
ہے یہ مشہور کہ دہلی میں وہ اک روز کہیں	اک زنِ فاحشہ کے در پہ گئے باعزت
اس کو کچھ ذکرِ قیامت جو سنایا تو وہیں	وہ بھی تائب ہوئی اور اُس کی ہوئی ہم صحبت

اور سب چھوٹ گئیں آپ کے سمجھانے سے

رسم یہ شادیوں کی اور غمی کی بدعت

اور مہاجر بھی وہ ایسے تھے کہ سبحان اللہ — ماسوی اللہ سے تھی ان کو ہمیشہ ہجرت

ظاہرا مال سے اولاد سے گھر سے اُن کو — اس قدر عشقِ الٰہی میں ہوئی تھی نفرت

سب دیا چھوڑ مگر ہاتھ سے چھوڑا نہ کبھی

رشتۂ ہجرت فی اللہ بلی بہ ہمت

غازی ایسے تھے کہ کیا ان کی غزا کا ہو بیاں — آپ شمشیر کو پیتے تھے وہ مثلِ شربت

ان کی شمشیر کا زہراب ملا دیتا تھا — فوجِ کفار کے دریا میں عجب سمیت

پشتا ہو گا کہ سکھوں کو بہت قتل کیا — شکر ہے بچ رہ نہ سکے سکھ ہوئے ایسے غارت

مال سے ملک سے اور جاہ سے کچھ کام نہ تھا — تھا تو یہ کام تھا عالی ہو یہ دین و ملت

راہِ مولا میں بھی قربان ہوئے واہ نصیب

اور حیات تو ابدی پائی علیہ الرحمت

جو بُرا کہتے ہیں ایسوں کو بُرا کرتے ہیں — عیب اپنے ہی بیاں کرتے ہیں وہ بطینت

ظاہرا بے ادبی ہے یہ کلامِ حق کی — ایسے حافظ کو بُرا کہتے ہیں جو بد خصلت

ایسے عالم کی مذمت جو کیا کرتے ہیں

مثلِ جاہل ہیں اگرچہ انہیں ہو علمیت